قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2026 قیمت ₹25

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

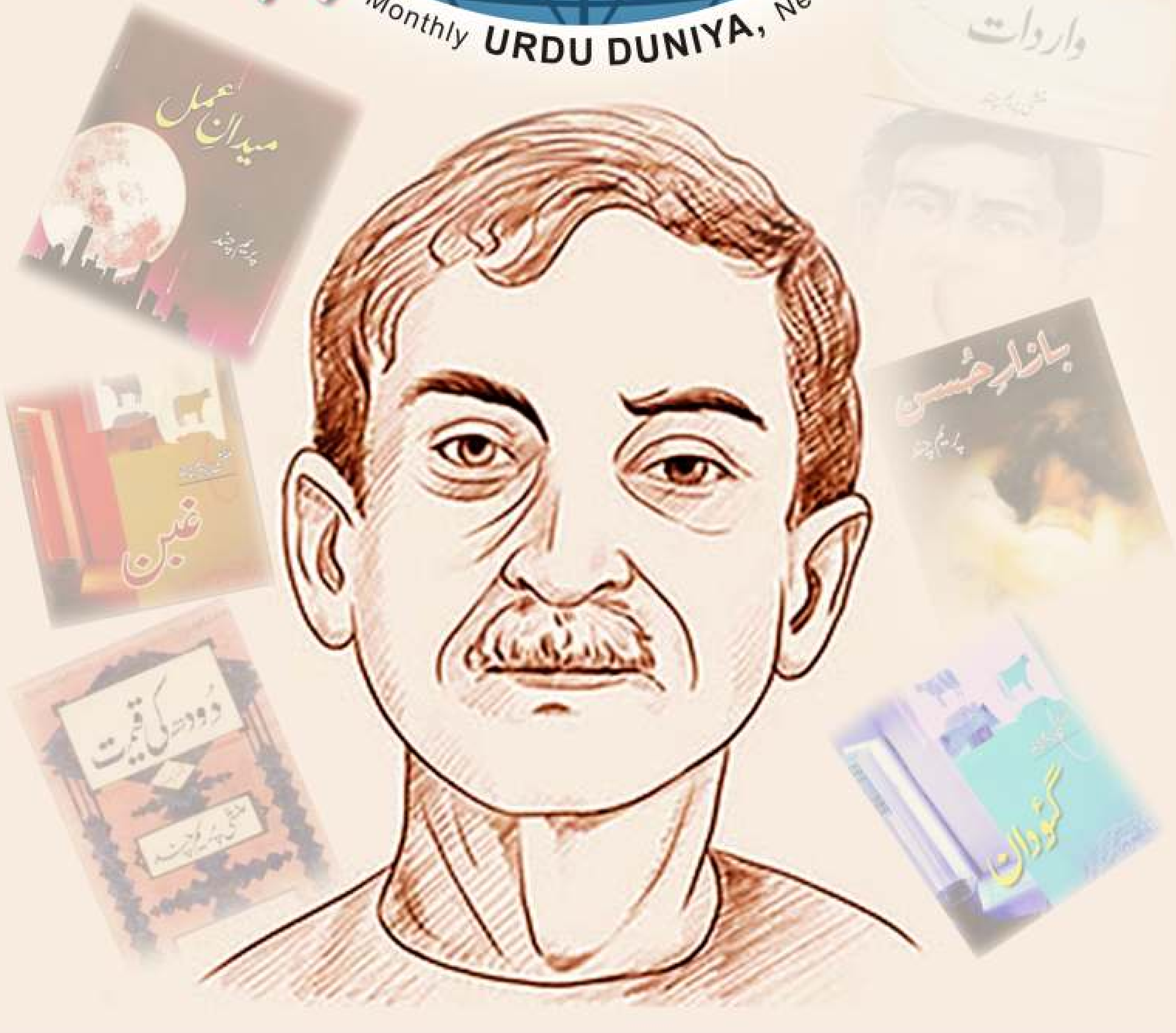

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

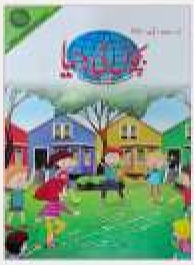

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماھنامہ

اُردو دُنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ:7، جولائی 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : نہاں

معاون مدیر : ڈاکٹر فیضان الحق

معاونین : ڈاکٹر وسیم اقبال، محمد اکرام، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع : سالاسار امیجنگ سسٹمس

B-19، سیکٹر 88، نوئیڈا۔ 201305 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: اختر حسین

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے، سالانہ -/240 روپے

صفحات: Total Pages:100

- قلمکاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 011-35151992 | شعبۂ ادارت: 011-35152009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

ای-میل

editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون : 26109746،

ای میل : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد -500002

فون : 040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات — مدیر — 4

خطوط

- آپ کی بات — قارئین — 5

زبان و تعلیم

- ہندوستان کی لسانی تہذیبیں — علی رفاد فتیحی — 7
- اسسمنٹ: افادیت اور طریقہ کار — عطاء الرحمن انور — 11

گوشۂ منشی پریم چند

- نامور سنگھ اور ہندوستانی ادب کا پرامیتھیوس پریم چند — قدوس جاوید — 16

- دورِ حاضر میں پریم چند کی معنویت و افادیت — صغیر افراہیم — 19
- 'پریم چند: قلم کا سپاہی': چند مباحث — شہزاد انجم — 23
- 'کفن' کی ایک اور قرأت — ارشاد نیازی — 27
- پریم چند کی حقیقت نگاری: 'کفن' اور 'پوس کی رات' کے حوالے سے — محمد انعام الحق — 31

- پریم چند کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کی احتجاجی آوازیں — عافیہ حمید — 35
- سورداس (مضمون) — منشی پریم چند — 38
- بھوشن (مضمون) — منشی پریم چند — 43
- جنگل میں منگل (افسانہ) — منشی پریم چند — 46

خراجِ عقیدت

- بشیر بدر: ایک منفرد شاعر — احمد نثار — 49

- اردو ماس میڈیا کی تدریس اور پروفیسر محمد شاہد حسین — شفیع ایوب — 53
- ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی: استاد اور ادیب — شعیب رضا فاطمی — 55

- فاروق سید اور 'گل بوٹے' — فیروز بخت احمد — 58

ادب اور سائنس

- سائنسی متن کا اردو ترجمہ: مسائل و مباحث — تلمیذ فاطمہ نقوی — 60

شخصیات

- اظہار خضر کی تنقیدنگاری — ریاض توحیدی — 63
- قاضی عبدالستار کے افسانوں میں تہذیبی قدریں — عبدالرزاق زیادی — 66

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ — 69

جہانِ آگہی

- خبر نامہ — ادارہ — 75

ہماری بات

زبان وادب کی تاریخ میں چند نام ایسے ہیں جو محض ادبی شخصیات میں شمار نہیں ہوتے بلکہ وہ فکری روایت، تہذیبی شعور اور ایک تخلیقی عہد کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ منشی پریم چند انھی نابغہ روزگار ادیبوں میں شامل ہیں جنھوں نے برصغیر کے ادبی منظرنامے کو نئی جہت عطا کی۔ 31 جولائی 1880 کو جنم لینے والے اس عظیم فنکار نے ادب کو زندگی کے حقیقی مسائل اور انسانی تجربات سے جوڑ کر اسے ایک نئی معنویت بخشی۔ ان کی تخلیقات میں محض کہانی نہیں بلکہ ایک پورا عہد سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود پریم چند کا نام ادب، انسان دوستی اور حقیقت نگاری کی علامت کے طور پر زندہ ہے۔

پریم چند ایسے دور میں سامنے آئے جب ہندوستانی ادب میں داستانوی فضا، رومانوی تخیلات اور ماورائی عناصر کا غلبہ تھا۔ انھوں نے ادب کو طلسم و حیرت کی دنیا سے نکال کر عام انسان کی زندگی سے ہم آہنگ کیا۔ ان کے نزدیک ادب کا مقصد صرف تفریح فراہم کرنا نہیں بلکہ انسانی شعور کو بیدار کرنا اور معاشرتی حقیقتوں سے آگاہ کرنا تھا۔ چنانچہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں کسان، مزدور، عورت، غریب، محروم اور پس ماندہ طبقے کے افراد مرکزی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ وہ زندگی کے ان گوشوں کو موضوع بناتے ہیں جو عموماً ادب میں جگہ پانے سے محروم تھے۔ 'کفن'، 'عیدگاہ'، 'پنچ پرمیشور' اور 'بڑے گھر کی بیٹی' جیسے افسانے ہوں یا 'گئودان'، 'غبن'، 'نرملا' اور 'بازارِ حسن' جیسے ناول۔ ہر جگہ انسانی زندگی اپنی تمام پیچیدگیوں، امیدوں اور محرومیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

پریم چند کی فنی عظمت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی حقیقت نگاری ہے۔ انھوں نے معاشرے کو کسی آرائش یا ملمع سازی کے بغیر پیش کیا۔ غربت، طبقاتی کشمکش، معاشی نابرابری، سماجی ناانصافی اور فرسودہ رسم و رواج جیسے مسائل ان کی تخلیقات میں نہایت مؤثر انداز میں نمایاں ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی تحریریں محض شکایت یا احتجاج تک محدود نہیں رہتیں بلکہ انسان کے اندر موجود خیر، امید اور اخلاقی قوت پر بھی اعتماد کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کے کردار کمزوریوں کے باوجود اپنے ضمیر کی روشنی سے وابستہ رہتے ہیں۔ یہی وصف ان کے ادب کو وقتی حالات کی قید سے آزاد کر کے آفاقی معنویت عطا کرتا ہے۔ ان کے یہاں انسان اپنی تمام تر محرومیوں کے باوجود قابلِ احترام اور قابلِ توجہ ہے اور یہی انسانی احترام ان کے فکری نظام کی بنیاد ہے۔

انسان دوستی، رواداری اور اخلاقی شعور پریم چند کے فن کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی اصل قدر اس کی ذات، مذہب یا طبقے میں نہیں بلکہ اس کی انسانیت میں پوشیدہ ہے۔ ان کی تحریروں میں انصاف، محبت، ہمدردی، ایثار اور سماجی ذمہ داری جیسے تصورات نہایت فطری انداز میں سامنے آتے ہیں۔ وہ قاری کو وعظ و نصیحت کے ذریعے نہیں بلکہ کرداروں کے تجربات اور حالات کے ذریعے سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان کی کاوشیں محض ایک ادبی تجربہ نہیں بلکہ اخلاقی اور فکری تربیت کا ذریعہ بھی ہیں۔ آج کے عہد میں، جب انسانی معاشرہ مختلف سطحوں پر بے حسی اور عدم برداشت جیسے مسائل کا سامنا کر رہا ہے، پریم چند کا پیغام پہلے سے کہیں زیادہ اہم اور بامعنی محسوس ہوتا ہے۔

پریم چند کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ان کی زبان بھی ہے۔ انھوں نے سادہ، رواں اور دل نشین اسلوب اختیار کیا جس میں تصنع یا پیچیدگی کی گنجائش کم ہے۔ ان کی زبان عوامی زندگی سے جڑی ہوئی ہے اور قاری تک براہ راست رسائی حاصل کرتی ہے۔ یہی سادگی ان کے فن کی طاقت بن گئی۔ ان کی تخلیقات نہ صرف اردو بلکہ ہندوستانی ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں اور دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر عالمی ادب کا حصہ بھی بن چکی ہیں۔ مختلف جامعات اور تحقیقی مراکز میں ان کے فن پر مسلسل کام ہو رہا ہے جو ان کی ادبی عظمت کا واضح ثبوت ہے۔

پریم چند کی ولادت کے موقع پر پیش کیے جانے والے اس خصوصی گوشے کا مقصد محض ایک عظیم ادیب کو خراج عقیدت پیش کرنا نہیں بلکہ ان کے فکری اور ادبی ورثے کے مختلف پہلوؤں کو قارئین کے سامنے لانا بھی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی شخصیت اور فن پر مبنی مضامین کے ساتھ تین تحریریں 'جنگل میں منگل' (افسانہ) 'بھوشن' (مضمون) اور 'سورداس' (مضمون) بھی شامل اشاعت کی جا رہی ہیں۔ یہ تحریریں قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والی مدن گوپال کی مرتبہ 'کلیات پریم چند' میں شامل نہیں ہو سکی تھیں لیکن ان کی اہمیت کے پیش نظر انھیں گوشہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ امید ہے قارئین پریم چند سے متعلق اس گوشہ سے مستفید ہوں گے۔

شمس اقبال

آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلمکاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی و علمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ اردو دنیا جون 2026 کا شمارہ موصول ہوا سرورق اور صفحات کی خوبصورتی کے ساتھ مشتملات بہت ہی اہم ہیں جن میں تنوع کی جھلک نمایاں ہے۔ اداریہ یوگا سے متعلق ہے جس میں یوگا کی اہمیت افادیت اور خصوصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے تمام پہلوؤں کو احاطہ بحث میں لینے کی کوشش کی گئی ہے بالخصوص یوگا کے تاریخی تہذیبی سماجی اور سائنسی متعلقات کو موضوع بنا کر اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

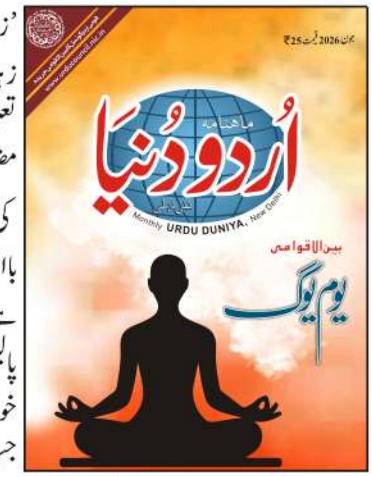

'زبان و تعلیم' والے حصے میں سید مبین زہرا کا مضمون 'این ای پی: 2020 تعلیم اور خواتین کی بااختیاری' اچھا مضمون ہے جس میں نئی تعلیمی پالیسی کی خصوصیات کے ضمن میں خواتین کی بااختیاری پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی اپنی مجموعی خصوصیات کے ساتھ خواتین کے لیے بھی کافی سودمند ہے جس کے ذریعے تعلیم کے میدان میں خواتین مزید کامیابیوں سے ہمکنار ہوسکتی ہیں۔ غضنفر کا مضمون 'اس سمندر میں بہت لعل و گہر' اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اردو زبان کی تاریخ، تہذیب اور جامعیت کو تخلیقی اسلوب میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے اردو زبان و ادب کا پورا سفر ذہن کے کینوس پر نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ 'ادب: زاویے اور جہات' والے حصے میں معاصر شاعرات کے حوالے سے شبنم حمید کا مضمون 'معاصر شاعرات کی تخلیقات میں نسائی حسیت' اچھا ہے جس سے اولاً معاصر شاعرات کی شاعری اور اس کے خال و خط کا اندازہ ہوتا ہے پھر نسائی حسیت کو انھوں نے اپنی شاعری میں کس طرح آمیز کیا ہے اس پر بھی روشنی پڑتی نظر آتی ہے۔ 'غالب بحیثیت رباعی گو' ساجد ذکی فہمی کا عمدہ مضمون ہے جس میں غالب کی رباعی کے اہم پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس شمارے کا اہم حصہ یوگا سے متعلق گوشہ ہے جس میں چھ مضامین شامل ہیں ان مضامین کی قرأت سے یوگا کے تقریباً پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے اور اس کی اہمیت ذہن پر مزید منکشف ہوتی چلی جاتی ہے اس گوشے میں یوگا کے مشرقی اور مغربی تصور پر بھی روشنی پڑتی نظر آتی ہے جس کا اندازہ اس کے عناوین سے لگایا جاسکتا ہے 'یوگا تاریخی تہذیبی اور فکری منظرنامہ' شیخ محمد غوث گوالیاری کا تصور یوگ 'ہندوستان اور مغرب کا تصور یوگ'، 'جسمانی صحت اور فلسفہ یوگ'، 'یوگا موجودہ عہد کی ایک ضرورت'، 'یوگا کی عصری معنویت' یہ ایسے عناوین ہیں جو یوگا کے حوالے سے بھی اس شمارے کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ 'ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور اردو ادب'، 'ہوقبیلے کا لسانی اور تہذیبی جائزہ' اور 'استعارہ طرفین اور وجہ جامع' وغیرہ اچھے مضامین ہیں جن سے معلومات میں اضافہ ہوسکتا ہے مجموعی طور پر ماہنامہ اردو دنیا جون 2026 کا شمارہ سابقہ شماروں کی طرح ظاہری خوبصورتی کے ساتھ مواد و مشتملات کی معنویت کی وجہ سے بھی اہم ہے جس میں تنوع کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور جدت پر توجہ مرکوز کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے جس سے قارئین مستفید ہو سکتے ہیں۔

عدلان ذاکر، حمایت نگر، حیدرآباد

ماہنامہ 'اردو دنیا' مئی 2026 کا شمارہ موصول ہوا۔ مشمولات سے ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ شمارہ بہت خاص ہے، ان معنوں میں کہ اس میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں وزیر تعلیم عالیجناب دھرمیندر پردھان جی کا مضمون 'اسکول کا پہلا دن: ایک مشترکہ ذمے داری کا آغاز' شامل ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں زبانوں کے تناظر میں بہت اہم فیصلے لیے گئے ہیں، بالخصوص مادری زبان کا التزام یہ حکومت ہند کی مثبت سوچ کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں بہت سے نکات ایسے ہیں جو موجودہ دور میں طلبہ کی تعلیم و تربیت میں بہت معاون ثابت ہوں گے۔ بچوں میں رٹ کر پڑھنے کا عمل بہت پرانا ہے، قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے لحاظ سے اب یہ پائیدار نہیں ہے، اس پالیسی نے آموزش کے معاملے میں رٹنے اور حفظ کرنے کے بجائے تجسس، تفہیم اور ہمہ جہتی ترقی کو فوقیت دی ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں بچوں کی ٹیکنالوجی کے مثبت استعمال کی طرف بھی اشارے ہیں۔ 'ڈیجیٹل انڈیا اور اردو' کے تحت دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون مکرم نیاز کا 'اردو انفارمیٹکس میں اطلاعاتی و معلوماتی ٹیکنالوجی کی اصطلاح' ہے۔ موجودہ دور کے جو تقاضے ہیں اس لحاظ سے یہ بہت کارآمد مضمون ہے۔ اس دور میں وہ زبانیں زیادہ مقبول ہیں جو ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہیں یعنی اس زبان کے زیادہ مواد آن لائن دستیاب ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ دوسری زبانوں کے لحاظ سے اردو زبان کے ساتھ کچھ

پریشانیاں ہیں۔ ان پریشانیوں کو دور کرنے کے مثبت طریقے اس مضمون میں بتائے گئے ہیں۔ ’اردو اطلاعیات‘ یا ’اردو انفارمیٹکس‘ کا بنیادی مقصد ہی اردو زبان کو ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ اس میں آنے والی پریشانیوں کا سدباب کرنا ہے نیز اس مضمون میں اردو ٹرمنالوجی کے بنیادی چیلنجز، عالمی تناظر میں اردو کی کوششیں، انفارمیشن ٹیکنالوجی کا اردو مترادف، ICT اور ترسیلاتی ٹیکنالوجی، اطلاعیات یا معلوماتیات اور کارپس یا متنی ذخیرہ: ایک اصطلاحی بحث کے تحت بہت مفید گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرا مضمون ’عصری ٹیکنالوجی اور اردو زبان: مسائل، حل اور امکانات‘ ہے۔ یہ مضمون بھی بہت عمدہ ہے۔ اس میں معلومات کی تخلیق، ترسیل اور ذخیرہ اندوزی پر روایتی طریقے سے بات کی گئی ہے، ساتھ ہی انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، مصنوعی ذہانت اور دیگر جدید ٹیکنالوجیز نے دنیا کو ایک ’عالمی گاؤں‘ میں کیسے تبدیل کردیا ہے، اس پر بھی مختصر مگر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ ’انڈین نالج سسٹم‘ کے تحت دو مضامین شامل ہیں۔ انڈین نالج سسٹم کے تراجم اور اس کی بازیافت کی موجودہ حکومت نے ازسرنو کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر پروگرام بھی خوب ہورہے ہیں۔ اسی کے مدنظر یہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا مضمون عتیق اللہ صاحب کا ’سنسکرت شعریات‘ ہے۔ عتیق اللہ صاحب کا یہ مضمون بہت معلوماتی ہے اس میں انھوں نے سنسکرت کی تاریخ اور دیگر زبانوں سے اس کے رشتے پر بات کی ہے۔ سنسکرت زبان کے تعلق سے ان کا ماننا ہے کہ یہ ہند آریائی زبان ہے اور یونانی لاطینی کی ہم نژاد اور ان سلاوی Slavonic یعنی ہند یورپی زبانوں کے اس گروہ سے متعلق ہے جس میں روسی پولستانی اور چیک زبانیں شامل ہیں۔ سنسکرت کے قدیم ترین مقدس صحائف ویدوں کو پیرایۂ تحریر تو بہت زمانوں کے بعد ملا وہ نسل درنسل حافظے کے توسط سے منتقل ہوتے چلے گئے۔ گویا سنسکرت زبان اور اس کی تاریخ اور دیگر خصوصیات کے حوالے سے ایک جامع مضمون ہے، اس کے مطالعہ سے نہ صرف علم و آگہی میں اضافہ ہوگا بلکہ سنسکرت زبان کے سیکھنے اور اسے سمجھنے کا ذوق بھی پیدا ہوگا۔

’ادب: زاویے اور جہات‘ کے تحت اردو آزاد نظم کا پس منظر (حنیف کیفی)، اردو ادب اطفال پر دیگر زبانوں کے اثرات (مظفر حسین غزالی)، اردو زبان و ادب کے فروغ میں تراجم کا حصہ (بلقیس مقبول)، 1857 کے بعد مثنوی اور نظم (تسنیم قمر) کے مضامین شامل ہیں۔ حنیف کیفی کا مضمون ’اردو آزاد نظم کا پس منظر‘ بہت اچھا مضمون ہے۔ یہ ان کا پسندیدہ موضوع بھی ہے۔ نظم کے تعلق سے ان کی ایک کتاب ’اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک) قومی اردو کونسل سے شائع ہوچکی ہے۔ بہرحال کیفی صاحب نے اس مضمون میں آزاد نظم کی تاریخ کو جس سلیقے سے پیش کیا ہے، اس کے لیے وہ قابل ستائش ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے آزاد نظم کی حمایت اور مخالفت کرنے والوں کے نام کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والوں کو اس مضمون سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے۔ ان کے علاوہ ’تنقید و تجزیہ‘ کے تحت امیر عباس خان کا مضمون ’نندلعل گویا کی فارسی شاعری‘، محمد حنیف خان کا ’نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی تنقیدی بصیرت‘، اکرم پرویز کا ’جگر کی کلاسیکیت‘، ظفراللہ انصاری کا ’سلطان اختر: کلاسیکی روایت کا جدت پسند شاعر‘ اور سریش کمار کا ’پریم ناتھ در کے افسانوں کا علامتی اور سماجی مطالعہ‘ شامل ہیں۔ یہ سبھی مضامین بہت عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ شخصیات کے تحت نسیم احمد نسیم کا ’یاس یگانہ چنگیزی کی ادبی معرکہ آرائیاں‘، عبدالودود قاسمی کا ’مولانا خیر رحمانی کے علمی و ادبی نقوش‘، عبدالناصر کا ’شفیع الدین نیر اور بچوں کے غالب‘ اور محمد نوشاد عالم ندوی کا ’اسد رضا کی ادبی وفکری شخصیت‘ جیسے مضامین شامل ہیں۔ ’پردۂ سیمیں‘ کے تحت ’راج کپور: بالی ووڈ کا ستارہ‘ جیسا مضمون شامل ہے جسے ف س اعجاز نے تحریر کیا ہے۔ شومین راج کپور نے بالی ووڈ کو جو پہچان دی ہے، شاید اس سے کوئی انکار کرے، ان کے علاوہ ان کے خاندان کے اور بھی افراد ہیں جنھوں نے بالی ووڈ میں اپنی اداکاری سے سامعین کو محظوظ کیا ہے۔ راج کپور کے حوالے سے یہ بہت اچھا مضمون ہے۔ ’زبان اور زمینی صورت حال‘ کے تحت انوپمال پول کا مضمون ’کرناٹک میں معاصر اردو ادب ایک جائزہ‘ شامل ہیں۔ سبھی مضامین معلوماتی اور لائق مطالعہ ہیں۔ آخر میں ’کتابوں کی دنیا‘ اور ’جہان آگہی‘ شامل ہے۔ یہ دونوں کالم بھی اس رسالے کی معنویت اور مقبولیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

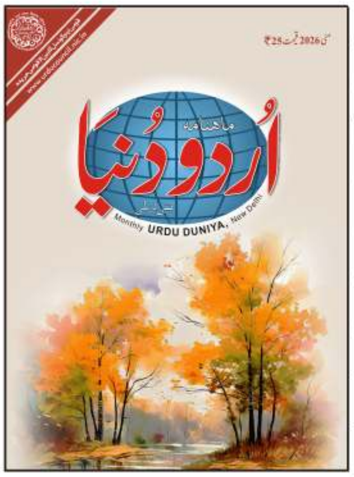

محمد حمدان، غفار منزل، دہلی

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ اپریل 2026 کا شمارہ وقت پر موصول ہوا۔ کور پیج کو اردو الفاظ کے ساتھ جس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے، دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہر بار کی طرح اس شمارے کا اداریہ بہت عمدہ ہے جس میں صاحب مدیر نے اردو ادب کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً مدیر صاحب لکھتے ہیں ’’ادب کی خوبصورتی اور جاذبیت کی بے شمار وجوہات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادب اپنے ماحول اور گردوپیش کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح ادب محض کسی ادیب، تخلیق کار یا شاعر کے جذبات واحساسات اور مشاہدات وتجربات کا اظہار نہیں بلکہ اپنے عہد، معاشرہ اور ماحولیات کا بھی نمائندہ ہوتا ہے۔‘‘ یہ سچ ہے کہ ادب سماج کا عکاس ہوتا ہے جس کی طرف اداریے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس شمارے کا پہلا مضمون ’اردو زبان کا فروغ اور مصنوعی ذہانت‘ ہے جسے اختر آزاد نے تحریر کیا۔ مصنوعی ذہانت وقت کی اہم ضرورت ہے، اس سے حتی الامکان فائدہ اٹھانا چاہیے مگر صحیح طریقے سے۔ ’کثیر لسانی ہندوستان‘ کے دو مضامین ’ادو اور کنڑا کا لسانی وثقافتی ارتباط‘ (حلیمہ فردوس) اور ’ہندوستان میں فارسی ثقافت کی ترویج واشاعت میں صوفیانہ روایت کا کردار‘ شامل ہیں۔ دونوں مضامین بہت عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں نظام الدین احمد، نعیمہ جعفری پاشا، کامران مارہروی، عبدالحی، قسیم اختر، فہمینہ علی، مشتاق احمد، فیضان الحق، عارف این، سید مسعود حسن، توقیر عالم، صابر رضا رہبر، محمد کیف حبیب اللہ، شہپر شریف، قرۃ العین، جمیلہ خاتون، خلیق الزماں نصرت کے مضامین شامل ہیں جن کے مطالعے سے علم وآگہی میں اضافہ ضرور ہوگا۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ واکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل: 9603018825

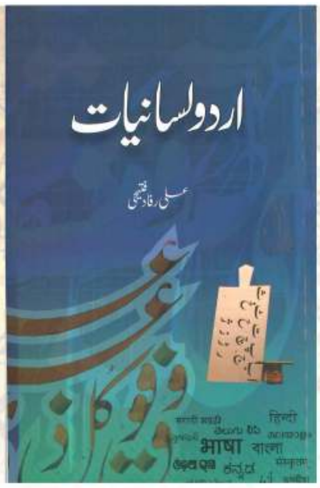

ہندوستان کی لسانی تہذیبیں

علی رفاد فتیحی

ہندوستان میں ہند آریائی، دراوڑ، منڈا اور تبتّی برمی خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یعنی ان لسانی خاندان میں سے ہر خاندان میں کئی کئی بولیاں اور زبانیں شامل ہیں، جیسے ہندی، اردو، پنجابی، سندھی، گجراتی، مراٹھی، بنگالی وغیرہ ہند آریائی خاندان کی زبانیں ہیں جب کہ ملیالم، کنڑ، تلگو اور تمل دراوڑ خاندان کی زبانیں ہیں۔ اسی طرح سنتھالی، منڈاری، ہو وغیرہ منڈا خاندان کی زبانیں ہیں۔ تبتّی برمی زبانوں کے خاندان میں بوڈو، منی پوری، قابل ذکر بولیاں ہیں۔

قدیم دراویدی تہذیب

دراویدی تہذیب کی ابتدا موہن جو داڑو، سندھ اور پنجاب کی قبل آریائی تہذیب اور قدیم تمل ادب سے ہوتی ہے۔ موہن جو داڑو اور ہڑپا رسم الخط مغربی اور ہندوستانی براہمی سے اس کی مشابہت، دراویدی تہذیب کی عظمت کا احساس دلاتی ہیں۔ سندھ اور جنوبی پنجاب کی تہذیب اور دراویدی بولنے والوں سے اس کا امکانی تعلق اس بات کا ثبوت ہے کہ دراویدی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آریائی اور دراویدی طور طریقوں میں تخالف کا پہلو نمایاں ہے۔ لسانی سطح پر بھی آریائی اور دراویدی زبانوں میں نمایاں فرق ہے کیونکہ دراویدی زبانوں کا تعلق دراویدی لسانی خاندان سے ہے۔ جب کہ ہندوستان کی آریائی زبانوں کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے۔ یہ فرق آریاؤں اور دراودوں کے تصادم کا سبب بھی بنتا رہا۔ ان سب کے باوجود ہند آریائی زبانوں نے دراویدی زبانوں کے لسانی اثرات کو قبول کیا اور دراویدی زبانوں کے زیر اثر اس میں کئی ایسی لسانی خصوصیات پیدا ہوگئیں جو دراویدی تھیں۔ مثلاً آریائی زبانوں میں معکوسی آوازوں کا استعمال غالباً دراویدی اثرات کا ہی نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد سے پہلے آریائی زبانوں میں معکوسی آوازوں کا استعمال نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر فارسی میں معکوسی آوازیں مستعمل نہیں ہیں۔ آریاؤں کی مقدس کتاب 'رگ وید' میں بھی معکوسی آوازوں کا استعمال برائے نام ملتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہند آریائی زبانوں میں معکوسی آوازوں کا استعمال دراویدی زبانوں کے زیر اثر شروع ہوا۔

آسٹرک تہذیب (منڈ السانی خاندان)

آریاؤں کی آمد کے وقت منڈا لوگ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے اور معمولی کاشت کاری کرتے تھے۔ ان کے یہاں خیر و شر کے الگ الگ دیوتا تھے، پتھر کے ٹکڑے یا بھونڈی شکلیں ان کا مظہر تھیں۔ وہ قربانی کے جانوروں کا خون یا اس کے بدلے سیندور یا کوئی دوسرا سرخ رنگ ان پر چھڑکتے تھے۔ سماج اپنی ابتدائی حالت میں تھا۔ اشیا کی افراط تھی۔ ان حالات میں ان لوگوں میں (جس کا اندازہ بعد کے ہندوستانی مزاج کی خصوصیات سے ہوتا ہے) ایک خاص انداز کی رواداری پیدا ہوگئی تھی اور 'جیو اور جینے دو' کا فلسفہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس نسل کے لوگ جنھیں عام طور سے 'آدی واسی' کہا جاتا ہے، آج بھی جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ کے علاقے میں رہتے ہیں اور منڈا لسانی خاندان کی زبانیں بولتے ہیں۔

تبتی برمی تہذیب

دراویدی بولنے والے داس دسیو (Dasa-Dasyu) اور منڈا لسانی خاندان کی زبانیں بولنے والے نشاد (Nisada) لوگوں کے علاوہ آریاؤں کو کوہ ہمالہ کے خطے میں اور شاید ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں منگول تبتّی چینی بولنے والوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ویدی عہد سے ہی آریا ان کو کرات (Kiratas) کہتے تھے۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ کرات یا منگول یعنی ہندوستان کے منگول لوگ آریاؤں سے پہلے ہی ہندوستان آئے تھے۔ مشرقی اور شمال مشرقی ہندوستان کی ہندو تاریخ اور تہذیب کے ارتقا میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن چونکہ یہ اس علاقہ تک محدود رہے، لہٰذا ان کے نام اور اثرات ہندوستان گیر نہ ہوسکے۔ آج بھی اس لسانی خاندان کی زبانیں ہندوستان کے شمال مشرقی علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

ہند آریائی تہذیب

ہندوستان میں ہند آریائی تہذیب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس تہذیب کی ابتدا 1500 ق م اس وقت

شروع ہوئی جب آریائی نسل کے لوگ پہلی بار وسطی ایشیا کے علاقے سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور اپنے ساتھ ایک ایسی زبان لائے جسے سنسکرت کا نام دیا گیا۔ گویا آج سے تقریباً 3000 سال قبل ہندوستان میں سنسکرت زبان بولی جاتی تھی۔ جس نے دھیرے دھیرے پراکرت کا روپ اختیار کیا۔ یہی پراکرت، اپ بھرنش کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اپ بھرنش کے دور کے بعد جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا شروع ہوتا ہے۔

آریاؤں کی آمد

ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کا سلسلہ، تاریخ کا بہت پرانا واقعہ ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے دینا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن یہ بات بعید از امکان معلوم ہوتی ہے کہ اس واقعہ کو 2000 قبل مسیح کے زمانے سے منسوب کیا جائے۔ بعض ماہرین کا خیال تو یہ ہے کہ یہ بات اور بھی بعد کی ہوسکتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرنا دشوار ہے۔ کسی بھی غلط فہمی سے بچنے اور ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کی تاریخ کو بخوبی سمجھنے کے لیے ہندوستان کی تاریخ کو عالمی تاریخ کا ایک حصہ ماننا پڑے گا، جو بالخصوص مشرق قریب کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ عہد قدیم کی مہذب قوموں سے آریاؤں کا سابقہ 2000 قبل مسیح سے پہلے نہیں ہوا تو ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کو اس سے بھی زیادہ قدیم بتانا بالکل غیر تاریخی بات ہوگی۔ بہر کیف مذہبی جذباتیت کی بنا پر ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کی متعین تاریخ بتانا ناممکن محسوس ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اندازہ یہ ہے کہ آریاؤں کے پہلے گروہوں کی پنجاب میں آمد کا زمانہ 1500 ق م کے قریب رہا ہوگا۔ جب آریا ہندوستان آئے تو یہ ملک آباد تھا اس میں بعض ایسی نسلیں یا قومیں (دراوڑ، منڈا، تبتی برمی) آباد تھیں جو تمدن کی بلندیوں تک پہنچ چکی تھیں۔ جب پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ قبل تاریخ مسیح میں آریائی نسل کے لوگ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے نے اسے بخوشی اور بآسانی قبول کرلیا کیونکہ آریاؤں کے حملے کے نظریے سے ان کی خود پسندی کو ٹھیس نہیں لگتی تھی اور وہ خود کو وسطی ایشیا سے آنے والے ان سفید فام مہذب آریائی فاتحوں کا وارث سمجھتے تھے جو غیر آریائی سیاہ فام لوگوں کی سرزمین پر تمدن کی روشنی لے کر آئے تھے۔ نیز وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ آریائی یعنی ہند یورپی زبانیں بولنے والی اقوام کے ساتھ ان کا رشتہ ہے۔ انگریز مورخین اور ماہرین لسانیات اور ہندوستان میں دوسرے لوگوں نے بھی اس نظریے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور 'ہمارے آریائی بھائی' کہہ کر ہندوستانیوں کی سرپرستی کی۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے نے اس نظریے کو اتنی آسانی سے ایک تو اس لیے قبول کر لیا کہ ان کے ذہن جامد اصولوں سے آزادی حاصل کرنے اور کسی بھی معقول معلوم ہونے والے نظریے کو ماننے کے لیے تیار تھے۔ دوسرے ان نچلے درجے کے لوگوں پر فوقیت و برتری کا احساس بھی اس کا سبب تھا جو ذات پات کے فرق اور تہذیب کی اس رنگارنگی سے پیدا ہوئے تھے جس نے آبادی کے اجزائے ترکیبی کو ایک متحد جماعت نہیں بننے دیا تھا۔ کچھ وہ احساس کمتری بھی اس کا سبب بنا جو یورپی اقوام کے ہاتھوں بعض بڑے معاملات میں شکست کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ بہرکیف اندازہ یہ ہے کہ آریائی نسل کے لوگ ہندوستان میں آمد کے وقت اپنی آریائی زبان بولتے تھے اور دیوتاؤں کے اور اپنے سورماؤں کی تعریف کے گیت اسی زبان میں گاتے تھے۔ یہی ہند آریائی زبان وادب کی تاریخ کا نقطۂ آغاز تھا۔

لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ ہندوستانی تمدن کی تشکیل میں غیر آریاؤں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں ہندوستان کی ترقی میں غیر آریائی لوگوں کا بھی حصہ تھا بلکہ بڑا حصہ تھا۔ شہروں میں بسنے والے غیر آریائی لوگوں کے سامنے آریہ محض خانہ بدوش وحشی تھے اور ملک کے بعض حصوں میں غیر آریہ، آریاؤں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور مادی تمدن کے حامل تھے۔ یہ بات اب واضح ہوتی جارہی ہے کہ ہندوستانی تمدن کے تانے بانے میں غیر آریاؤں کا حصہ کہیں زیادہ ہے اور ہندوستان کی مذہبی و تہذیبی روایات نیز قدیم تاریخ اور داستانوں کا بڑا حصہ غیر آریائی ہے جسے آریائی زبان میں منتقل کر دیا گیا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایک عرصہ سے آریائی زبان سنسکرت کو فوقیت حاصل ہے۔ اگرچہ غیر ہند آریائی عناصر بھی اس میں گھل مل گئے۔ مثال کے طور پر ہندو پوجا کی رسم، اور ہندو مذہب وفکر کی اور بہت سی چیزیں غیر آریائی نظر آئیں گی۔ پرانوں اور رزمیہ داستانوں کا ایک بڑا حصہ اور نیم تاریخی واقعات قبل آریائی ہیں۔ ہماری مادی تہذیب اور معمولات کا ایک بڑا حصہ مثلاً ہمارے بعض اہم پودوں (جیسے چاول) سبزیوں اور پھلوں جیسے املی اور ناریل وغیرہ کی کاشت، ہندو زندگی اور ہندو رسوم میں پان یا ناریل کا استعمال، اور عوامی مذہب کا بیشتر حصہ غیر آریاؤں کی دین ہے۔ عوامی دست کاری کے طریقے بھی غیر آریائی ہیں۔

ہند آریائی بولیاں

آریاؤں کی ہندوستان میں آمد تک 'آریائی' یا 'ہند ایرانی' بولیاں، ابتدائی ہند یورپی زبان یعنی Proto Indo

> ہندوستان میں ہند آریائی تہذیب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس تہذیب کی ابتدا 1500 ق م اس وقت شروع ہوئی جب آریائی نسل کے لوگ پہلی بار وسطی ایشیا کے علاقے سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور اپنے ساتھ ایک ایسی زبان لائے جسے سنسکرت کا نام دیا گیا۔ گویا آج سے تقریباً 3000 سال قبل ہندوستان میں سنسکرت زبان بولی جاتی تھی۔ جس نے دھیرے دھیرے پراکرت کا روپ اختیار کیا۔ یہی پراکرت، اپ بھرنش کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اپ بھرنش کے دور کے بعد جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا شروع ہوتا ہے۔

Iranian زبان سے دو منازل آگے بڑھ چکی تھیں۔ 'ہندایرانی' لسانی خاندان درحقیقت غیر منقسم 'ہند یورپی' لسانی خاندان کی ایک ذیلی شاخ ہے، اس کی متعین صوتی اور لفظی خصوصیات ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کے بعد 'ہند آریائی' بولی میں محفوظ رہ گئیں۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ ہندایرانی منزل تقریباً 2000 ق م میں شروع ہوگئی تھی۔ اپنی تاریخ کی اس دوسری منزل میں ہند یورپی ہمیں 1400 ق م تک میسوپوٹامیا کی متی (Mitanni) اور دوسری قوموں میں نظر آتی ہے یہ آریائی زبان تھی جو اس منزل میں ایران پہنچی۔ یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ اس زبان میں آریائی نغموں کی ترقی یافتہ شکل کب قابل اعتنا ہوگئی۔ لیکن قدیم متن میں آریائی دیوتاؤں مترا، ورونا، اندرا، ناستیا کے نام اور بابل کے آریائی فاتحین قصبوں (Kassites) میں سوریہ کا نام اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ان دیوتاؤں اور دوسرے آریائی دیوتاؤں کے بھجن میسوپوٹامیا میں ٹھہرنے والے آریائی قبیلوں کے علم میں تھے۔ یہ بات بہرطور طے ہے کہ 'گائتری' اور بعض دوسری بحروں کا ارتقا ایران میں ہوا یا شاید اس سے بھی پہلے میسوپوٹامیا میں اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ہند یورپی کی مختلف زبانوں کے بعض کتبے اور فقرے جو بظاہر موزوں معلوم ہوتے ہیں اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ہند یورپی لوگ کسی نہ کسی زمانے میں شاعری سے ضرور واقف تھے۔ بعض ماہرین لسانیات نے ویدی کلام کا یونانی ڈرامے سے مقابلہ کرکے ان کی شعرگوئی کی نوعیت معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ شعرگوئی ہونانی اختراع معلوم ہوتی ہے۔ مشہور ماہر لسانیات ایس کے چڑجی کا خیال ہے کہ سنسکرت (ویدی) اوستائی، قدیم نورس (Old Norse) قدیم آئرستانی(Old Irish) اور ابتدائی لتھوانی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ ہند یورپی نظم گوئی ہومر کے مسلسل مسدسی انداز پر نہیں تھی بلکہ اس پر ہند آریائی اثرات نظر آتے ہیں۔ ویدوں کی زبان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی ہندی یورپی روایت کے تسلسل کے نتیجے میں آریائی نظم بھی بندوں میں ہی لکھی جاتی تھی۔ اس کی وضاحت کے لیے وہ مزید کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آریاؤں نے اسور بابلی تہذیب کے بعض عناصر اختیار کر لیے۔ مثلاً نشانات شاہی میں چھتر کا استعمال، بعض تعمیری اور آرائشی تفصیلات جو بہار کے

آریاؤں کی ہندوستان میں آمد تک 'آریائی' یا 'ہندایرانی' بولیاں، ابتدائی ہند یورپی زبان یعنی Proto Indo Iranian زبان سے دو منازل آگے بڑھ چکی تھیں۔ 'ہند ایرانی' لسانی خاندان درحقیقت غیر منقسم 'ہند یورپی' لسانی خاندان کی ایک ذیلی شاخ ہے، اس کی متعین صوتی اور لفظی خصوصیات ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کے بعد 'ہند آریائی' بولی میں محفوظ رہ گئیں۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ ہندایرانی منزل تقریباً 2000 ق م میں شروع ہوگئی تھی۔

ترہت علاقے اور مدھیہ پردیش کے سانچی کے فن میں نظر آتی ہیں، جس میں قدیم ہندوستانی لکڑی کے فن کو مغربی ایشیائی خصوصیات کے ساتھ پتھر میں منتقل کردیا گیا۔ بعض اسور بابلی الفاظ جو آریاؤں نے اختیار کر لیے تھے ویدی زبان میں ملتے ہیں مثلاً لفظ منا(mana) 'ایک پیمانہ' جو سامی منہ (minah) سے لیا گیا ہے۔ بال گنگادھر تلک نے دکھایا تھا کہ کس طرح بابلی روایتوں میں مذکور سانپوں کے نام ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اتھروید میں راہ پا گئے ہیں۔

آریاؤں کی اصل جماعت کچھ دن ایران میں رہی پھر ان کے قبائل دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ آج یہ بتانا دشوار ہے کہ اس تقسیم کی بنیاد کس حد تک قبائلی اختلافات پر تھی اور کس حد تک مذہبی اختلافات پر لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آریانسل کے لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک دیو کے پجاری تھے اور دوسرے 'اسور' یا 'اہور' (Asura/Ahura) کے۔ بہرصورت دیو کے پجاری آریاؤں نے ہندوستان میں ترقی شروع کی۔ آریاؤں کو اس سفر میں شاید مشرقی ایران کے داس دسیو (Dasa-Dasyu) کے لوگوں سے پنجاب کے علاقے میں جنگ کرکے اپنا راستہ بنانا پڑا۔ جب آریا مشرقی ایران کے داس دسیو سے جنگ کرتے ہوئے افغانستان کی سطح مرتفع اور ہندافغانی دروں سے گزر کر وپنجاب کے میدانوں میں داخل ہوئے تو ملک کے اصلی باشندوں سے ان کا پہلا سابقہ جنگ کی صورت میں پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب، ہندوستان میں آریاؤں کا مرکز بن گیا اور اس طرح وہ غیر آریاؤں سے اپنا رشتہ استوار کرنے لگے۔ غیر آریائی لوگوں سے ربط اور ارتقا کے فطری تقاضوں سے آریائی زبان میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ دھیرے دھیرے یہ آریائی ہند ایرانی شکل سے ہند آریائی میں تبدیل ہوگئی جس کی ابتدائی شکل کی نمائندگی رگ وید میں ہوتی ہے۔

رگ وید

رگ یا سک وید ایک ایسی مقدس کتاب ہے، جس کی تشریح کی کوششیں ہزاروں سال سے ہوتی چلی آرہی ہیں لیکن آج تک اس کی مکمل اور صحیح تشریح نہیں ہو پائی ہے۔ رگ وید کی تشریح کے سلسلے میں شارح 'یاسک' (تقریباً 500 ق م) کا نام سرفہرست آتا ہے جس نے رگ وید کے چند اشعار کی شرح لکھنے کی کوشش کی۔ یہ صحیح ہے کہ یاسک ہی رگ وید کا پہلا شارح نہیں ہے اس لیے کہ اس کی شرح سے چند دوسرے شارحین کے نام بھی ہم تک پہنچے ہیں جو اس سے پیشتر گزر چکے ہیں۔ لیکن ان کی تشریحات محفوظ نہیں رہ سکیں البتہ ان کے متعلق تھوڑی بہت معلومات ہم کو یاسک کی شرح ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ ان میں سے 'کوتس' نامی ایک شارح نے تو رگ وید کو بالکل ہی مہمل قرار دے دیا ہے اور مہملات رگ وید کی مثال میں چند الفاظ بھی لکھے ہیں جیسے امیک، یادومگن، جاریائی کانسکا، وغیرہ یاسک نے اپنی شرح میں رگ وید کے اہمال سے تو انکار کیا ہے البتہ ایک ایک لفظ کے اشتقاق میں کتنی ہی متبادل تجویزیں پیش کرنے کے بعد اسے بھی کچھ الفاظ کا مطلب سمجھنے میں اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑا اور 'کوتس' کے مہملات کی فہرست میں چند اور الفاظ مثلاً

دروی ہومی، ورتی، دمونا، جاٹیہ، آشار، جاگروک وغیرہ کا اضافہ کرنا پڑا۔ نارسائی وکم فہمی کا یہ سلسلہ اس وقت سے آج تک برابر جاری ہے جو دیسی اور بدیسی شارحین کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

تشریح 'رگ وید' میں ان دقتوں اور دشواریوں کے دو خاص اسباب ہیں۔ اول یہ کہ اس ایک کتاب میں دو سو سے زیادہ شاعروں کے بھجن شامل ہیں اور یہ شعرا ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے بسنے والے تھے بلکہ ان میں سے کچھ تو ایک ہی خاندان کی تین تین پشتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مکان وزمان کے اس تفاوت کے ساتھ انھوں نے اپنے بھجنوں میں ایرانی زبان کے علاوہ اپنے علاقوں کی رائج الوقت زبانیں بھی استعمال کی ہیں اور یوں رگ وید میں اتنی زبانوں کے نمونے جمع ہو گئے ہیں کہ اس کا مکمل طور پر سمجھ لینا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شارحین جگہ جگہ رکتے اور قدم قدم پر لڑکھڑاتے ہیں اور آخر میں اپنی ناکامی کا اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دیسی شارحین ویدک زبان کو 'دیووانی' سمجھنے کے باعث کبھی یہ تصور بھلا نہیں سکے کہ اس پاک اور مقدس زبان میں آریوں کی آبائی زبان قدیم کے ساتھ ساتھ غیر آریائی زبانوں کا پٹ بھی شامل ہو سکتا ہے اور بعض ماہرین لسانیات بھی مفروضہ قدیم ہند یورپی زبان سے اپنے فطری تعلق خاطر کی بنا پر رگ وید کے دیسی جز و پر اچھی طرح دھیان نہیں دے سکے۔ غرض رگ وید کی تشریح میں اس کی لسانی رنگارنگی ہمیشہ سے سدراہ رہی ہے جس سے بعض مقامات پر یہ الجھن بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ دو زبانوں کے ہم آواز لفظوں کو دیکھ کر ان کے اشتقاق اور معنوی اختلاف کے باوجود بعض محققین ایک زبان کو دوسری سے مشتق سمجھنے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض لوگ 'ہم' (پراکرت اسھ) کو سنسکرت 'اہم' (معنی میں) سے یہ کہہ کر نکالتے ہیں کہ سنسکرت لفظ کا الف گر گیا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت لفظ 'اہم' کا تلفظ اوستا میں 'ازم' اور فارسی قدیم میں 'ادم' ہوتا ہے، اور پھر وہ ضرورت اور وہ وجہ بھی نہیں بتاتے جو اس کے سقوط کا تلفظ بالکل اسی سہولت کے ساتھ کرتے چلے آ رہے ہیں جس آسانی سے درمیانی یا آخری الف کو بولتے رہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ ابتدائی الف کے تلفظ پر پوری طرح قادر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مسلمہ امر ہے کہ زبانوں سے آوازیں اس طرح کبھی نہیں اُترتیں جس طرح کاغذ سے حرف مٹائے، اُڑائے، کاٹے یا بگاڑے جاتے ہیں۔ رگ وید کی تشریحی دشواری کا دوسرا سبب اس کی کتابت کا وہ اصول ہے جسے لسانیات میں تبادل حروف کا نام دیا گیا ہے اور یہ سبب پہلے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ بعض اوقات رگ وید میں دو مختلف التلفظ اور مختلف المعنی الفاظ ایک ہی مکتوبی شکل میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً اس میں ایک لفظ 'دکش' ملتا ہے جس کا ایک مقام پر ایرانی تلفظ 'دش' (عبادت کرنا) ہے اور دوسرے مقام پر ہندوستانی تلفظ لاکھ (سو ہزار) ہے۔ اب یہ بات کہ کسی مقام پر ویدک 'مرگ' جسے کلاسیکی سنسکرت میں عام طور پر ہرن کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے فارسی لفظ 'مرغ' کی مکتوبی شکل ہے لیکن دوسرے مقام پر فارسی لفظ 'مرگ' (موت) کی۔ اب یہ شارحین کی بے بسی ہے کہ موت کے مفہوم میں جہاں اس کے خوف کا بیان ہوا ہے وہ لوگ 'مرگ' کے معنی 'شیر' لکھ کر تشریح کی خانہ پری کر دیتے ہیں۔

تشریح 'رگ وید' میں ان دقتوں اور دشواریوں کے دو خاص اسباب ہیں۔ اول یہ کہ اس ایک کتاب میں دو سو سے زیادہ شاعروں کے بھجن شامل ہیں اور یہ شعرا ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے بسنے والے تھے بلکہ ان میں سے کچھ تو ایک ہی خاندان کی تین تین پشتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مکان و زمان کے اس تفاوت کے ساتھ انھوں نے اپنے بھجنوں میں ایرانی زبان کے علاوہ اپنے علاقوں کی رائج الوقت زبانیں بھی استعمال کی ہیں اور یوں رگ وید میں اتنی زبانوں کے نمونے جمع ہو گئے ہیں کہ اس کا مکمل طور پر سمجھ لینا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شارحین جگہ جگہ رکتے اور قدم قدم پر لڑکھڑاتے ہیں اور آخر میں اپنی ناکامی کا اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

باب کا خلاصہ

- ہندوستان میں ہند آریائی، دراوڑ، منڈا اور تبتی برمی خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔
- دراویدی تہذیب کی ابتدا موہن جوداڑو، سندھ اور پنجاب کی قبل آریائی تہذیب سے ہوتی ہے۔ موہن جوداڑو اور ہڑپا رسم الخط، مغربی اور ہندوستانی براہمی سے اس کی مشابہت، دراویدی تہذیب کی عظمت کا احساس دلاتی ہیں۔ دراویدی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے۔
- ہندآریائی زبانوں نے دراویدی زبانوں کے لسانی اثرات کو قبول کیا اور دراویدی زبانوں کے زیر اثر اس میں کئی ایسی لسانی خصوصیات پیدا ہوگئیں جو دراویدی تھیں۔
- منڈا لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے ہیں اور معمولی کاشت کاری کرتے ہیں۔ اس نسل کے لوگ جنھیں عام طور سے 'آدی واسی' کہا جاتا ہے، آج بھی جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ کے علاقے میں رہتے ہیں اور منڈا لسانی خاندان کی زبانیں بولتے ہیں۔
- ایک عام خیال یہ ہے کہ کرات یا منگول یعنی ہندوستان کے منگول لوگ آریاؤں سے پہلے ہی ہندوستان آئے تھے۔ آج بھی اس لسانی خاندان کی زبانیں ہندوستان کی شمال مشرقی علاقوں میں بول جاتی ہیں۔
- ہندوستان میں ہند آریائی تہذیب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس تاریخ کی ابتدا 1500 ق م اس وقت شروع ہوئی جب آریائی نسل کے لوگ پہلی بار وسطی ایشیا کے علاقے سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور اپنے ساتھ ایک ایسی زبان لائے جسے سنسکرت کا نام دیا گیا۔

■

ماخذ: اردو لسانیات، **مصنف:** علی رفاد فتیحی، **دوسری طباعت:** 2018، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اسسمنٹ
افادیت اور طریقہ کار

عطاء الرحمن انور

پس منظر

تعلیم و تدریس کے ابتدائی مراحل میں طلبہ کی جانچ کا مقصد صرف یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ وہ کتنا مواد یاد کر سکتے ہیں۔ امتحانات زیادہ تر رٹنے (Rote learning) پر مبنی ہوتے تھے اور طلبہ کی کامیابی کا دارومدار تحریری پرچوں میں دیے گئے جوابات پر ہوتا تھا۔ اس طریقہ کار میں طلبہ کی سمجھ، تخلیقی صلاحیت اور عملی مہارتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظریات میں تبدیلی آئی۔ ماہرین تعلیم نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ سیکھنے کا عمل محض معلومات یاد کرنے تک محدود نہیں بلکہ اس میں فہم، تجزیہ، اطلاق اور تنقیدی سوچ بھی شامل ہے۔ اسی وجہ سے تعلیمی جانچ کے طریقے بھی تبدیل ہوئے۔

جدید تعلیم میں تعلیمی جانچ کو ایک مسلسل اور جامع عمل سمجھا جاتا ہے، جو نہ صرف طلبہ کی کارکردگی کو جانچتا ہے بلکہ ان کے سیکھنے کی رفتار، دلچسپی، اور صلاحیتوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔ اب جانچ کا مقصد صرف نمبرز دینا نہیں بلکہ سیکھنے کے عمل کو بہتر بنانا ہے۔

تعارف

تعلیمی جانچ ایک منظم اور باقاعدہ عمل ہے جس کے ذریعے طلبہ کے سیکھنے، سمجھنے اور مہارتوں کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس عمل میں مختلف طریقے استعمال کیے جاتے ہیں جیسے تحریری امتحانات، زبانی سوالات، عملی کام، پروجیکٹس اور مشاہدہ وغیرہ۔

تعلیمی جانچ کے دو بنیادی پہلو ہوتے ہیں:

- طلبہ کی کارکردگی کا جائزہ لینا
- تدریسی عمل کو بہتر بنانا

یہ ایک مسلسل عمل ہے جو تدریس کے آغاز سے لے کر اختتام تک جاری رہتا ہے۔ جدید تعلیمی نظام میں اساتذہ نہ صرف طلبہ کی کامیابی یا ناکامی کا تعین کرتے ہیں بلکہ ان کی بہتری کے لیے رہنمائی بھی فراہم کرتے ہیں۔

تعلیمی جانچ کی ضرورت

تعلیمی جانچ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ تعلیم کے نظام کو مؤثر بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اسی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ نے کتنا سیکھا اور کس حد تک تعلیمی اہداف حاصل کیے اور انہیں اپنی کمزوریوں اور مضبوط پہلوؤں کا علم ہوتا ہے اور انہیں محنت کرنے پر آمادہ رکھتی ہے اسی سے تدریسی عمل میں بہتری اور نہ صرف تعلیمی معیار برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ترقی درجہ بندی اور نصاب کی تبدیلی میں معاون ہوتی ہے۔

درحقیقت اسسمنٹ تعلیم و تعلم کے مراحل میں ایک کلیدی رول ادا کرتا ہے یہ صلاحیتوں اور اہلیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کا ایک معیار ہے بہت سے ماہرین تعلیم نے اس کی الگ الگ تعریفیں کی ہیں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اسسمنٹ دراصل کسی شخص، گروپ کے بارے میں معلومات یا ثبوت اکٹھا کرنا ہے تاکہ ایک متعین فیصلے تک پہنچا جا سکے کسی کا کہنا ہے کہ یہ ایک متواتر اور مستقل عملی تجزیہ ہے، جس کا نفاذ مختلف شعبہ جات میں کیا جاتا ہے جیسے تعلیم سائیکالوجی، ہیلتھ کیئر وغیرہ۔ اسسمنٹ کے مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں تاہم مندرجہ ذیل مقاصد بہت ہی عام ہیں:

1. **تشخیص:** اسسمنٹ کسی صلاحیت یا ذاتی مجموعی ہنر، معلومات اور اہلیت کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے کیا جاتا ہے یہ تعلیمی بھی ہو سکتا ہے جیسے ملازمت کے لیے یا دیگر شعبے بھی ہو سکتے ہیں۔
2. **تاثرات:** اسسمنٹ اس شخص یا گروپ کو اپنا تاثر دیتا ہے اور یہ اس شخص یا گروپ کو ان کی صلاحیت طاقت کو سمجھنے میں اور ان کی کمیوں کی نشاندہی میں مدد کرتا ہے جو ان کی نشو ونما و ترقی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔
3. **فیصلہ سازی:** اسسمنٹ کے ذریعے جو معلومات اکٹھا کی جاتی ہے اس کو فیصلہ سازی میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً تعلیم کے میدان میں طلبہ کی پابندی ان کے گریڈ ان کی اگلی کلاس میں پروموشن دراصل اسسمنٹ کی مرہون منت ہے۔
4. **شناخت یا نشاندہی:** اسسمنٹ کسی خاص ضرورت، چیلنجز یا اہم جہات کے بارے میں نشاندہی یا شناخت کے لیے کیا جاتا ہے اس کی واضح مثال طبی امداد کا شعبہ ہے کیونکہ یہ اسسمنٹ میڈیکل کنڈیشن کو جانچنے اور پرکھنے اور اس کی تشخیص کرنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔
5. **تحقیق:** بحث و تحقیق میں اسسمنٹ ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس تحقیق کے ضمن میں محققین بہت سی ٹیکنیک اور ٹول کا استعمال کرتے ہیں تاکہ مطلوبہ معلومات حاصل کر کے اس کے نتیجے میں کسی حتمی فیصلے پر پہنچا جا سکے اس کے علاوہ یہ احساس ذمے داری کو متعین کرتا ہے۔ یہ ذمے داری اور جواب دہی ذاتی بھی ہو سکتی ہے طالب علم کی بھی ہو سکتی ہے یا خود ادارہ جاتی بھی ہو سکتی ہے اگر سارے عناصر شامل ہوں تو ایک اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں یہ معاون ہوتے ہیں۔ ادارہ جاتی سطح پر یہ اسسمنٹ، موجودہ نصاب کی بہتری میں معاون ہوتے ہیں اور یہ بہتری وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ اسسمنٹ طلبہ کی صلاحیت اور مواد کو سمجھنے میں ذہنی سطح کی نشاندہی کرتا ہے ان کی مشکلات حل کرنے

میں ماہانہ ادارہ جاتی نظر ثانی کے لیے راہ ہموار کرتا ہے یا دوسرے طریقہ کار کی ضرورت پر روشنی ڈالتا ہے۔

اسسمنٹ کے ذریعے بچوں میں حوصلہ افزائی کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور ان کو یہ احساس ہوتا رہتا ہے کہ ان کی ذہنی نشو ونما کی پوری طرح دیکھ ریکھ کی جارہی ہے۔

اسسمنٹ کے ذریعے تعلیمی خلا کی نشاندہی کی جاتی ہے یہ گیپ چاہے اس کی سمجھ میں ہو یا اس کی صلاحیت میں ہو اور ان خلا کو مدنظر رکھتے ہوئے متبادل طریقہ کار اور حکمت عملی اپنائی جاتی ہے تاکہ اس خاص نکتے پر نظر رکھی جاسکے:

مسئلے کے حل میں تنقیدی تجزیہ وفکر: کچھ اسسمنٹ ایسے ہوتے ہیں جن میں سوالات کی کثرت ہوتی ہے جن سے مشکلات کو حل کرنے میں علمی صلاحیت کو نکھار ملتا ہے اور موجودہ طریقہ تدریس کی توثیق ہوتی ہے، جس کو ہم Validated Teaching Method کہتے ہیں اگر اس طریقہ تدریس سے مستقل مثبت نتائج مل رہے ہیں تو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طریقہ تدریس کارگر ہے۔

ذاتی آموزش کی سہولت کاری: یہ اسسمنٹ ذاتی آموزش کو بہتر بناتا ہے اور حاصل نتیجے کی بنیاد پر طلبہ کی ضروریات، ترجیحات اور سیکھنے کے طریقے سے جو تفصیلات ملتی ہیں اس کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

مستقبل میں آموزش کی تیاری: اس اسسمنٹ کی بدولت نشاندہی کی جاتی ہے کہ طلبہ اب مزید Advance کورس ورک کے لیے تیار ہیں اور یہ معلومات بچوں کے مستقبل کے لیے ایک رہنما خطوط کی حیثیت رکھتی ہیں اور مستقبل کے علمی چیلنجز کا مقابلہ کرنے کا اہل بھی بناتی ہیں۔

اسسمنٹ کے اقسام

اسسمنٹ کے مختلف اقسام ہوتے ہیں جیسے ٹیسٹ، ایگزام، کوئز، سروے، مشاہدہ، انٹرویو وغیرہ ان اقسام کو پرکھنے اور تصدیق کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اور یہ ذرائع Quantitative method، Numerical data یا Descriptive data بھی ہو سکتے ہیں اس کا مقصد استعمال کیے گئے تجربہ یا Tools کو مزید معتبر بنانا اور شفافیت کو برقرار رکھنا ہے۔

اقسام

تشکیلی جانچ (Formative assessment): اس اسسمنٹ کا استعمال Learning Process کے دوران کیا جاتا ہے یہ دراصل طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے ایک فوری تاثر ہوتا ہے اور یہ ٹیسٹ کی کمیوں کی نشاندہی کے ساتھ قوت آخذہ کو اجاگر کرتا ہے تاکہ تدریسی عمل میں فوری طور پر اضافہ کیا جاسکے اور متبادل حکمت عملی اپنائی جاسکے اس کی واضح مثال کلاس روم میں ڈسکشن، کلاس روم ایکٹیوٹیز وغیرہ ہیں۔

احتسابی جانچ: یہ اسسمنٹ اس وقت کیا جاتا ہے جب ایک متعین Instructional material/ تدریسی مواد بچوں کو پڑھا دیا جاتا ہے اور آخر میں بچوں کو ان کے عمومی تاثرات اور مواد میں ان کی مہارت کی جانچ کی جاتی ہے جیسے قصہ وغیرہ کو پرکھا جاتا ہے اس کی واضح مثال سالانہ امتحان، پروجیکٹ، انٹرویو اور مقالہ وغیرہ دیے جاسکتے ہیں۔

تشخیصی جانچ: دراصل یہ اسسمنٹ کسی کورس یا یونٹ کے شروع کرنے سے پہلے کیا جاتا ہے تاکہ بچوں کی سابقہ معلومات، صلاحیت اور رجحان کو پرکھا اور جانچا جاسکے اور اس بنیاد پر اساتذہ اپنے طریقہ تدریس پر عمل کرسکیں تاکہ بچوں کی خاص ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی مشکلات پر قابو پایا جاسکے اور ان کو ایک اچھا مواد فراہم کیا جاسکے۔

مسلسل جانچ: یہ دراصل ایک مستقل ٹیسٹ اور اسسمنٹ ہے جو کورس کے دوران سے لے کر آخر تک چلتا رہتا ہے تاکہ طلبہ کو سال بھر مصروف رکھا جاسکے اور ان کی علمی وفکری نشو ونما کی نگرانی کی جاسکے اس ضمن میں ہفتہ واری یا ماہانہ ٹیسٹ، Assignment یا اسٹوڈنٹ ویبینار وغیرہ شامل ہیں۔

Performance Assesment: یہ اسسمنٹ دراصل طلبہ کی علمی صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ ہے، جو کچھ بھی وہ سیکھ رہے ہیں اس کو عملی زندگی میں کیسے نافذ کر رہے ہیں اس کے لیے یہ ٹیسٹ کیا جاتا ہے اس کی واضح مثال پریزنٹیشن، پروجیکٹ، Hands-on Experiment, Portfolio وغیرہ ہے۔

اپنے درمیان جانچ (Peer Assessment) میں طلبہ خود کا احتساب کرتے ہیں اور اپنے کلاس فیلو، ساتھیوں کا جائزہ لیتے ہیں اس سے طلبہ کے اندر ایک تدقیقی تجزیے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اس سے Coordination, Collaboration کی صلاحیت اور Communication skill میں نکھار پیدا ہوتا ہے اور اس میں سبجیکٹ پر عبور اور دسترس حاصل ہوتا ہے جیسے پریزنٹیشن کا گروپ، ریویو کا گروپ، پروجیکٹ یا تحریری Assignment ایک مثال ہوسکتی ہے۔

Online or technology-based assessment: موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کا استعمال ہر جگہ عام ہو گیا ہے اور تعلیمی اداروں میں بھی اس کا استعمال بہت عام ہے بہت سارے تعلیمی ادارے تکنیکی آلات کو اسسمنٹ کے لیے استعمال کرتے ہیں اس کی مثال آن لائن امتحانات، کوئز کمپٹیشن، Interactive simulation اور کمپیوٹر بیسڈ ایگزام وغیرہ ہیں۔

Feedback mechanism: تعمیری تاثر بچوں کے علمی وفکری نشو ونما کے لیے بہت ہی اہم کردار ادا کرتا ہے یہ تاثر طلبہ کو مہمیز کرتا ہے ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ان کے مستقل آگے بڑھنے اور صلاحیتوں کو نکھارنے میں مدد کرتا ہے ساتھ ہی ان کی کمیوں کوتاہیوں کی نشاندہی کرتا ہے جس سے ان کی نشو ونما میں غیر معمولی ترقی دیکھنے کو ملتی ہے اس کی مثال اسائنمنٹ پر تحریری رائے، کسی session یا rubric پر فوری تاثر وغیرہ ہیں۔

Portfolio Assessment: اس میں طلبہ کا مکمل اسسمنٹ اس کے متعینہ مدت میں کیے گئے اس کے کام پر ہوتا ہے جیسے کہ طلبہ کی تیار کردہ جرنل، مقالات، یا اسائنمنٹ ورک وغیرہ۔ موجودہ دور میں Digital portfolio کا چلن بہت عام ہے اور بہت سے ادارے اس کو بہت اہمیت دے رہے ہیں جس سے طلبہ اپنی مستعدی، اہلیت اور صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر طلبہ کی جانچ کی جاتی ہے۔

خود احتسابی: اس میں طلبہ خود کا جائزہ لیتے ہیں اور اس اسسمنٹ میں طلبہ خود سے روبرو ہوتے ہیں جس سے ان کو اپنی صلاحیت اور علمی معیار کا پتہ چلتا رہتا ہے اور اپنی کمیوں کوتاہیوں سے واقفیت ہوتی ہے اس کی مثال جرنل انٹری، اور خود احتسابی سروے وغیرہ ہیں۔

مشاہداتی جانچ: اس اسسمنٹ میں طلبہ کا مشاہداتی اسسمنٹ کیا جاتا ہے اس میں اس کی علمی وفکری مہارت، سلوک اور کارکردگی کا مشاہداتی طور پر اندازہ لگایا جاتا ہے جیسے کہ کلاس روم میں طبی کارکردگی کی جانچ ہدایت پر مبنی جانچ وغیرہ۔

Rubric based Assessment: دراصل یہ Scoring tool ہے جو ایک طے شدہ کسوٹی یا معیار کو

آؤٹ لائن کرتے ہیں اور اس سے پرفارمنس کا جائزہ لیا جاتا ہے جیسے کہ مقالے کو گریڈ کیا جائے جس میں مواد، Writing skills اور پرزنٹیشن وغیرہ۔

فعال جانچ: یہ اسسمنٹ طلبہ اور اساتذہ کے درمیان روبہ رو کیا جاتا ہے جیسے کہ انٹرویو جس سے ان کی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت کی تشخیص کی جاتی ہے، اس طرح مشترکہ کام میں بھی ان کی اہلیت کی تشخیص کی جاتی ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ ایک مشکل کام میں وہ کیا سیکھتے اور حاصل کرتے ہیں۔

جانچ پرمبنی منصوبہ: طلبہ کو ایک معینہ مدت اور معینہ کورس کے بعد ایک کام دیا جاتا ہے جس میں ان سے امید کی جاتی ہے کہ اسے پروجیکٹ میں اپنی مہارت جو انھوں نے سیکھی ہے اس کو کیسے اپلائی کریں جیسے انجینئرنگ کے طلبہ کو ایک بلڈنگ ماڈل بنانے یا ڈیزائن کرنے کا پروجیکٹ دیا جائے وغیرہ۔

سروے اور سوالات: دراصل اس کے ذریعے طلبہ اور دوسرے Stakeholder سے بہت سارے سوالات کے ذریعے معلومات اکٹھا کی جاتی ہیں جیسے کہ طلبہ تشفی سروے ان کے حاصل تجربہ کے بارے میں والدین اور اساتذہ کا سروے، اور اسکول کا متوقع پروگرام وغیرہ۔ نیچے ان کی خوبیوں اور خامیوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

خوبیاں

- اس سے طلبہ اور اساتذہ کو بالواسطہ تاثر ملتا ہے۔
- صحیح وقت پر تعلیمی خلا کو پر کرنے کی تشخیص ہوتی ہے اور مسائل پر گفتگو کی جاتی ہے۔
- استاد کو اپنی تدریسی حکمت عملی کو ضرورت کے مطابق بدلنے اور اختیار کرنے کا موقع ملتا ہے۔

خامیاں

- اس میں بڑا وقت لگتا ہے۔
- کچھ طلبہ ہمیشہ سیکھنے کے وقت ذہنی دباؤ میں رہتے ہیں۔

مجموعی جانچ کی خوبیاں

- یہ اسسمنٹ پورے سیکھنے کے مرحلے کی ایک جامع جانچ کرتا ہے۔
- موازنے کو بہت ہی معیاری بناتا ہے چاہے گروپ ہو یا فرد واحد یا کسی جماعت میں۔
- پورے نصاب کی جانچ کرتا ہے۔

تعلیمی گیپ کی شناخت اور جانچ

- طلبہ کی سابقہ معلومات کو پرکھتا ہے اور لرننگ گیپ کو متعین کرتا ہے۔
- طلبہ کی خاص ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے خاکہ دیتا ہے تاکہ اس کی نشوونما جاری رہے۔

خامیاں

- کسی پروگرام کے شروع میں تجزیاتی جانچ کرنے سے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔
- اعتماد اور اعتبار سے سمجھوتہ کرنا پڑسکتا ہے اگر جانچ صحیح نہیں ہوئی تو مناسب اسسمنٹ نہیں ہوگا۔

حسن کارکردگی

خوبیاں

- یہ اسسمنٹ دراصل اس بات کی رہنمائی کرتا ہے کہ حاصل شدہ معلومات کو صحیح طریقے پر کیسے استعمال کیا جائے۔
- معلومات یا مہارت کی ایک جامع اور مکمل جانچ کرتا ہے۔
- مشکلات کو حل کرنے میں جدید طریقہ کار کو استعمال کرنا۔

خامیاں

- اس میں کارکردگی کی جانچ کرنے کے لیے موضوع پرمبنی فیصلہ لینے پڑسکتے ہیں۔
- اس طرح کے اسسمنٹ میں بہت زیادہ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔

خود احتسابی

- اس طرح کی جانچ میں طلبہ کو ان کی ذاتی آموزش میں نمایاں ہونے کا موقع ملتا ہے۔
- بچے کو سیکھنے کا حق اور جواب دہی کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔
- یہ اسسمنٹ علمی مہارت اور خود آگہی کو فروغ دیتا ہے۔

خامیاں

- طلبہ اپنی صلاحیت اور مہارت کو برتر یا کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔
- اس میں خارجی اسسمنٹ کے بجائے موضوعیت کا فقدان ہوتا ہے۔

مشترکہ جانچ

خوبیاں

- یہ اشتراک کو بڑھاوا دیتا ہے اور مواصلاتی مہارت کو فروغ دیتا ہے۔
- ایک ہی عمل پر مختلف اور متنوع نقطہ نظر دیکھنے کو ملتا ہے۔
- اسسمنٹ کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے اور طلبہ کے درمیان اس کی تصحیح کرتا ہے۔

خامیاں

- غیر مساوی اشتراک سے کسی عمل کی شفافیت (Fairness) پر برا اثر پڑسکتا ہے۔
- اس طرح کے اسسمنٹ میں اعتماد اور اعتبار ایک مشکل ترین عمل ہے۔

حصول پذیری

- یہ ایک لچکدار اور رسائی کے لیے آسان ترین اسسمنٹ ہے خاص طور سے دور دراز یا دیہی علاقوں میں۔
- یہ درجہ بندی کے عمل کو بہت آسان اور کاغذی کارروائی کے عمل میں تخفیف کرتا ہے۔
- بہت سارے امور اور عمل میں فوری تاثر کا حصول ممکن ہوجاتا ہے۔

خامیاں

- تکنیکی خرابیاں اور وسائل اسسمنٹ جانچ کے عمل میں خلل ڈال سکتے ہیں۔
- دھوکہ دھڑی اور محفوظ اسسمنٹ کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ تعلیمی جانچ تعلیم کے نظام کا ایک لازمی جزو ہے جو نہ صرف طلبہ کی کارکردگی کو جانچتا ہے بلکہ سیکھنے کے عمل کو بہتر بنانے میں بھی معاون ہے۔ جدید دور میں یہ ضروری ہوگیا ہے کہ جانچ کے مختلف طریقوں کو متوازن انداز میں استعمال کیا جائے تاکہ طلبہ کی ہمہ جہت ترقی ممکن ہو سکے۔

ایک مؤثر تعلیمی نظام وہی ہوتا ہے جو صرف نمبروں تک محدود نہ ہو بلکہ طلبہ کی فہم، مہارت اور عملی زندگی کی تیاری پر بھی توجہ دے۔ لہٰذا، تعلیمی جانچ کا اصل مقصد صرف نتائج حاصل کرنا نہیں بلکہ سیکھنے کے عمل کو بہتر اور بامعنی بنانا ہونا چاہیے۔

■

Dr. A. Rahman
Deputy Director
IGNOU Regional Center Delhi-1, Periyar Centre
2nd Floor, FC-33, Plot No-1 & 2
Jasola Institutional Area, Jasola Vihar
New Delhi - 110025, India
Emai: ataurrahman@ignou.ac.in

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کررہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ، urduduniyancpul@yahoo.co.in

گوشۂ منشی پریم چند

31 جولائی 2026 کو اردو افسانے کے بنیاد گذار اور مایہ ناز ادیب منشی پریم چند کی ولادت کے 146 سال مکمل ہو جائیں گے۔ 1880 میں جنم لینے والے اس قلمکار نے اپنی زندگی کی 56 بہاریں دیکھنے کے بعد دنیا کو الوداع کہا اور اس مختصر عرصے میں ہی اردو فکشن کا دامن اتنا وسیع کر دیا کہ آنے والی نسلیں صدیوں تک اس سے موتیاں چنتی رہیں گی۔ یہ سعادت بہت کم قلمکاروں کے حصے میں آئی کہ انھوں نے کسی صنف کی بنیاد رکھی اور پھر وہی اس صنف کے اوج ثریا پر بھی فائز ہوئے۔ منشی پریم چند ایک ایسے ہی ادیب ہیں۔ 'کفن' اور 'گئودان' جیسے شاہکار ان کی اسی انفرادیت کی لازوال مثالیں ہیں۔

یوم پیدائش کی مناسبت سے اس عظیم قلمکار کو ادارے کی جانب سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے حد درجہ مسرت ہو رہی ہے۔ پریم چند سے متعلق گوشہ کچھ نئے اور پرانے قلمکاروں کی تحریروں سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی منشی پریم چند کی تین ایسی تحریریں بھی شامل کی گئی ہیں جو ایک زمانہ قبل ماہنامہ 'ترجمان' (لاہور) میں شائع ہوئی تھیں لیکن کسی سبب قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والی مدن گوپال کی چوبیس جلدوں میں مرتبہ کلیات منشی پریم چند کا حصہ نہ بن سکیں۔ یہ تحریریں بھی ڈاکٹر پردیپ جین کے شکریے کے ساتھ گوشہ میں شامل کی جا رہی ہیں۔ (ادارہ)

(پیدائش: 31 جولائی 1880 — وفات: 8/ اکتوبر 1936)

نامور سنگھ
اور ہندوستانی ادب کا پرامیتھیوس
پریم چند

قدوس جاوید

نامور سنگھ ایک مارکسی نقاد رہے ہیں۔ ''قومی تحریک آزادی اور پریم چند'' کے عنوان سے اپنے ایک خطبہ/ لیکچر میں مارکس اور مارکسی جمالیات کے حوالے سے جس طرح پریم چند کو مرکز میں رکھ کر معاصر تخلیقی و تنقیدی ادب سے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نامور سنگھ نے 'پریم چند ادب' کے ان بہت سارے سیاقات و محرکات (Contexts & Motives) کی نشاندہی کی ہے جن پر اب تک زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ پریم چند کی دائمی معنویت کے کئی نئے اور نا دیدہ پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے نامور سنگھ نے جس طرح دلائل کے ساتھ پریم چند کو ہندوستانی ادب کا ''پرامیتھیوس'' (PROMETHEUS) قرار دیا ہے، وہ پریم چند کی تفہیم و توضیح کے باب میں ایک 'قول فیصل کا حکم رکھتا ہے۔ اپنے اس دعوے کی تائید میں نامور سنگھ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند کا ادب 'مارکسی جمالیات' کی غیر جانبدارانہ تعبیر سے عبارت ہے۔

کارل مارکس کے نظریہ ادب سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے نامور سنگھ نے اول تو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

(''لینن نے مارکسیت کے تین ماخذوں:

1۔ جرمن فلسفہ۔ 2 برطانوی معاشیات اور 3۔ فرانسیسی اشتراکیت کا ذکر کیا ہے

لیکن مارکسیت کا ایک چوتھا ماخذ بھی ہے اور یہ چوتھا ماخذ شعر و ادب سے متعلق ''یونانی تصور المیہ (Tragedy) ہے''

نامور سنگھ نے مارکس کے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''فطرت کے ڈیموکریٹین اور اپی کیورین فلسفہ کا فرق (The Difference between the Democritean and Epicurean Philosopy of Nature) کی بنیاد پر مشہور یونانی ٹریجڈی ''پرامیتھیوس باونڈ'' (Prometheus Bound) کے حوالے سے، لینن کے اس مفروضے کو درست قرار دیا ہے کہ ''مارکس دنیا کی تاریخ کا دوسرا پرامیتھیوس تھا''۔ پرامیتھیوس وہ باغی تھا جس نے نوع انسان کے لیے 'آگ' چُرائی تھی۔ اور اس جرم کی پاداش میں اسے ایک بے آب و گیاہ مقام پر چٹان سے باندھ دیا گیا تھا اور 'گِدھ' اس کے جسم کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ لیکن پرامیتھیوس نے ہمت نہ ہاری، اور 'پیٹر زیوس' (اقتدار) کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے، اور سزا جھیلتا رہا۔ نامور سنگھ کہتے ہیں:

''مارکس کو لینن نے جو 'دوسرا پرامیتھیوس' کہا ہے تو اس کا جواز کیا ہے؟ وہ کون سی 'آگ تھی جسے مارکس نے چرایا تھا؟۔

وہ آگ 'گیان' (علم و آگہی) کی آگ تھی۔ اور جیسا کہ کہا گیا ہے ''گیان' ہی 'مکتی' ہے''، 'گیتا' میں گیان کو 'اگنی' (آگ) کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ، اس گیان کی آگ سے اپنے وجود کو پاک، مصفا اور مکمل کرو۔''

(حضرت موسیٰ بھی اپنی قوم کے لیے جس آگ کی جستجو میں گئے تھے، وہ یہی علم و آگہی کی آگ تھی)۔ لیکن اس وقت اس گیان کی آگ عام لوگوں کے لیے نہیں تھی، مارکس عرفان و آگہی کی اس آگ کو ہر طرح کی حد بندیوں سے آزاد کر کے استحصال زدہ عام لوگوں/ دلتوں تک لے آیا تھا ''اگیان'' (جہالت) میں پڑے ہوئے ایک بڑے طبقے کو جسے ''پرولتاری'' کے نام سے جانا جاتا ہے اسے مارکس ہی منظر عام پر لایا تھا۔ اسی لیے تاریخ میں مارکس کو ''دوسرا پرامیتھیوس'' کہا جاتا ہے۔ ہندوستانی ادب میں یہی فریضہ پریم چند نے انجام دیا۔

گھیسو اور مادھو (کفن) ہوری اور دھنیا (گئودان) جیسے ہندوستانی پرولتاری کرداروں کے مسائل و معاملات کی آگ کو گرفت میں لینے کی جرأت مندی کا مظاہرہ کرنے والے پریم چند کو ''پرامیتھیوس'' قرار دینا غلط نہیں۔ جنم جنمانتر سے بھوک کے مارے دبے کچلے گھیسو اور مادھو کا سارا وجود 'شکم پُری (پیٹ بھر کھانا) کی 'للک' کا استعارہ بن چکا تھا، ''مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ اگر ('دردِ زہ' سے مرتی ہوئی بُدھیا کو دیکھنے) کوٹھری میں گیا تو گھیسو (باپ) آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا... دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ (گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی، جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی، وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی، اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ وہ بولا ''وہ بھوج نہیں بھولتا، تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور 'پیٹ بھر' نہیں ملا'') (افسانہ۔ کفن)

ہندوستان کی غلامی کی سب سے زیادہ مار غربت اور استحصال کے شکار ہوری (گئودان) جیسے ان پڑھ کسان جھیل رہے تھے۔ تحریک آزادی کی باگ ڈور ولایت کے تعلیم یافتہ ان رئیس زادوں کے ہاتھوں میں تھی، جن میں سے اکثر لوگوں نے کبھی گاؤں نہیں دیکھا

ہوگا ،اور جنھیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ ہندوستان کے ہزاروں لاکھوں ُلمی‘ اور ’بیلاری‘ جیسے جھاڑ، اُجاڑ گاؤں میں ہوری جیسے ’کسانوں کے’’ گھر‘‘ کہلانے والے ٹھکانے کیسے ہوتے ہیں؟

تیسری دہائی کے وسط سے، جب ’کفن‘ اور گئودان کی تخلیق ہوئی آج 2026 تک آکر آزادی کے 75 سال بعد بھی گھیسو اور مادھو، ہوری اور دھنیا کی حالت نہیں بدلی ہے۔ رائے صاحب جیسے زمیندار، ماتا دین جیسے دھرم کے ٹھیکیدار اور مسٹر کھنہ جیسے مِل مالک کے سبب اپنے ہی کھیت میں مزدور کی طرح کام کرنے اور نا مساعد حالات سے مقابلہ نہ کر پانے کی صورت میں ’موت‘ کو گلے لگانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

ایک ذمہ دار ہندوستانی ادیب کی حیثیت سے، پریم چند نے برطانوی Colonoial Diplomacy کے دھد ھکتے’’الاؤ‘‘ سے’’ دیسی واد‘‘(Nativeness کی آگ کو گرفت میں لے کر، افسانہ اور ناول کی صورت عام عوام کے سپرد کردیا تا کہ وہ من حیث القوم (ہندوستانی) اپنے ’اجتماعی وجود‘ کو غلامی، غربت و استحصال، جہالت اور احساس کمتری سے پاک کرسکیں۔ کیونکہ اس کے بغیر آزادی کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ تحریک آزادی، اور سوراجیہ کے ماحول میں اپنے زمانے کی سیاست سے آگے چلتے ہوئے پریم چند نے ’’گوشۂ عافیت‘‘ میں آزادی کا واضح مطلب پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

’’آزادی کا مطلب ہے قومی آزادی، سیاسی آزادی، اور اقتصادی آزادی، لیکن ان سب سے زیادہ ضروری ہے مکمل ذہنی اور نظریاتی آزادی،۔ جب تک کسان کو اس کے فرسودہ خیالات سے آزاد نہیں کیا جائے گا، تب تک سیاسی اور اقتصادی طور پر بھی کسان آزاد نہیں ہوسکتا‘‘۔

اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس طرح کے چیلینجنگ افکار و نظریات کے حوالے سے نامور سنگھ کا، پریم چند کو ہندوستانی ادب کا پرومیتھیوس قرار دینا غلط نہیں ہوگا؟۔ نامور سنگھ نے اپنے خطبے کے آغاز میں ہی واضح کردیا ہے کہ:

’’.... پریم چند ہماری جنگ آزادی کے انوکھے اور عظیم کہانی کار تھے۔ اور اس میدان میں پورے ہندوستانی ادب میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ 6،1905 کے ’بنگ بھنگ‘ (تقسیم بنگال) سے لے کر 1936 تک جب پریم چند کی وفات ہوئی اس پورے عرصے میں، ہندوستانی زندگی کی دھڑکن، دُکھ درد، جدو جہد اور شکست و فتح کو پوری گہرائی اور وضاحت کے ساتھ اگر آپ کسی ہندوستانی ادیب کے یہاں ڈھونڈنا چاہیں تو رابندر ناتھ ٹیگور، شرت چندر، سُبرامنیہ سوامی اور وی ایس کھانڈیلکر کے ہوتے ہوئے بھی میں پریم چند کا نام لوں گا۔ کیونکہ یہی وہ واحد ادیب ہیں جن کے ادب میں جنگ آزادی کی داستان پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی لکھنؤ کانفرنس (1936) میں ’’حسن کا معیار‘‘ بدلنے پر اصرار کرتے ہوئے، ادب کی اہمیت کے بارے میں ایک اور جملہ بھی کہا تھا کہ ’’ادب، سیاست کے آگے مشعل لے کر چلنے والی سچائی ہے‘‘۔ پریم چند کی کہانی ’’دنیا کا انمول رتن ‘‘میں معشوقہ اپنے عاشق سے کہتی ہے‘‘۔

’’میں اپنا پیار تمہیں اس وقت دوں گی جب تم مجھے ’دنیا کا سب سے انمول رتن‘ لا کے دو گے‘‘۔

تیسری دھائی کے وسط سے، جب ’کفن‘ اور ’گئودان‘ کی تخلیق ھوئی آج 2026 تک آکر آزادی کے 75 سال بعد بھی گھیسو اور مادھو ، ھوری اور دھنیا کی حالت نھیں بدلی ھے ۔ رائے صاحب جیسے زمیندار ، ماتا دین جیسے د ھرم کے ٹھیکیدار اور مسٹر کھنہ جیسے مل مالک کے سبب اپنے ھی کھیت میں مزدور کی طرح کام کرنے اور نا مساعد حالات سے مقابلہ نہ کر پانے کی صورت میں ’موت ‘ کو گلے لگانے پر مجبور ھوجاتا ھے ۔

عاشق جب واپس لوٹتا ہے، تو تین چیزیں لے کر لوٹتا ہے۔ ایک وطن کے لیے پھانسی پر چڑھے ہوئے آدمی کے ’آنسو‘۔ دوسری، شوہر کے ساتھ جل جانے والی بیوی کی ’راکھ‘، اور تیسری چیز شہید ہوجانے والے راجپوت کے ’لہو کی ایک بوند‘۔ یہی تین چیزیں پریم چند کی نظر میں ’’دنیا کے سب سے انمول رتن‘‘ ہیں‘‘۔

نامور سنگھ نے ’حب الوطنی اور وطن کے لیے قربانیوں پر مبنی ابتدائی کہانیوں کے حوالے سے ایک اہم بات کہی ہے کہ:

’’جنگ آزادی کے اس دور کو بعض مورخین نے چند انقلابی لوگوں سے جوڑ کر Militant Nationalism,Revivalism کا نام دیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ جدو جہد آزادی سے وابستہ مختلف اور متضاد فکر کے لوگ تھے مثلاً دادا بھائی نوروجی اور گوکھلے، جو مغرب کے جدید فکر و فلسفہ اور سیاسی نظریات کو اپنانے کے حق میں تھے (سرسید کا شمار بھی ایسے ہی دانشوروں میں ہوتا ہے) دوسری جانب لوک مانیہ تلک تھے جو مغرب کے کٹر نقاد تھے۔ پریم چند کے ادب میں مشرقیت بنام مغربیت کا یہ تصادم نمایاں ہے، نامور سنگھ کہتے ہیں کہ:

’’پریم چند اپنے ادب میں ’’نشاۃ ثانیہ‘‘ کی توسیع کرنے والے مجاہد آزادی تھے۔ پریم چند اپنی ابتدائی کہانیوں میں کسی مخصوص قومیت پسندی یا اندھی قومیت پسندی کی حمایت نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ اس دور کے عوام کے اندر کے تیاگ اور قربانی کے جوش و جذبے کی کہانیاں لکھ رہے تھے‘‘۔

1917 کے روسی انقلاب کے بعد ہندوستانی سیاست کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ادب میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پریم چند اس سے پہلے ہی ’سیواسدن‘ (بازار حسن) لکھ کر شہرت کی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے۔ پریم چند نے ’بازار حسن‘ میں محض ایک طوائف (سُمن) کی کہانی نہیں پیش کی ہے بلکہ ان اسباب کو نمایاں کیا ہے جو عورت کو طوائف بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ (اردو میں رُسوا کے ناول اُمراؤ جان ادا سے لے کر منٹو کے، ’خوشیا‘ ’ہتک‘، اور کالی شلوار جیسے کئی افسانوں میں، ان اسباب کی گرہیں کھولنے کی کوششیں نظر آتی ہیں)۔ بازار حسن میں سُمن کی بے راہ روی کے لیے اس کی اپنی کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی ہے لیکن سُمن کے طوائف بننے کی اصل ذمہ داری اس کے شوہر پر ہی ڈالی ہے۔ پریم چند ’عورت کے بارے میں ایک خوشگوار مثالی تصور رکھتے تھے، گئودان کے مسٹر مہتہ کی زبانی پریم چند نے عورت کو ’ایثار کی مورت قرار دیا ہے۔ پریم چند کے ناول ’’گوشہ عافیت‘‘ کو اردو کا اولین ’’تانیثی ناول‘‘ کہا جاسکتا ہے۔

پریم چند کا ادب سیاست سے آگے تھا۔ 26 جنوری 1930 کو کانگریس کے لاہور اجلاس میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے ’’مکمل سوراجیہ‘‘ کے مطالبے کا اعلان تو کر دیا تھا۔ لیکن ’سوراجیہ کے خدوخال کیسے ہوں گے؟ آزادی کا مطلب کیا ہوگا؟ یہ سب طے کرنے میں کانگریس کو

دس سال لگ گئے لیکن پریم چند'' گوشہ عافیت''میں ہی یہ واضح کر چکے تھے کہ:

'سوراجیہ تمام سرمایہ دار سامنتی طاقتوں کو ختم کرنے کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے''۔

اسی طرح، حکومت کیا ہے؟ What is Govt & Stateاس کی تعریف، عام کسان کی زبان میں پریم چند نے سیاست کی کتابوں سے الگ، بڑی سادگی سے طنزیہ (مزاحیہ) انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا:

''پڑھے لکھے آدمیوں نے ایک تنظیم بنا رکھی ہے اسی کا نام حکومت ہے''۔

اکثر لوگوں کے لیے ''جدو جہد آزادی'' صرف غلامی کے خلاف ایک سیاسی آزادی کی جدو جہد تھی لیکن پریم چند نے ایک قدم آگے بڑھ کر 'گوشہ عافیت' میں لکھا کہ'' آزادی کا مطلب ہے' قومی آزادی، سیاسی آزادی، اور اقتصادی آزادی لیکن ان سب سے زیادہ ضروری ہے ذہنی اور مکمل نظریاتی آزادی''۔

پریم چند نے یہ سب اس وقت کہا جب کانگریس نے مطالبہ کیا تھا کہ بھوک سے مرتے کسانوں کا 'لگان' کم کیا جائے۔ پریم چند کا موقف یہ تھا کہ،'' کسانوں کا 'لگان' نصف ہوجانا، ان کے لیے اتنا اہم نہیں ہے جتنا اہم کسانوں کی اندھی تقلید، فرسودہ رسم و رواج، نشہ کی لت، اور آپسی تنازعہ سے نجات دلانا اور انھیں کارندوں، پٹواریوں اور دوسرے عملوں کے ظلم وستم سے بچانا ہے۔''

پریم چند کو ابتدا میں اکثر ناقدین نے' گاندھی وادی' بھی کہا تھا۔ لیکن یہ بات جُزوی طور پر ہی صحیح ہے۔ کیونکہ بحیثیت مجموعی آزادی کے حوالے سے گاندھی جی اور پریم چند کے تصورات میں قدرے فرق بھی محسوس ہوتا ہے۔ 'گوشہ عافیت' سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پریم چند نے''طبقاتی عدم مساوات'' کے علاوہ اس دور کے ایک نہایت حساس مسئلہ''فرقہ وارانہ فسادات'' پر بھی توجہ مبذول کی ہے۔ پریم چند نے بیسویں صدی کے مشہور اردو رسالہ''زمانہ'' میں'' آج کا زمانہ کیسا ہے'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں فرقہ پرستی کو جنگ آزادی کی راہ کی سب سے بڑی رُکاوٹ قرار دیا تھا۔

پریم چند نے عام لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ فرقہ واریت، انگریزی حکومت کی Divide & Rule کی حکمت عملی کے تحت پھیلایا گیا ایک جال ہے۔ پریم چند کے زمانے میں فرقہ پرستی کے علاوہ 'ہریجنوں (دلتوں)' کا عام مندروں میں داخلہ بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ پریم چند نے 'میدان عمل' میں اس مسئلے کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے

''اُس دن ہری جن مندر میں گھُس گئے، پُجاری بہت خوش تھا کہ 'چڑھاوا سب دن سے بہت زیادہ ملا''

(لیکن پریم چند ہریجنوں اور اچھوتوں کے مسائل کا حل صرف مندروں میں ان کے داخلہ کو نہیں سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں پریم چند کی ایک چھوٹی سی کہانی ''ٹھاکر کنواں'' بے حد اہم ہے۔ اس میں جوکھوں نامی ہریجن

پریم چند نے''طبقاتی عدم مساوات'' کے علاوہ اس دور کے ایک نہایت حساس مسئلہ''فرقہ وارانہ فسادات'' پر بھی توجہ مبذول کی ہے۔ پریم چند نے بیسویں صدی کے مشہور اردو رسالہ''زمانہ'' میں'' آج کا زمانہ کیسا ہے'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں فرقہ پرستی کو جنگ آزادی کی راہ کی سب سے بڑی رُکاوٹ قرار دیا تھا۔

کسان اور اس کی بیوی 'گُنگی' کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ بیمار کھوجوں جب پانی مانگتا ہے تو گنگی دیکھتی ہے کہ گھر میں رکھا پانی گندہ اور بدبودار ہے وہ جوکھوں کو وہ پانی پینے سے منع کرتی ہے اور اندھیرا ہونے کے بعد تازہ پانی لانے کے لیے 'ٹھاکر کے کنواں' تک پہنچ جاتی ہے۔ ''اس نے پانی کھینچ لیا۔ اسی وقت اچانک ٹھاکر کے گھر کا دروازہ کھُلا... گنگی کے ہاتھ میں ڈور تھی، لوٹا تھا، (گھبراہٹ میں) وہ چھوٹ گیا۔ بھاگتے ہوئے گھر آکے گنگی نے دیکھا کہ 'جوکھوں وہی بدبودار پانی پی رہا ہے'')

پریم چند، ہریجنوں اچھوتوں کو ایسی تمام مجبوریوں سے نجات دلوانا چاہتے تھے۔ پریم چند کا ادب تحریک آزادی کو ایسے ہی تعمیری سانچے میں ڈھالنے سے عبارت ہے۔

نامور سنگھ کے مطابق،''تحریک آزادی کچھ کمزور ہوئی تو پریم چند نے چوگانِ ہستی'' لکھا۔ اس ناول کا مرکزی کردار سورداس جان سیوک کسانوں کو متحد کرنے کی کوشش کرتا ہے اس وقت کے تناظر میں سورد اس جنگ آزادی کا ایک جری' ہیرو' کے طور پر سامنے آتا ہے۔ پریم چند نے اس ناول میں اپنا نظریہ ادب واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ادب وہ مشعل ہے جو سیاست کے آگے چلتا ہے''۔

تحریک آزادی کے حوالے سے نامور سنگھ نے بجا طور پر کہا ہے کہ''1930 کا سال بہت اہم سال ہے۔ اسی سال ''سوراجیہ'' کا اعلان کیا گیا، اسی سال' گاندھی۔ اِروِن' سمجھوتہ ہوا۔ انقلابیوں کی رہائی کے لیے کارگر کوشش نہیں کی گئی اور عظیم مجاہد آزادی بھگت سنگھ کو پھانسی دے دی گئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد الفریڈ پارک میں چندر شیکھر آزاد کو بھی گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ یہی وہ وقت ہے جب پریم چند'' گاندھی واد'' کے دائرے سے باہر آتے نظر آتے ہیں ناول ''غبن'' اسی زمانے میں منظر عام پر آتا ہے۔

نامور سنگھ اپنے اس خطبے کا اختتام اس فیصلہ کُن جملے پر کرتے ہیں کہ،''1907 سے 1936 تک اس جنگِ آزادی میں کتنے رنگ اور کتنے دور آئے لیکن ہر ایک موقع پر پریم چند سیاست کے پیچھے نہیں، آگے ہی تھے پریم چند نے قومیت کا درس اسی طرح اپنے ادب میں دیا تھا۔''

دراصل نامور سنگھ نے پریم چند کے ادب کے ہمہ جہت امتیازات اور ان کی عصری معنویت کو جس طرح تہہ در تہہ کھولا ہے اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ پریم چند کا ادب صرف دیش بھکتی اور گاندھی واد کی تعلیم نہیں دیتا ،صرف جنگ آزادی کی کہانی بیان نہیں کرتا بلکہ ان کا ادب عام عوام کے لیے کام کرنے والے رہنماؤں اور دانشوروں کو درس بھی دیتا ہے کہ کس طرح طبقاتی تفریق، فرقہ واریت، سرمایہ دارانہ نظام اور استحصالی رویوں کو ختم کر کے ایک آدرش آزاد ہندوستان کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ پریم چند نے اپنے ادب میں اسی کے لیے جدو جہد کی تھی۔ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند ہندوستانی ادب کا ''پرامیتھیوس'' تھا اور مارکسی نقاد پروفیسر نامور سنگھ نے اس سچائی کو نہایت خوبی سے ثابت کیا ہے۔

■

Prof. Quddus jawaid
27, Green Hills Colony,
Bathindi Jammu- 181152 (J&K)
Mob. 9419010472, 9018618504
Email: jawaidquddus@gmail.com

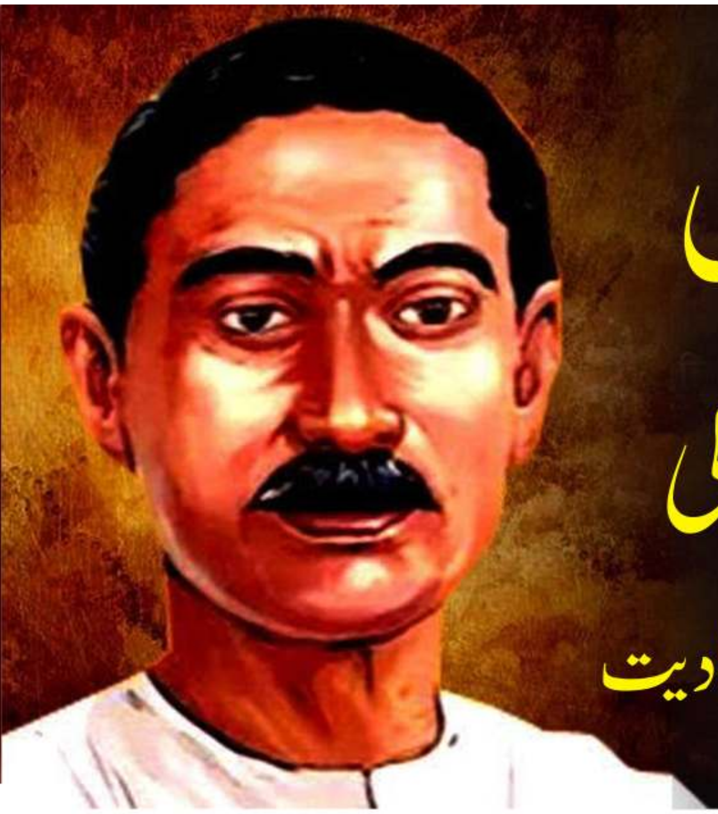

دورِ حاضر میں پریم چند کی
معنویت و افادیت

صغیر افراہیم

پریم چند کی افسانوی شخصیت قدیم و جدید افکار و نظریات کا سنگم تھی۔ ایک طرف وہ ان صحت مند روایات و اقدار اور تہذیب و تمدن کے پاسدار تھے جو ماضی کے ہندوستان کی شناخت تھی، دوسری طرف وہ نئے علوم و فنون کے دلدادہ اور اپنے ہم وطنوں میں انھیں رائج کرنے کے خواہاں تھے۔ اِسی لیے ہندوستانی ادب میں ان کی ہمہ جہت فکری اور فنی کاوشوں کو ایک مستقل عنوان کی حیثیت حاصل رہی ہے، جس کا سلسلہ ہنوز برقرار ہے۔ ان کی جدّتِ طبع اور نُدرتِ اظہار کا اعتراف یوں تو ان کی زندگی ہی میں ہونا شروع ہوگیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ارضیت پسندی، انسان دوستی اور ادبی وسیع النظری کا اعتراف بڑھتا ہی گیا ہے۔

برس بعد بھی ان کی اہمیت و انفرادیت کا یہ سب سے بڑا اظہار ہے کہ روایتی ادب ہو یا حقیقت پسندی کا دور، رومانی طرزِ احساس ہو یا ترقی پسند رُجحان، جدیدیت کا زمانہ ہو یا مابعد جدیدیت، پریم چند کی تفہیم ہر دور اور ہر ادبی رُجحان کے تناظر میں کی گئی ہے۔ مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والوں نے مختلف زاویۂ نگاہ اختیار کیا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سماج و ادب کی اصلاح سے تعلق رکھنے والے مصلحین و مبلغین نے ہی نہیں بلکہ علم و فن کے دانشوروں نے پریم چند کو کسی نہ کسی زاویے سے اپنایا ہے اور یہی ایک بڑے تخلیق کار کا اعزاز ہوتا ہے کہ دوسرے فن کار اپنے تخلیقی تجربوں کو اس کے آئینے میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔

ایک چھوٹی مگر اہم مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ صنف افسانہ میں پریم چند کے ساتھ راشد الخیری کا بڑا نام سامنے آتا ہے۔ یا راشد الخیری کے ساتھ پریم چند منظرِ عام پر آتے ہیں۔ دونوں فنکار 1936 میں اِس دُنیا سے رُخصت ہوئے۔ راشد الخیری کے 27/افسانوی مجموعوں، 11/معاشرتی اور 10/نیم اسلامی ناولوں کے ساتھ تاریخ و سیرت پر آٹھ، شاعری کے دو اور مضامین کے نو مجموعے شائع ہوئے۔ ان کے ادب کا محور مشرقی روایات اور تہذیب کو قائم رکھنے کی کوشش، نیز طبقۂ نسواں کی فلاح رہا ہے۔ دونوں نے عملی جدوجہد میں بھی حصّہ لیا۔ پریس لگایا، اخبار و رسائل نکالے۔ ایک نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی تو دوسرے نے عام انسانی عظمت کو بنیادی موضوع بنایا۔ ایک کے یہاں دُرافشانی ہے تو دوسرے نے عام فہم الفاظ کے ذریعے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور کارآمد نسخہ تجویز کیا۔ اِس طرح بیسویں صدی کے ابتدائی ایام سے آج تک کے افسانوی ادب (اس میں غیر افسانوی ادب بھی شامل کرسکتے ہیں) کا تجزیاتی محاکمہ کریں تو پریم چند کی حیثیت ایک ایسے نقیب کی اُبھرتی ہے جو شش جہت آزادی، خوشحالی، یکجہتی اور مساوات کا متلاشی رہا ہے۔ انھوں نے بدلتے ہوئے وقت کے مطابق ادب کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کرتے ہوئے 9 اپریل 1936 کو اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:

”....جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال پیدا نہ کرے، وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا“۔ (روشنائی، سجاد ظہیر، ص:118)

ترقی پسند مصنفین کی پہلی کُل ہند کانفرنس میں پیش کیا جانے والا یہ تاریخی خطبہ آج بھی پریم چند شناسی کے خلا کو پُر کرنے کی کامیاب سعی ہے۔ وہ نہ صرف قصہ کہانی کو محل سراؤں سے نکال کر چوپال کی طرف لائے بلکہ اس کو اعتبار و اعتماد بھی عطا کیا۔ یہی جدّت ہمیں ان کی کردار نگاری میں بھی نظر آتی ہے کہ انھوں نے ان کرداروں کو عظمت کا درجہ دیا جن کا سماج میں کوئی مقام نہیں تھا اور انسانی نقطہ نظر سے عموماً ان کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ زبان و بیان کے اظہار میں بھی وہ ایسی تبدیلیاں لائے جو لائق فخر و قابلِ ستائش ہیں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ پریم چند کی صفات و کمالات کی تعریف و توصیف ترقی پسندوں کے علاوہ رومانی طرز کے عاشقوں، حلقۂ ارباب ذوق، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے وابستہ دانشورانِ ادب کے طبقوں نے کی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز برقرار ہے۔ چنانچہ ان کا اتباع محض تخلیقی فنکاروں ہی نے نہیں کیا بلکہ ناقدین بھی نئے نئے نکات کے تئیں پریم چند کی تحریروں کا معروضی مطالعہ کررہے ہیں۔

تخلیقی ادب میں سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی، حامد اللہ افسر، حکیم یوسف حسن، رشید جہاں، اوپندر ناتھ اشک، عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی، دیویندر ستیارتھی، رام لعل، بلونت سنگھ، قاضی عبدالستار، رتن سنگھ، عارف نقوی کے بعد نئی نسل تک یہ سلسلہ دراز ہے۔ خواتین میں شیورانی دیوی، سرلا دیوی، کوشلیا اشک، ساوتری گوسوامی، جیلانی بانو، رینو بہل، ناصرہ شرما، نیتا سنگھ، گیتانجلی شری، ثروت خان کے یہاں پریم چند کا تتبع نمایاں ہے۔ سُریندر پرکاش، شوکت حیات، انور قمر، سلام بن رزّاق کے علاوہ جن فکشن نگاروں نے پریم چند کی تخلیقات کو مرکز ومحور بنا کر قصّہ کو نئی شکل میں آگے بڑھایا ہے ان میں علی ضامن کا ناول ''گئودان کے بعد'' اور اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''عید گاہ سے واپسی'' بہت نمایاں ہیں۔

تنقیدی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تو فن پاروں کو نت نئے انداز سے پرکھنے کا سلسلہ عہد پریم چند سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ نیاز فتح پوری، دیانرائن نگم، پیارے لال شاکر میرٹھی، سجاد ظہیر، وقار عظیم، واجد قریشی، لطیف الدین احمد، عزیز احمد، رشید احمد صدیقی، عابد حسین، صالحہ عابد حسین، ممتاز حسین، احتشام حسین، آل احمد سرور، اصغر علی انجینئر، رام لال نابھوی، قمر رئیس، یوسف سرمست، محمد حسن، ابواللیث صدیقی، شکیل الرحمٰن، عتیق احمد، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، صادق، جعفر رضا زیدی، سلیم اختر، مدن گوپال، ہنس راج رہبر، شمیم نکہت، ابوالکلام قاسمی، پردیپ جین، علی احمد فاطمی، ارتضٰی کریم، سیما صغیر تک دراز ہے۔ پیارے لال شاکر میرٹھی ان کے عکس ونقش کو اس طرح اُبھارتے ہیں:

''پریم چند کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر ایک آدھ کتاب ان کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اس کے ساتھ ہی حافظہ بھی بلا کا تھا...''

ل۔احمد (لطیف الدین احمد) کے مطابق:

''پریم چند کی توجہ زیادہ تر معاشرتی مسائل پر مرکوز رہی اور انھوں نے بالعموم ادنیٰ اور متوسط طبقہ کی زندگی کو پیش کیا ہے...''

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں میں ان کے عہد تک کے ہندوستان کی معاشی، سیاسی، طبقاتی اور عوامی کشمکش کا بڑا واضح اور تابناک نقشہ ملتا ہے''۔

> **پریم چند پہلے ادیب ہیں جن کی نظر حیاتِ انسانی کے اس انبوہ میں ان مجبور اور مقہور انسانوں تک پہنچی جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح صدیوں سے گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے انھیں زبان دی۔**

سیداحتشام حسین رقم طراز ہیں:

سیداحتشام حسین رقم طراز ہیں:

''پریم چند کا ذہن ارتقا پذیر تھا۔ ان کا فن حالات کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ ان کے خیالات، واقعات کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہندوستانی عوام کی روح میں اُتر کر ان کے دکھ درد، ان کے کرب واضطراب، ان کی مایوسی اور اُمید، ان کے خوابوں اور خیالوں کو دیکھ سکتے تھے۔ وہ انھیں اُس جال سے نکال کر ایک بہتر زندگی کا خلعت دینا چاہتے تھے جس میں وہ صدیوں سے جکڑے ہوئے تھے''۔

قمر رئیس لکھتے ہیں:

''پریم چند پہلے ادیب ہیں جن کی نظر حیاتِ انسانی کے اس انبوہ میں ان مجبور اور مقہور انسانوں تک پہنچی جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح صدیوں سے گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے انھیں زبان دی''۔

آل احمد سرور نے ان کے فن پاروں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''ہم اپنے سماج کے زخموں اور ناسوروں سے، اپنی جہالت اور پراگندگی سے منھ چھپا کر بیٹھنا چاہتے ہیں مگر پریم چند ہماری خلوتوں اور پناہ گاہوں میں گھس کر ہمارے دلوں پر کچوکے لگاتے ہیں...''

پریم چند نے اپنے کالم ''ہمارے نیتاؤں کی بہکی باتیں'' (ہنس، اپریل 1931)، ''رشوت کی گرم بازاری'' (ہنس، 31/جولائی 1933)، ''نیائے میں وِلمب انیائے ہے'' (جاگرن، 14 مئی 1934) یا اداریہ ''جرمنی میں یہودیوں کا اتیاچار'' (جاگرن، 10 اپریل 1933) یا پھر مضامین ''قوتِ بیانیہ'' (مخزن 1908) ''ناول کا فن'' (زمانہ اکتوبر 1922)، ''ناول کا موضوع'' (زمانہ جنوری 1925)، ''مختصر افسانے کا فن'' (مضامین پریم چند مرتبہ عتیق احمد، انجمن ترقی اردو پاکستان 1981)، میں نقد ونظر کے میزان ومعیار کا جو سلسلہ شروع ہوگیا تھا، ان میں جدید مغربی رجحانات ونظریات کے توسط سے عصرِ حاضر کے صحافی اور ناقدین رنگ وروغن بھر رہے ہیں۔

اردو دنیا میں عموماً ان کی ادبی جہات کا دائرۂ کار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر رہا ہے۔ کسی حد تک انشائیہ نگاری پر بھی توجہ دی گئی ہے مگر اکیسویں صدی کے آغاز سے ایک ناقد، مکتوب نگار، صحافی اور مترجم کی حیثیت سے بھی ان پر تحقیقی وتنقیدی کام شروع ہوا ہے۔ اردو میں ان کے اِس کم معروف پہلوؤں پر مدلل اور مسلسل گفتگو سے پریم چند کی مجموعی تخلیقی شخصیت پر مزید تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے میں نئی نسل کو آسانیاں فراہم ہو رہی ہیں۔ اِن پہلوؤں پر یکسوئی اور دلجمعی سے کام کرنے (کتاب ''پریم چند- ایک نقیب''-''پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ'') کی بنا پر مستقبل میں پریم چند کی قدر وقیمت صرف اِس معیار سے متعین نہیں کی جائے گی کہ انھوں نے اردو کے افسانوی ادب کو معیار واعتبار بخشا، بلکہ اُس وسیع ادبی ذخیرے کا بھی مطالعہ کیا جائے گا کہ پریم چند نے فکشن کے علاوہ غیر افسانوی ادب میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے جدّت وندرت سے کام لیا ہے۔1

تفصیل سے گُریز کرتے ہوئے یہاں محض یہ واضح کرنا ہے کہ پریم چند نے خوف ودہشت کی روش اور ظالموں کے طور طریق کے نتیجے میں جن پیش آنے والے حالات کی بظاہر اُس عہد میں جب کہ اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، ان خطرات کو بھانپنے کی کوشش کی ہے، نیز انھوں نے مظلوم طبقے کے ردِّعمل کے تصور کی شدت کا احساس دلا کر معاشرے کو خبردار کیا ہے۔ مثلاً ''گھاس والی'' کی ملیا، ''مندر'' کی سُکھیا، ''گئودان'' کا ہرکھو، ذات پات کی تفریق اور انسانوں سے غیر انسانی سلوک کی واضح مثال ہیں۔ انھوں نے افسانہ

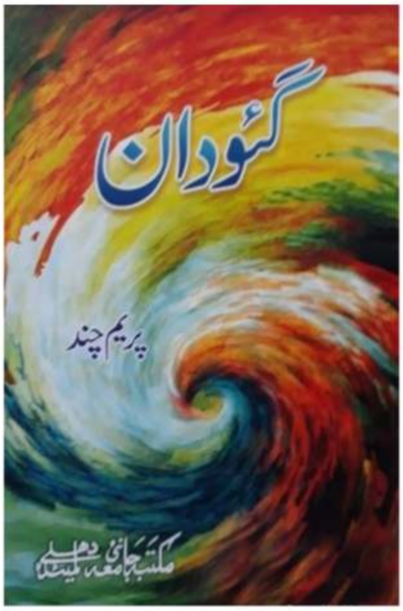

''صرف ایک آواز'' میں بہ بانگِ دہل کہا ہے کہ ظالم کسی شکل میں، کسی بھی طبقے کا ہو، اس کو تختۂ مشق بنانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے ۔ وہ ناول ''میدانِ عمل''، میں اِس حقیقت کو تفصیل سے، طنزِ ملیح کے انداز میں بیان کرتے ہیں ۔ افسانہ ''معصوم بچہ''، ''نجات'' اور ''سوا سیر گیہوں'' میں پروان چڑھنے والے ذہنوں کی تیکھی نشاندہی کرتے ہیں۔ طنزِ ملیح کا تہہ دار انداز ''کفن'' میں نہایت وسیع اور بھرپور انداز میں جلوہ گر ہے، جس کو گوپی چند نارنگ، وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، ابوالکلام قاسمی اور سیما صغیر نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے پیش کیا ہے، بلکہ کوِوڈ-19 کے بعد اِس کو نئے انداز میں تخلیق کا موضوع بھی بنایا جارہا ہے۔ وجہ یہ کہ ''کفن'' کا مرکزی خیال نوآبادیاتی نظام کے دریچوں سے گزرتا ہوا، اُس استحصال سے روشناس کراتا ہے جو طبقہ وارانہ نظام کے تحت سب سے پچھڑے طبقے کے ساتھ روا رکھا گیا اور جس کے نتیجے میں گھیسو اور مادھو جیسے کردار وجود میں آئے، جن کی نفسیات عام لوگوں سے قطعی مختلف ہے اور جن کے افعال و اعمال اتنے غیر متوازن ہیں کہ ان کی سچائی مشکوک معلوم ہوتی ہے، اور قاری کی تمام توجہ بُدھیا کی طرف ملتفت ہوتی ہے۔ تکنیک کے روایتی انداز کو توڑنے والی اِس تہہ دار کہانی میں بہت سے رموز اُس وقت آشکارا ہوتے ہیں جب نشہ گھیسو، مادھو پر غالب آکر، ان کی ظاہری شخصیت کو تہ و بالا کر دیتا اور ان پر چڑھے ہوئے غلاف کو اُتار پھینکتا ہے۔

''کفن'' کے علاوہ پریم چند کی دو اور کہانیاں بھی سنگِ میل قرار پاتی اور شاہکار تخلیق کے زمرے میں آتی ہیں۔ ایک ''روشنی'' اور دوسری ''عیدگاہ''۔ ''روشنی'' میں ایک آئی سی ایس افسر اور ایک دیہاتی بیوہ کو مرکزی کردار بنا کر پریم چند نے ایک غریب بیوہ کی اخلاقی جرأت، جذبہ ایثار اور اعلیٰ انسانی اقدار پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ بیانیہ تکنیک پر مبنی اس افسانہ کا اسلوب سیدھا سادا، صاف ستھرا اور دل کو چھو لینے والا ہے۔ پند و موعظت سے بھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے جملے قدیم ہندوستانی اقدار کو اُجاگر کرتے ہیں۔ دراصل پریم چند نے مذکورہ افسانہ کے ذریعہ ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز و تخصیص کو ختم کرتے ہوئے انسانی ہمدردی اور خلوص و محبت کی شمع جلائے رکھنے کی کوشش کی ہے، وہ شمع جس کی روشنی میں تہذیبیں پروان چڑھتی ہیں۔

''عیدگاہ'' غربت و امارت کا ایک استعارہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار حامد یتیم ہے۔ وہ غربت کی گود میں پل کر بے حد حساس اور باشعور ہو چکا ہے جب کہ دیگر ساتھی دنیا و مافیہا سے بے خبر کھیل کی دنیا میں گم ہیں۔ دوستوں کے ساتھ کھلونے خریدتے ہوئے حامد کا یہ احساس کہ روٹی پکاتے وقت دست پناہ نہ ہونے کی وجہ سے دادی کا ہاتھ جل جاتا ہے تو کیوں نہ ایسی چیز خریدی جائے جو بامقصد اور کارآمد ہو، قاری کو سنجیدہ غور و فکر کی طرف لے جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھا گیا یہ افسانہ امیری و غریبی کی کشمکش، اتحاد و اخوت، یتیموں اور بیواؤں کی بے چارگی اور بچوں کی نگہہ داشت اور پرورش کے ساتھ ان کی خواہشات و نفسیات پر مشتمل چونکا دینے والا اشاریہ ہے۔ مذکورہ افسانہ میں اس بات کا بالواسطہ اعلان ہے کہ اگر غریب، حساس اور بیدار ہوجائے تو وہ 'دست پناہ' کے مانند فولادی ہوجائے گا جس کے سامنے طاقتور اور جابر طبقے جو افسانہ کے منظر نامے پر سپاہی، وکیل جیسی شکلوں میں نظر آرہے ہیں، ٹوٹ، پھوٹ کر خاک میں مل جائیں گے۔ ذرا حوصلہ ہو تو فتح کا پرچم فولادی دست پناہ کی طرح غریب کے ہاتھ میں ہوگا۔ عوامی اقتدار اور جمہوری نظام کی یہ ایک بشارت بھی ہے جسے پریم چند نے نہایت سادگی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُتارا ہے۔ یہی جدّت، نُدرت اور بے باکی ان کے بیشتر ناولوں (اسرارِ معابد، بازارِ حسن، چوگانِ ہستی، میدانِ عمل، گئودان اور نامکمل ناول منگل سوتر) میں ہے جو آج بھی حساس قاری کو اپنی طرف متوجہ کررہے ہیں اور فنکاران پر مزید تعمیرات کررہے ہیں۔

صارفیت کے اِس دور میں، کوِوڈ-19 کی آفتِ ناگہانی کے بعد استحصالی نظام اور فرسودہ روایات کے چٹخنے اور ٹوٹنے کی آواز بہت صاف سنائی دے رہی ہے۔ بالواسطہ طور پر یہ تبدیلی مرہونِ منت ہے اُس فنکار کی، جس نے انسانی حقوق کی سرفرازی کے لیے اپنے قلم کا سارا زور وقف کیا، اور وہ جتن کیے جن سے انسان کا انسان سے ایسا رشتہ برقرار ہو جو انسانیت کا وقار بلند کرے۔ ہندی کے ممتاز نقاد پروفیسر کے. پی. سنگھ ''پریم چند-ایک نقیب'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''...پریم چند مذہب اور معاشرے کے نام پر قدامت پرستانہ خیالات کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔

> تکنیک کے روایتی انداز کو توڑنے والی اِس تہہ دار کہانی میں بہت سے رموز اُس وقت آشکارا ہوتے ہیں جب نشہ گھیسو، مادھو پر غالب آکر، ان کی ظاہری شخصیت کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور ان پر چڑھے ہوئے غلاف کو اُتار پھینکتا ہے۔

وہ فرسودہ رسوم ورواج کے بھی شدید مخالف ہیں۔ معاشرے میں مذہب کا کردار آج کیا ہونا چاہیے، اِس موضوع پر وہ بہت بے باکانہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا سارا ادب ہندوستانی معاشرے میں مثبت تبدیلیوں کا علامیہ ہے۔ وہ سماجی تنظیموں کے حدود اور صلاحیتوں کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے کردار پر خط کھینچتے ہیں---''۔

پریم چند کی افسانوی اور غیر افسانوی تخلیقات نے قاری کو شدت سے احساس دلایا ہے کہ زندگی کے حُسن و جمال کو قائم رکھنے کے لیے، انسانی رشتوں کو توانائی بخشنے کے لیے، جبر واستحصال اور خوف و دہشت کا رویہ ترک کرنا ہوگا__ حق تلفی آج بھی ہو رہی ہے۔ مساوات اور ذہنی آزادی کے لیے ان گنت افراد اب بھی ترس رہے ہیں مگر آج وہ مظلومی، محرومی اور محکومی سے اُس طرح دو چار نہیں جیسا کہ ماضی میں ہوا کرتا تھا۔ شاید اِس وجہ سے بھی کہ آج عدالت کے دروازے سب کے لیے کھُلے ہوئے ہیں__ جمہوری نظام کی بدولت ہر فرد کے حوصلے بلند، خواب خوبصورت اور مستقبل کو خوشگوار بنانے کا عزم ہے، اور یہی عزم و اعتماد پریم چند کی تخلیقات کی معنویت وافادیت کو دوبالا کرتا ہے۔ اردو، ہندی کے اِس ادیب کے ادب کے تفصیلی مطالعے سے جو اہم نکات سامنے آتے ہیں، وہ اس طرح ہیں:

1۔ پریم چند نہ صرف کامیاب تخلیقی فنکار (ناول، افسانہ، ڈرامہ نگار) تھے بلکہ وہ مکتوب نگار، مترجم، صحافی اور انشائیہ نویس بھی تھے۔
2۔ وہ نہ صرف کثیر المطالعہ ادیب تھے بلکہ اپنے عہد کے بیشتر رُجحانات اور تقاضوں سے پوری طرح باخبر اوران سے ہم آہنگ بھی تھے۔
3۔ وہ حالاتِ حاضرہ پر مختلف اور چونکا دینے والے عنوانات سے تبصرہ کرنے کے بجائے دوٹوک گفتگو کے قائل تھے۔
4۔ نئی کتابوں، مذاکروں اور مباحثوں پر، رسمی طور پر نہیں بلکہ باقاعدگی سے رائے دیتے تھے۔
5۔ ادبی سرگرمیوں میں پوری دلچسپی لیتے تھے اور اپنے مشوروں سے احباب کو نوازتے تھے۔
6۔ خواتین میں رائج معاشرتی سلوک پر وہ آبدیدہ ہوتے اور ان کی خوشحالی کے ساتھ ساتھ عزت واحترام کے بھی کوشاں رہتے، انھوں نے عملی طور ایسا کر کے دکھایا بھی تھا۔
7۔ بیماری اور ذہنی الجھنوں میں گھِرے رہنے کے باوجود ہشاش بشاش رہنے کی کوشش کرتے تھے۔
8۔ ہندی میں 'ہنس' اور 'جاگرن' کی بقا اور ہندی اردو کے صحافتی وقار کے فروغ کے لیے ممکن جتن کرتے رہتے تھے۔
9۔ عصرِ حاضر کے شعور اور تقاضوں کے تحت ذاتی تجربہ کو ابلاغ مدعا کے لیے بنیادی ضرورت سمجھتے تھے، جسے آج کے تناظر میں بڑی اہمیت دی جارہی ہے۔

پریم چند کی افسانوی اور غیر افسانوی تخلیقات نے قاری کو شدت سے احساس دلایا ہے کہ زندگی کے حُسن و جمال کو قائم رکھنے کے لیے، انسانی رشتوں کو توانائی بخشنے کے لیے، جبر و استحصال اور خوف و دہشت کا رویہ ترک کرنا ہوگا۔

10۔ ان میں گہری تنقیدی و تحقیقی صلاحیت تھی جس کا استعمال واظہار وہ نہایت محتاط انداز میں کرتے تھے۔
11۔ جون 1757 سے مئی 1857 کی انقلابی جدوجہد کے ساتھ ساتھ وہ سوراج کے مطالبہ اور سودیشی بائیکاٹ کے بھی ہم نوا تھے۔
12۔ ان کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو ممکنہ حد سے کہیں آگے کی ادبی کاوشوں سے اپنے آپ کو باخبر رکھتے ہیں۔
13۔ وہ عوام کے علم وعمل، تہذیب و معاشرت اور جذبات ومحسوسات کو ادیب کے مطالعے اور مشاہدے کے لیے نہایت ضروری سمجھتے تھے۔
14۔ وہ گاؤں کو آباد، خوشحال اور ترقی یافتہ دیکھنے کے خواہش مند تھے۔
15۔ ہندوستانی زبان و ادب یعنی اردو، ہندی کو بین الاقوامی سطح پر اُبھرتا ہوا دیکھنے کے آرزومند تھے اور اِس کے لیے انھوں نے علمی اور عملی جتن کیے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، مضامین، تبصرے، اداریے اور خطوط کسی دیو مالائی کردار کی نہیں بلکہ ایک عہد ساز شخصیت کے فن کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ پُروقار شخصیت جس نے اپنا زورِ قلم غلام دیس کو آزاد کرانے، تعلیم کی اہمیت کو اُجاگر کرنے، اردو، ہندی کو قریب لانے، بھائی چارے کو فروغ دینے، جاگیردارانہ نظام اور اُس کے اندر پنپنے والی ذہنیت کا پردہ فاش کرنے، استحصال پسندوں کو بے نقاب کرنے، ذات پات کی تفریق کا انسداد کرنے، قدیم فرسودہ رسوم کو مٹانے اور عورتوں کو ان کا سماجی مرتبہ دلانے پر صرف کیا۔ پریم چند کی ہشت پہل شخصیت، ان کی وسیع النظری اور دھرتی سے اٹوٹ لگاؤ کو جاننے بلکہ ان کے عہد کو مکمل طور سے سمجھنے کے لیے موصوف کی تمام افسانوی اور غیر افسانوی تحریروں کا ایک ساتھ وسیع تر تناظر میں پڑھنے کی ضرورت ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کا چلن بڑھ رہا ہے۔ شاید اِس وجہ سے بھی کہ آج کے ادب نواز دوستوں اور دانشوروں نے سمجھ لیا ہے کہ اب محض عقیدت اور مفروضوں سے بات بننے والی نہیں ہے۔

کتابیات

-1 مضامین: 27 سوانحی (اردو میں)، دس تنقیدی مضامین اردو میں، 18 ہندی میں
-2 تبصرے: 17 (اردو میں)
-3 انشایئے: 32 (اردو میں 13، ہندی میں 19)
-4 اداریے: 450 (آج، مریادا، ہنس، جاگرن وغیرہ)
-5 کالم: 150 (مادھوری، پرتاپ، جاگرن، ہنس وغیرہ میں)
-6 خطوط: 695 (اردو میں 465، ہندی میں 225، انگریزی میں 5)
-7 ترجمے: دس

Prof. Saghir Afraheim
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (UP)
Mob.: 9358257696
a.afraheim@yahoo.in

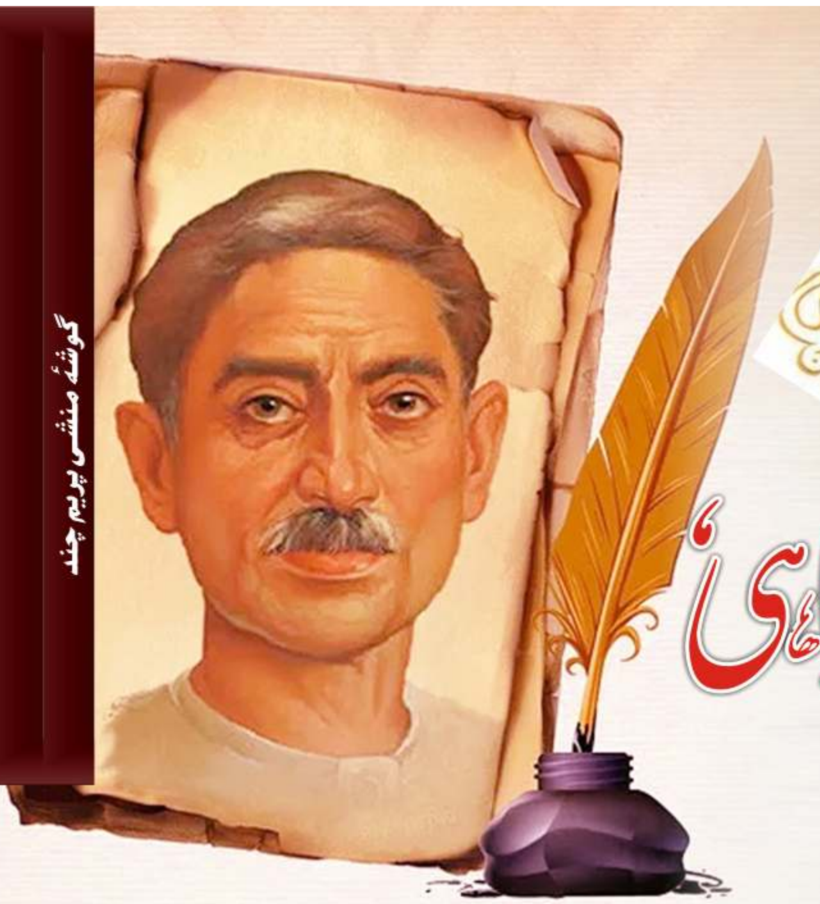

شہزاد انجم

'پریم چند: قلم کا سپاہی'

چند مباحث

پریم چند شناسی کے تعلق سے جن دو کتابوں کی حیثیت بنیادی ہے، ان میں پہلی کتاب پریم چند کی اہلیہ شیورانی دیوی کی ''پریم چند: گھر میں'' اور دوسری کتاب پریم چند کے بیٹے امرت رائے کی ''پریم چند: قلم کا سپاہی'' ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے مطالعے سے پریم چند کی ذاتی، خانگی، سماجی اور سیاسی زندگی کا بھرپور علم ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پریم چند کی بیوی اور بیٹے کی کتاب پر اعتراضات بھی کیے گئے کہ اِن دونوں کتابوں میں مصنفین نے جانبداری سے کام لیا ہے۔ انھوں نے پریم چند کی زندگی کے صرف روشن پہلوؤں کو دکھایا ہے اور پریم چند کو مثالی شخصیت اور ہیرو بنا کر پیش کیا ہے جبکہ پریم چند بھی ایک عام انسان تھے اور ان میں بھی بشری خوبیاں اور خامیاں دونوں ہی موجود تھیں۔ اِن اعتراضات کے باوجود یہ دونوں کتابیں پریم چند فہمی، ان کی تحقیق و تنقید میں بے حد معاون و مددگار رہیں۔ اس کی بنیادی اور بڑی وجہ یہ ہے کہ شیورانی دیوی اور امرت رائے نے پریم چند کو اتنے قریب سے دیکھا، شب و روز ساتھ گزارا، پل پل ساتھ جیا، جتنا کسی دوسرے شخص کو موقع نہیں ملا۔ انھیں پریم چند کے محسوسات، خیالات، افکار و نظریات کو سمجھنے کا پورا موقع ملا۔ پریم چند تحقیق کے تعلق سے جن بنیادی ماخذ کی ضرورت تھی، وہ انھیں حاصل تھی۔

شیورانی دیوی اور امرت رائے دونوں نے پریم چند کی سوانح عمری لکھی۔ یہ دونوں کتابیں کیا واقعی سوانح عمری ہیں؟ یہ الگ بحث کا موضوع ہے۔ ''پریم چند: گھر میں'' کے مترجم سید حسن منظر اس کتاب کو ''اپنے پتی کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی کتھا''[1] قرار دیتے ہیں جبکہ ڈاکٹر خلیق انجم اس کتاب کو سوانح عمری تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''پریم چند: گھر میں اپنی نوعیت کی ایسی سوانح عمری ہے جس کی اردو میں دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔ اس سوانح عمری میں ایک بے لوث اور وفادار بیوی نے اپنے اس شوہر کے حالات لکھے ہیں جس نے اپنی بیوی کو اتنا پیار دیا کہ وہ زندگی بھر اس کی گرویدہ رہی۔''[2]

گویا یہ کہ بقول خلیق انجم یہ ایک بے لوث اور وفادار بیوی کی تحریر کردہ سوانح عمری ہے۔ خلیق انجم یہ بھی لکھتے ہیں:

''اس سوانح عمری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شیورانی نے اپنے شوہر کے تمام حالات اور واقعات انتہائی ایمانداری اور سچائی سے پیش کیے ہیں۔''[3]

ایک بے لوث اور وفادار بیوی کا اپنے شوہر کے تمام حالات و واقعات کو انتہائی ایمانداری اور سچائی سے پیش کرنا کیا ممکن ہے؟ شیورانی دیوی پریم چند کی دوسری بیوی تھیں۔ پہلی بیوی سے علیحدگی کے بعد پریم چند نے شیورانی دیوی سے دوسری شادی کی تھی۔ شیورانی دیوی بیوہ اور معمولی پڑھی لکھی گھریلو خاتون تھیں جن کی پریم چند کے ساتھ رفاقت تقریباً تیس برس رہی۔ پریم چند کی صحبت سے انھیں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوا، وہ کہانیاں لکھنے لگیں اور انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جیل بھی گئیں۔ پریم چند کے افکار و نظریات کا ان پر گہرا اثر تھا۔ بعض اوقات پریم چند اپنی زندگی کے حالات دوسروں کو لکھواتے رہتے تھے، پریم چند کو ان کی زندگی میں ہی ''اپنیاس سمراٹ'' کہا جانے لگا تھا اور ان کی عظمت کے سبھی قائل تھے۔ پریم چند کو یہ احساس تھا کہ ان کے مرنے کے بعد یقینی طور پر ان کی سوانح عمری لکھی جائے گی۔ شاید اسی لیے وہ اپنی سوانح، شخصیت، سیرت اور زندگی کے مختلف واقعات دوسروں کو لکھواتے تھے۔ ممکن ہے یہ ساری تحریریں شیورانی دیوی کے پیشِ نظر ہوں اور انھوں نے اس کتاب کے لکھنے کا بیڑا اٹھایا اور اپنی سادہ اور دلنشیں اسلوب میں پریم چند کی سوانح عمری لکھ ڈالی۔ بھلے ہی اس کتاب کا نام ''پریم چند: گھر میں'' ہو لیکن شیورانی دیوی نے سوانح نگاری کا پورا خاکہ اور

اصول اپنے پیشِ نظر رکھا اور پریم چند کے بچپن، نوکری، سماجی و معاشرتی سرگرمیوں، سیاسی صورتحال، گھریلو مسائل، بیماری اور انتقال تک کے واقعات و حالات کو نہایت ہی مؤثر اور دلنشیں انداز میں لکھا ہے جس میں شیو رانی دیوی کے اپنے شدید جذبات بھی اُمڈ آئے ہیں۔

امرت رائے کے سامنے اپنی والدہ کی تحریر کردہ پریم چند کی سوانح عمری موجود تھی۔ جو پہلے ہندی میں لکھی گئی تھی جس کا بعد میں اردو ترجمہ ہوا۔ امرت رائے نے بھی اپنی مایہ ناز تصنیف ''پریم چند: قلم کا سپاہی'' (1962) پہلے ہندی میں لکھی جس کا ترجمہ بعد میں انگریزی اور اردو زبان میں بھی ہوا۔ امرت رائے کو اس کتاب پر 1963 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ شیو رانی دیوی، پریم چند کی سوانح لکھ چکی تھیں، اُس کے بعد امرت رائے کے ذہن میں وہ کون سی باتیں آئیں جن کی وجہ سے وہ اپنے والد پریم چند کی سوانح لکھنے کے لیے خود بھی آمادہ ہوئے۔ شاید کئی ایسے اہم اور بنیادی نکات تھے جو اَن چھوئے رہ گئے تھے اور پھر پریم چند کی شخصیت اتنی پہلو دار، ہمہ گیر اور وسیع النظری کا اعلیٰ نمونہ تھی جس پر ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی تھا۔ یوں بھی مغربی زبانوں میں اکابرین کی کئی کئی سوانح عمریاں لکھے جانے کا عام رواج ہے۔ شیو رانی دیوی نے پریم چند کے بارے میں چند بنیادی معلومات ضرور فراہم کیں لیکن پریم چند کے افکار و نظریات، سیاسی وسماجی وابستگی، ادبی قد و قامت کا اس طرح بیان نہیں کیا جو شاید امرت رائے کے ذہن میں تھا۔ میرے پیشِ نظر امرت رائے کی تصنیف ''پریم چند: قلم کا سپاہی'' کا وہ نسخہ موجود ہے جس کا اردو ترجمہ حکم چند نیر نے نہایت ہی سلیس و رواں زبان میں کیا ہے اور جو ساہتیہ اکادمی سے 1992 میں شائع ہوئی ہے اور یہ 815 صفحات پر مشتمل پہلا ایڈیشن ہے۔

میں نے جب اس کتاب ''پریم چند: قلم کا سپاہی'' کا مطالعہ کیا تو پہلا سوال یہ ذہن میں آیا کہ یہ کتاب پریم چند کی سوانح ہے یا اُن کی زندگی پر مشتمل ایک ناول ہے؟ یا پھر پریم چند اور ان کے عہد کی ادبی، سماجی، تہذیبی وفکری دستاویز ہے؟ جس کا جواب اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں خود امرت رائے نے دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ میری ہی چیز ہے، جو میں لکھ رہا ہوں کہ یہ بھی ایک ناول ہی ہے جس کا ہیرو پریم چند نام کا ایک آدمی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ آدمی میرے دماغ کی اُپج نہیں ہے، ہاڑ مانس کا ایک پتلا ہے جو اس دھرتی پر گھوم پھر چکا ہے اور وقت کی پگڈنڈی پر اپنے پیروں کے کچھ نشان چھوڑ گیا ہے۔''4

یہ میری ہی چیز ہے، جو میں لکھ رہا ہوں کہ یہ بھی ایک ناول ہی ہے جس کا ہیرو پریم چند نام کا ایک آدمی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ آدمی میرے دماغ کی اُپج نہیں ہے، ہاڑ مانس کا ایک پتلا ہے جو اس دھرتی پر گھوم پھر چکا ہے اور وقت کی پگڈنڈی پر اپنے پیروں کے کچھ نشان چھوڑ گیا ہے۔

اس اقتباس کے چند الفاظ توجہ طلب ہیں، مثلاً ناول، ہیرو، پتلا، پیروں کے نشان چھوڑ جانا وغیرہ۔ ایک عقیدت، احترام، عظمت، اعتراف سب کچھ موجود ہے۔ اور بھلا کیوں نہ ہو، وہ پریم چند جن کے معترف اُس عہد کے بیشتر ادیب تھے، جنھیں ان کی زندگی میں ''اُپنیاس سمراٹ'' تسلیم کیا گیا۔ جنھوں نے چودہ ناول، تقریباً تین سو کہانیاں، دو ڈرامے، تین سوانح عمریاں لکھیں، چھ کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا اور سینکڑوں صفحات میں ادب، سیاست، سماج، تاریخ اور مختلف موضوعات پر مضامین لکھے، ادارت کی ذمہ داری نبھائی اور رسائل و جرائد کے ادبی مباحث میں شامل رہے۔ جن کا اوڑھنا بچھونا ادب ہی تھا۔ انھیں ادب کا ایسا چسکا تھا، فکشن وصحافت سے ایسی دلچسپی تھی کہ انھیں اپنے شب و روز کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ وہ پریم چند جس نے اردو فکشن کو ایک نیا اسلوب دیا۔ وہ اسلوب اور زبان جسے ہم خالص ہندوستانی اسلوب بھی کہہ سکتے ہیں، جہاں تصنع، تکلف، مرصع و مسجع عبارت آرائی کا کوئی گزر نہیں۔ ہاں، اُن کے ابتدائی دو ناولوں ''اسرارِ معابد'' اور ''ہم خرما و ہم ثواب'' اس سے مستثنیٰ ہیں۔

امرت رائے کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر اس کام کو کسی اور نے کیا ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ مگر پریم چند کی اس سوانح کو لکھنے کے لیے پریم چند کے خطوط، مضامین، ڈائری، ناول، افسانوں اور دیگر تمام تحریروں سے استفادہ کرنا ہر کسی کے بس، ذوق اور دلچسپی کی بات نہیں۔ تقریباً پانچ برس کھپانے کے بعد یہ سوانح لکھی جا سکی، جسے ہم ایک ادبی شاہکار بھی کہہ سکتے ہیں۔

امرت رائے یہ بھی لکھتے ہیں:

''سچ تو یہ ہے کہ اس کام کو ہاتھ میں لیتے ہی یہی چیز میرے لیے پہلا چیلنج بنی۔ یہ چیز کیا ہے؟ اس کا پتہ لگاؤ، جس سے یہ ازحد عمومی زندگی ایک خاص شخص کی زندگی بنتی ہے۔ یہاں کوئی چمک دمک نہیں، نہ کوئی ڈرامائی عنصر، نہ کوئی دلچسپ واقعہ زندگی، نہ کوئی عشق اور حوصلے کی ایسی کوئی داستان — بالکل بندھی ٹکی زندگی، ایک غریب اسکول ماسٹر کی، یا ویسے ہی غریب فن کار کی، مدیر کی۔ پھر بھی کچھ تو ہے، جو خاص ہے، وہ کیا ہے؟ اسی کو زندگی کے سلسلے میں دیکھ سکنے اور دکھا سکنے میں مجھے تخلیق کار کی سچی مسرت ملی ہے۔''5

امرت رائے کے اسلوب میں بھی پریم چند کے اسلوب کی جھلک ملتی ہے، چھوٹے چھوٹے جملے، بے ریائی کے ساتھ دل کی باتیں کہہ جانا۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ بزرگوں، رشی منیوں اور گاندھی جی کی زندگی بھی سادگی، بے ریائی، خدمتِ خلق اور مشکلات میں گھرے رہنے کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مگر امرت رائے پریم چند کو اپنی خاص نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ پریم چند کے ساتھ انھیں پل پل گزارنے محسوس کرنے کا بھرپور موقع ملا ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کا آغاز کیسے کیا جائے، تمام مواد کو کیسے پیش کیا جائے، اسے دلچسپ اور بے مثال کیسے بنایا جائے، امرت رائے کافی ادھیڑ بن میں رہے اور بالآخر انھیں ایک نکتہ مل ہی گیا:

''اچانک یہ گُر میرے ہاتھ لگا کہ اِس انسان کی زندگی کو اُس کے ملک اور سماج کی زندگی سے جوڑ کر دیکھو، تب گویا سارے بند دروازے یکا یک کھل گئے اور اس بے حد سیدھی سادی زندگی کو ایک نئے معنی، ایک نیا مفہوم مل گیا، اُسی کو دکھانے کا جتن میں نے کیا ہے۔''6

ملک اور سماج کی زندگی سے پریم چند کو جوڑ کر دیکھنے کے امرت رائے کے اِس عمل نے کتاب کو کافی بوجھل بنا دیا ہے۔ شاید جس کا اندازہ امرت رائے کو نہ ہو۔ کتاب پڑھتے وقت اکثر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب پریم چند کی سوانح ہے یا ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخی دستاویز۔ کتاب کا ایک بڑا حصہ مہاتما گاندھی، گوکھلے، تلک، جواہر لال نہرو، مختلف آزادی کے واقعات، جلیاں والا باغ حادثہ وغیرہ کے بیانات سے اٹا پڑا ہے۔ اس موقع پر مجھے معاً خواجہ احمد عباس کے ناول ''انقلاب'' اور حیات اللہ انصاری کے ناول ''لہو کے پھول'' کی یاد آئی۔

امرت رائے نے پریم چند کی سوانح لکھنے کا ارادہ ضرور کیا مگر ان کے سامنے مختلف ناولوں کے نمونے بھی تھے۔ اس کتاب کو ہم سوانحی ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب ناول لکھا ہوتا ہے تو ناول نگار خود کو کسی حد میں قید کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اس سوانح کا کینوس بھی بڑا ہوتا گیا اور ایک بکھراؤ سی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

امرت رائے کتاب کا آغاز ایک خاص مشن کے ساتھ بڑے سلیقے سے کرتے ہیں یعنی یہ کہ پریم چند کو ہیرو، بہتر و برتر ثابت کرنا، جو کام حالی نے ''حیاتِ جاوید'' لکھتے وقت سرسید کے ساتھ کیا تھا۔ عظیم سے عظیم تر بنانا۔ ان کے افکار و نظریات کو غیر معمولی اور بالکل درست قرار دینا۔ بہر حال اپنے والد کی سوانح لکھتے وقت اگر امرت رائے نے ایسا کیا تو کچھ غلط بھی نہیں کیا مگر ایک خاص بات جو امرت رائے کے یہاں ہے وہ یہ کہ انھیں کسی بھی خوبی اور حسن کے بیان کا سلیقہ خوب سے خوب تر آتا ہے۔ مثلاً وہ اس سوانح کا آغاز تین واقعات 'جنوبی ہند کے دوست چندر ہاسنی کا پریم چند سے ملنے کاشی آنا'، 'بستی کے تاراشنکر ناشاد کا پریم چند سے ملنے لکھنؤ آنا' اور 'پریم چند کا پٹنہ ایک ادبی جلسے میں شرکت کی غرض سے سفر کرنا' ہے۔ ان تینوں واقعات میں پریم چند کی حد درجہ سادگی، شرافت، نیکی اور خلوص، کو نہایت ہی سلیقے سے پیش کیا گیا ہے، وہ اس لیے بھی کہ کتاب کے آغاز، پہلے صفحے سے ہی قاری پر یہ تاثر قائم ہو جائے کہ پریم چند کس قدر نیک اور شریف النفس انسان تھے۔

امرت رائے نے پریم چند کے افکار و نظریات خواہ وہ سیاست کے تعلق سے ہوں، سماج کے تعلق سے یا ادب کے تعلق سے، ان سب کی حفاظت و وکالت بڑی شد و مد سے کرتے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں پیش کی

امرت رائے نے پریم چند کی سوانح لکھنے کا ارادہ ضرور کیا مگر ان کے سامنے مختلف ناولوں کے نمونے بھی تھے۔ اس کتاب کو ہم سوانحی ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب ناول لکھنا ہوتا ہے تو ناول نگار خود کو کسی حد میں قید کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اس سوانح کا کینوس بھی بڑا ہوتا گیا اور ایک بکھراؤ سی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جا سکتی ہیں۔ میں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ پریم چند کے نظریے کو امرت رائے اس خط کے ذریعے پیش کرتے ہیں جو دیا نرائن نگم، مدیر 'زمانہ'، کانپور کو پریم چند نے آتش اور لکھنؤ کی شاعری کے تعلق سے لکھا تھا۔ خط کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:۔

''رسالہ زمانہ کا ماہِ نومبر کا پرچہ دیکھ کر چند خیالات پیدا ہوئے جنھیں عرض کر دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ جناب کو ناگوار نہ ہوگا۔ اس زمانے میں جب کہ گونا گوں اخلاقی' سیاسی' معاشرتی اور اقتصادی ہماری تمام تر توجہ کے مستحق ہیں' مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ رسالہ 'زمانہ' کا قریب قریب ایک پورا نمبر محض آتش کے کلام کے تبصرے کی نذر ہو گیا۔ میں آتش کی استادی کا قائل ہوں۔ لکھنوی شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلتاً کم ہے۔ مگر پھر بھی اتنا زیادہ ہے کہ باستثنا ان حضرات کے جو لکھنوی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور سبھی طبائع کو موجودہ معیار اور ذوقِ صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔

لٹریچر کا موضوع ہے تہذیب، اخلاق، مشاہدۂ جذبات، انکشافِ حقائق اور واردات و کیفیاتِ قلب کا اظہار۔ جو شاعری حسن و عشق و آئنہ و شانہ، خنجر و محشر، بشرہ و خط، دہن و کمر کے تخیل سے ملوث کرتی ہے، وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آج ہم اُس کا وِرد کریں جن کی افتادِ طبیعت اس رنگ کی ہے، انھیں اختیار ہے آتش یا ناسخ، رند اور امانت کا وظیفہ پڑھیں، لیکن زمانہ کے مختلف الطبع ناظرین کو اس ورد اور وظیفے میں شریک ہونے کے لیے مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے؟''7

ادب اور سماج کے تعلق سے پریم چند کا جو نظریہ تھا اسے وہ سب پر مقدم تسلیم کرتے ہیں۔ امرت رائے کے یہاں بھی ان ہی نظریات و جذبات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

امرت رائے نے اپنی اس کتاب میں پریم چند کو حد درجہ وطن دوست اور محبِ قوم ثابت کرنے کی نہایت خوبصورتی کے ساتھ کوشش کی ہے۔ پریم چند بلا شبہ حب الوطنی سے سرشار ادیب تھے جنھوں نے گاندھی جی کے نظریات و فلسفوں کو اپنے فکشن اور مضامین کے ذریعے عام کرنے کی کوشش کی۔ کسی بھی علم دوست کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ ملک کی آزادی کے لیے پریم چند کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ امرت رائے لکھتے ہیں:

''منشی جی نے 1907 میں اپنی پہلی کہانی لکھی، بالکل پہلی، 'دنیا کا سب سے انمول رتن' کیا ہے دنیا کا سب سے انمول رتن؟ ایک پھانسی پانے والے کے باپ کے دو آنسو؟ نہیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ چتا پرستی ہو جانے والی عورت کی راکھ؟ نہیں۔ خون کی وہ آخری بوند جو ملک کی آزادی کے لیے گرے، وہی دنیا کا سب سے انمول رتن ہے۔''8

پریم چند کی وطن دوستی اور گاندھی جی سے عقیدت کا ذکر پوری کتاب میں کہیں براہِ راست تو کہیں رمز و کنائے میں موجود ہے۔

پریم چند اور ان کی بیوی شیورانی دیوی کی وطن دوستی لائق ستائش اور بے مثال ہے۔ امرت رائے نے جس حسنِ بیان کے ساتھ اسے پیش کیا ہے وہ ان کی باکمال ہنرمندی ہے۔

امرت رائے نے اس کتاب میں نہایت ترتیب و تسلسل سے پریم چند کے خاندان، پیدائش، بچپن، تعلیم، نوکری، احباب، اولاد، بیگم اور ان کے تمام ناولوں کا ذکر کیا ہے، بیوہ کی شادی، معرکہ سرشار و شرر میں ان کی شرکت، ہندو مسلم اتحاد، ہندی و اردو زبان کے مسائل اور تنازعے، رسالہ ہنس، جاگرن، سرسوتی پریس، ذات پات، مذہبی منافرت، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہندوستانی سبھا کا قیام، بمبئی کا سفر اور وہاں کی فلم کمپنی سے رشتہ، بنارسی داس چترویدی، جینندر کمار اور دیگر ادیبوں سے مراسم وغیرہ کے تعلق سے امرت رائے نے پریم چند کے اعلیٰ و پاکیزہ خیالات اور عملی کوششوں کا ذکر مفصل کیا ہے۔

بلا شبہ امرت رائے کی پیشِ نظر تصنیف ''پریم چند: قلم کا سپاہی'' ایک شاہکار، غیر معمولی نوعیت کی کتاب ہے جس میں تحقیق، تنقید، تخلیق، تاریخ، تہذیب سب کی گھلاوٹ ہے۔ جس دقتِ نظر اور لگن و جستجو کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ امرت رائے نے اپنے والد پریم چند کی سوانح لکھی ہے، یہ درست ہے۔ مگر کتنے ادیب ایسے ہیں جنھیں امرت رائے جیسا بیٹا نصیب ہوا۔ پریم چند اس معاملے میں بھی خوش نصیب تھے کہ انھیں شیورانی دیوی جیسی بیوی اور امرت رائے جیسا بیٹا ملا۔ یہ مقدر کس ادیب کا رہا ہے کہ بیوی اور بیٹے دونوں نے سوانح لکھ کر اپنے شوہر اور والد کی خدمات کو امر بنانے کی کوشش و کاوش کی ہو۔

اس پوری کتاب میں امرت رائے کی تخلیقیت کی جھلک موجود ہے جس کی وجہ سے بھی یہ کتاب بیش قیمت ثابت ہوئی۔ کتاب کے پہلے صفحے کا میں نے ذکر کیا تھا کہ تین واقعات کو پیش کر کے ابتدا میں ہی امرت رائے، پریم چند کی شرافت و حلاوت، خلوص و صداقت کو پیش کرتے ہیں۔ اب اس کے آخری صفحے کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں جب پریم چند کا انتقال ہو جاتا ہے۔

''ارتھی بنی، گیارہ بجتے بجتے بیس پچیس لوگ کسی گم نام آدمی کی لاش لے کر منی کرنی کا (شمشان گھاٹ) کی طرف پہنچے۔

راستے میں ایک راہ گیر نے دوسرے سے پوچھا؛

کے رہل (کون تھا)؟

دوسرے نے جواب دیا، کوئی ماسٹر تھا۔

اُدھر بول پور میں رابندر ناتھ نے آہستہ سے کہا؛

ایک رتن (ہیرا) ملا تھا تم کو، تم نے کھو دیا۔''11

کتاب کا اس قدر جذباتی اور بامعنی اختتام قابلِ رشک ہے۔ یادگار اور نادر تصانیف پر بحث کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ ذکر اُن کتابوں کی عظمت کی دلیل ہے۔ ''پریم چند: قلم کا سپاہی'' ان ہی بیش قیمت تصانیف میں سے ایک ہے۔ شاید اسی لیے اس کی اشاعت کے ساٹھ سے زیادہ برس گزر جانے کے بعد بھی پریم چند شناسی کے تعلق سے اس کتاب کی حیثیت بنیادی ہے اور اس کتاب کے مطالعے کے بغیر پریم چند کو پورا سمجھنا مشکل بھی ہے۔

کتاب کا اس قدر جذباتی اور بامعنی اختتام قابلِ رشک ہے۔ یادگار اور نادر تصانیف پر بحث کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ ذکر اُن کتابوں کی عظمت کی دلیل ہے۔ ''پریم چند: قلم کا سپاہی'' ان ہی بیش قیمت تصانیف میں سے ایک ہے۔ شاید اسی لیے اس کی اشاعت کے ساٹھ سے زیادہ برس گزر جانے کے بعد بھی پریم چند شناسی کے تعلق سے اس کتاب کی حیثیت بنیادی ہے اور اس کتاب کے مطالعے کے بغیر پریم چند کو پورا سمجھنا مشکل بھی ہے۔

حواشی

1۔ پریم چند گھر میں، شیورانی دیوی، مترجم سید حسن منظر، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی 2007، ص21
2۔ ایضاً، ص21
3۔ ایضاً، ص17
4۔ پریم چند: قلم کا سپاہی از امرت رائے، مترجم حکم چند نیر، مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، پہلا ایڈیشن 1992، ص8
5۔ ایضاً، ص9-8
6۔ ایضاً، ص9
7۔ ایضاً، ص79
8۔ ایضاً، ص121
9۔ ایضاً، ص815

Prof. Shahzad Anjum
Deptt. of Urdu, Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob: 8800863994
Email: shahzadanjum825@gmail.com

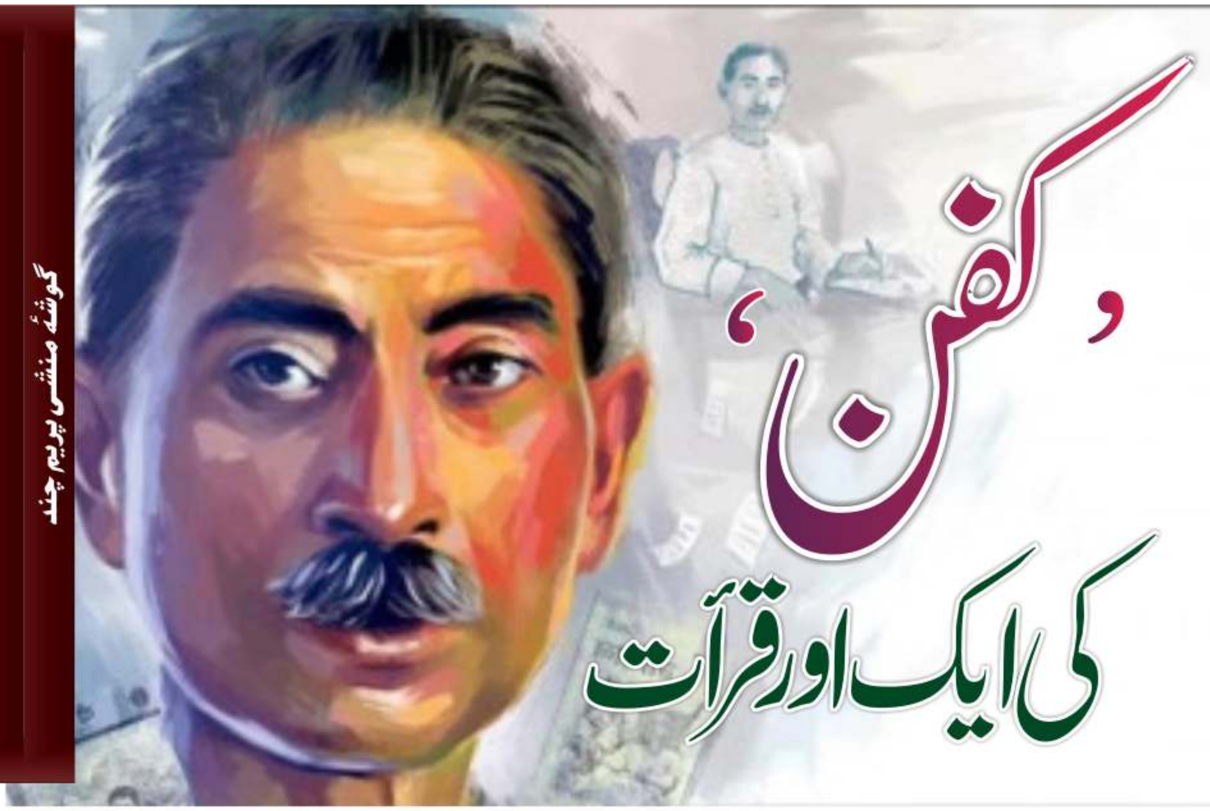

کفن کی ایک اور قرأت

ارشاد نیازی

پریم چند نے دلت مسائل پر اس وقت لکھنا شروع کیا، جب دلت مسائل جیسی کوئی چیز سماج میں موجود نہیں تھی۔ اردو کیا اور ہندی کیا؟ یہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک کا قصہ تھا۔ آج جب ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں، تو اس صدی کے اہم موضوعات میں سے ایک موضوع دلت بھی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ پریم چند کی کہانیوں میں دلت زندگی سے متعلق کئی طرح کی کہانیاں ہیں۔ ان میں سے ایک وہ، جن میں دلت مسائل کو راست طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ دوسری وہ ہیں، جن میں دلت کرداروں میں دلت زندگی زندہ ہے۔ کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں، جن میں اہم کردار دوسرے ہیں لیکن ایک دو دلت کردار بھی موجود ہیں۔ ایسی کہانیاں دلت زندگی سے متعلق کہانیاں تو کہی جا سکتی ہیں لیکن دلت مسائل یا سوال سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ ایسے میں کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کی تخلیقات میں دلت کردار اور زندگی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے ہیں۔

اس وقت میرے سامنے پریم چند کی لافانی کہانی 'کفن' ہے، جو دس صفحات پر مشتمل ہے (پریم چند کے نمائندہ افسانے۔قمر رئیس) گذشتہ 90 سال سے اس کہانی پر کافی لکھا گیا ہے، لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ ہر نسل کے لیے یہ کہانی چیلنج بن کر ابھرتی ہے، سوال قائم کرتی ہے اور ذہن کو جھنجھوڑتی ہے۔ کہانی بے شک لافانی، بے مثال اور ممتاز ہے مگر کیوں ہے؟ اسے مزید سمجھنا باقی ہے۔ 'کفن' کے سلسلے میں یہ بات آسانی سے کہہ دی جاتی ہے کہ یہ حقیقت کی بے رحم تصویر ہے۔ بات بھی سچی ہے۔ اس لیے کہ قارئین اور ناقدین کا یہی فیصلہ ہے۔ لیکن کہانی میں ترسیلِ الفاظ کے ساتھ ساتھ بافت و بنت اور اضمحلال کی مضبوط ساخت ہے، نیز احساسِ بے گانگی کے ضمن میں عمل کی جو الگ الگ مثالیں دی گئی ہیں۔ انھیں سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ وہ اس لیے کہ انھیں میں کہانی کی عظمت کے نشانات قائم ہیں۔ لیکن ٹھہریے اور سوچیے کہ کہاں پریم چند کی واشگاف حقیقت نگاری کا کھلا اظہار اور کہاں بے گانگی کا احساس اور ملفوف بیان۔ بہرکیف! پہلے ہم احساسِ بے گانگی Alienation کے تصور کو سمجھیں، پھر دیکھیں کہ پریم چند کے ذریعے اس کہانی میں احساس بے گانگی کی تصویر فلسفیانہ اساس اور عمرانیاتی نظریوں سے کم تو نہیں ہے۔

Alienation لاطینی لفظ Alienus سے بنا ہے بمعنی متعلق بہ دیگر سے مشتق، لغوی سطح پر اس کے مطالب برگشتگی، بے گانگی، اجنبیت، منتقلی، ملکیت، روگردانی، انحراف اور علیحدگی وغیرہ کے لیے مختص ہیں۔"

(ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، عتیق اللہ۔ ج۔ اول، ص 114)

Alienation یا احساسِ بے گانگی کے بنیاد گزار ہیگل ہیں۔ ہیگل نے اپنی کتاب فینومینولوجی آف مائنڈ (1807) میں انسان اور سماجی نظام کے تعلق کا جائزہ لیا اور پایا کہ سماجی نظام حاشیے پر جی رہے لوگوں کو ایک ایسی حالت میں ڈال دیتا ہے، جس میں معاشرے کی اخلاقی قدروں سے ان کا یقین اٹھ جاتا ہے۔ نتیجتاً لاشعوری طور پر وہ انسانی سماج سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے۔ ہیگل کے لفظوں میں تاریخ کے دھارے میں چھوٹنے اور پیچھے رہ جانے کی بے بسی کا علم احساسِ بے گانگی ہے۔

ہیگل کے بعد مارکس نے "اکنامک اینڈ فلاسفیکل مینواسکرپٹ" 1844 میں سرمایہ دارانہ نظام میں احساسِ بے گانگی کی تشریح و تعبیر پیش کی ہے۔ مارکس احساس بے گانگی کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ روزگار کے لیے نکلا مشقت کرنے والا محنتی انسان جب محسوس کرتا ہے کہ وہ سماجی کورم نہ ہو کر استحصال کا آلہ ہے تو اس کی عزتِ نفس کو چوٹ پہنچتی ہے۔ تب وہ طے کر لیتا ہے کہ اسے روزی روٹی دینے والے اسی کے جیسے اور دوسری طرح سے سارا کا سارا پیداواری نظام اس سے بالکل مختلف ہے۔ محنت کش انسان ایسے میں اپنے آپ سے اپنے مزدور ہونے سے اور وراثت میں ملی قدروں سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ بقول قمر رئیس:

دنیا میں جس قدر ظلم، تشدد، ناانصافی ہے، جس قدر عناد، حسد اور کمینگی ہے جتنی جہالت اور لاعلمی ہے۔ اس کا اصل راز یہی زہر ہے، جس کا نام ملکیت ہے، جب تک ملکیت پر شخصی قبضہ رہے گا اس وقت تک انسانی سماج کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ (پریم چند فکر و فن۔53)

ہیگل اور مارکس کی تشریحات نے کئی دانشوروں کو متاثر کیا۔ نظریے الگ تھے مگر 'وجود و عدم' کا سوال سب کو چُبھتا رہا۔ "بینگ اینڈ تھنگنیس" 1923 میں سارتر

نے یہ بتایا کہ احساس بے گانگی دراصل نفسیاتی وسعتوں کی تحقیق ہے۔ دوسرے یہ کہ نظامِ انسانی، شعور اور قوت ارادی کو اس حد تک کچلنے میں کامیاب ہوتا ہے، جیسے وہ ثابت کرنا چاہتا ہو کہ انسان تاریخ کا بے زبان قاری ہونے کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ تیسرے یہ کہ ''محنت اور جسم سے انسانی رشتوں کا وہ تانا بانا بنا جاتا ہے، جس میں نہ جسم، نہ محنت اور نہ پھل اپنا ہوتا ہے۔ ادب میں پیش کیے ہوئے تصورات اور فلسفے بیشتر صورتوں میں دلچسپ، بامعنی اور برمحل ہوتے ہیں۔ تاریخی اسناد کے بارے میں اینگلس کے بلزاک متعلقہ ہیجان جگ ظاہر ہیں۔ سارتر کے ناولوں میں احساسِ بے گانگی کی جو نفسیاتی روشنی ہے وہ ان کی کتابوں میں کہاں ہے؟ انھیں دلچسپ سوالوں کے درمیان یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ 'کفن' کہانی میں ایسا کیا ہے۔ جو ہر نسل کے مطالعات کو چیلنج ملتا ہے۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لیے عہدِ پریم چند کے ہندوستانی دیہات کو سمجھنا ہوگا۔ اس وقت کے ہندوستانی سماج بالخصوص دیہات کو سمجھنے کے بعد دلتوں کے خاندان میں رہنے والے لوگوں کے احساسِ بے گانگی کے ساتھ کہانی میں اظہار کو جاننا ضروری ہے۔ زمانہ پریم چند میں دوطرح کی غلامی رائج تھی۔ ایک غلامی تو یہ تھی کہ سارا ہندوستان انگریزی حکومت کا غلام تھا۔ دوسری غلامی یہ تھی کہ عورتیں اور دلت انگریزی حکومت کی غلامی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج میں موجود استحصالی نظام کے بھی غلام تھے، جس کا سلسلہ آج تک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ پریم چند نے دونوں طرح کی غلامی کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا دلت مسائل سے متعلق پریم چند کی کہانی ''دونوں طرف'' سے اس کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ یہ کہانی 1911 میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن زندگی کے آخری حصے میں پریم چند نے نچلے طبقے اور پچھڑی ذاتوں کی طرف زیادہ دھیان دینا شروع کردیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ وہی زمانہ ہے، جب گاندھی جی اچھوتوں کی حالت سدھارنے کے لیے تحریک چلا رہے تھے اور باباصاحب امبیڈکر ہندوستانی سیاست میں فعال ہو چکے تھے۔ ایسے میں انسان دوست پریم چند دلتوں اور عورتوں کے مسائل سے آنکھ موند کر کیسے بیٹھ سکتے تھے؟ پریم چند جانتے تھے کہ دلتوں کی معاشی بدحالی کی بنیادی وجہ سماج کا استحصالی نظام اور وہ پابندیاں ہیں، جس نے ان کی حالت کو بد سے بدتر کردیا ہے۔ دلت مسائل سے متعلق پریم چند کی بعض کہانیاں اس طرح ہیں۔ ''صرف ایک آواز''، ''سوا سیر گیہوں''، ''غریب کی ہائے''، ''مندر''، ''ٹھاکر کا کنواں''، ''جرمانہ''، ''دودھ کی قیمت'' وغیرہ۔

> Alienation یا احساسِ بے گانگی کے بنیاد گزار ہیگل ہیں۔ ہیگل نے اپنی کتاب فینومینولوجی آف مائنڈ (1807) میں انسان اور سماجی نظام کے تعلق کا جائزہ لیا اور پایا کہ سماجی نظام حاشیے پر جی رہے لوگوں کو ایک ایسی حالت میں ڈال دیتا ہے، جس میں معاشرے کی اخلاقی قدروں سے ان کا یقین اٹھ جاتا ہے۔ نتیجتاً لاشعوری طور پر وہ انسانی سماج سے اپنا رشتہ منقطع کرلیتا ہے۔ ہیگل کے لفظوں میں تاریخ کے دھارے میں چھوٹنے اور پیچھے رہ جانے کی بے بسی کا علم احساسِ بے گانگی ہے۔

یہ سچ ہے کہ افسانہ ہونے کے باعث 'کفن' کا کینوس چھوٹا ہے مگر دانشورانہ اظہار کے رنگ تیز ہیں، جس کے درون میں 70 فیصد ہندوستان کی زندگی سانس لیتی ہے۔ فکری تصویریں ملاحظہ ہوں۔

1۔ دلتوں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔

2۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے۔

3۔ سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے۔

4۔ اب کوئی کیا کھلائے گا...... اب تو سب کو کھایت سوجھتی ہے...... پوچھو، گریبوں کا مال، بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے۔ مگر بٹور نے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ کھایت سوجھتی ہے۔

5۔ ہم تو کہیں گے کہ گھیسو کسانوں کے مقابلے میں باریک بیں تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہوگیا تھا۔ اسے یہ تسکین تو تھی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی۔

6۔ چڑیل کا پھساد ہوگا اور کیا؟ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔

7۔ باپ بیٹے روتے ہوئے۔ گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی مرتبہ انھیں اپنے ہاتھوں سے پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت میں۔ وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں...... پوچھا...... کیا ہے بے گھیسوا! روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے۔ اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے...... زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے۔

8۔ جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیے، تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرات کیوں کر ہوتی؟

9۔ گاؤں کی رقیق القلب عورتیں آ آ کر لاش دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

10۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے دنیا کے مکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔

مندرجہ بالا اقتباسات پریم چند کے مفکرانہ اظہار کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ اس معنی میں 'کفن' پریم چند کے دور (1880-1936) کے کسی ہندوستانی دیہات کی کہانی مانی جاسکتی ہے، مگر ہے وہ زندگی کی حقیقتوں کا ہی عکس۔ اس عکس میں استحصال کے مختلف تانے بانے نظر آتے ہیں۔ کہانی کی ساخت میں ماحول اور نظام کا اندازہ ان عبارات سے ظاہر ہوتا ہے، 'احساسِ بے گانگی' کے سیاق وسباق کی شکل میں۔

پہلا اقتباس اشارہ کرتا ہے کہ دلت گاؤں میں رہتے ہیں لیکن گاؤں کے حاشیے پر چھوت چھات کی وجہ سے انھیں الگ کنبہ میں رہنے پر مجبور تو کردیا گیا، مگر گاؤں کی حدِ اختیار میں ہی رکھا گیا ہے۔ ساتویں اقتباس

میں وعدہ کے مطابق کام پر نہ آنے کے لیے، مار اور گالیاں کھانے کا بیان ہے۔ متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کئی بار گھیسو، مادھو زمیندار کے ہاتھوں سے پٹ چکے ہیں، اسی اقتباس میں زمیندار کہیں دکھائی نہ دینے کی وجہ سے (یعنی بیگار نہ کرنے کے لیے) گاؤں سے نکالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اس اقتباس میں آگے پریم چند کہتے ہیں کہ 'صاحب' اتنا استحصال تو اس سماجی نظام میں عام بات تھی۔

دوسرا اقتباس گاؤں کے معاشی نظام کو پیش کرتا ہے۔ گاؤں کسانوں کا تھا۔ گھیسو، مادھو جیسے بے زمین مزدور عوام تھے، صرف زمینداروں کے نہیں، ان سب کے جو بھوکوں کے کام آسکتے تھے اور گاؤں جن کا تھا۔

> 'احساسِ بے گانگی' کی تشریح و تعبیر میں فلسفیوں اور ادیبوں میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔ دونوں حقیقت کی تحقیق اور جستجو کرتے ہیں۔ مگر ادب میں پیش کردہ ماحول سے اخلاق و اطوار کے امتیاز کی تشریح زیادہ ہوتی ہے۔ ادیب کی تشریح کی سب سے نچلی سطح تو فلسفیانہ ہوتی ہے مگر سب سے نچلی سطح کے اوپر بتدریج عمرانیات اور نفسیات ہوتی ہیں۔ انسانی رشتوں کا شارح ادیب، علم و دانائی کی سطح پر باطن شناس اور اظہار کی سطح پر حسن کا جویاہوتاہے۔ 'کفن' افسانے میں حسن کی تحقیق اور خیر کے معاملات انسانی آزادی سے متعلق ہیں۔

تیسرے اقتباس میں نظام کا پراڈ سامنے آتا ہے۔ کسانوں سے اچھی حالت ان کی تھی جو کسانوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانا جانتے تھے۔ وہ حالات کے تھپیڑے سے بے حال کسانوں سے کہیں زیادہ کامیاب اور آسودہ تھے۔ یہاں دورِ پریم چند کے ہندوستانی دیہاتوں میں حالتِ زراعت پر بھی اشارہ ہے۔ جسے معاشی تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں میں ہندوستان میں فی آدمی فصل اور غلہ دونوں لگاتار کرتے گئے۔ 1929 کی معاشی دقت نے اور بھی کمر توڑ دی تھی۔ 'کفن' جب شائع ہوا تھا تب ملک کی تقریباً 70 فیصد زمین، زمینداروں کے ہاتھ میں تھی۔ سماجی تعلقات تناؤ میں تھے۔ کھیتی میں سرمایہ لگ نہیں رہا تھا، محنت کا استحصال کر کے کام چلایا جا رہا تھا۔ 'بٹائی'، 'سود خوری'، 'ڈاکہ' اور مہاجنی تمدن کا بول بالا تھا۔ چوتھے اقتباس میں معاشی تکلیف سے خوفزدہ متغیر رجحان کی تفصیل ہے تو دسویں اقتباس میں قرضداری کا بیان ہے۔

پانچویں، چھٹے اور آٹھویں اقتباسات میں ہیجمینی (Hegemony) کی تفصیل ہے۔ چھٹا، اوجھا کی طاقت کا احساس دلاتا ہے اور آٹھواں، قابل تقلید مہاجنی ہمدردی کا ہے۔ نواں اقتباس اس نظام میں خواتین کی 'ایمپیتھی' کا خفیف اشارہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ عورتیں ایک دوسرے کے درد و غم سے کیسے جڑتی ہیں۔ تھوڑے وقت کے لیے ہی سہی بدھیا کی لاش پر آنسو بہانے والی صرف عورتیں تھیں۔ جن دو مردوں کے لیے اس نے جان دی، انتھک محنت کی، وہ تو اس کے مرنے کے بعد دوسری دنیا میں تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہلکے ہلکے برش سے (دس پندرہ جملوں میں) 'کفن' میں ہندوستان، دیہات، عام۔ عوام، نظام کے ساتھ کہانی کے سماجی منظر اور پس منظر کو پینٹ کیا گیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح یہ پس منظر 'احساسِ بے گانگی' کے احساس کو ابھارتا ہے۔

'احساسِ بے گانگی' کی تشریح و تعبیر میں فلسفیوں اور ادیبوں میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔ دونوں حقیقت کی تحقیق اور جستجو کرتے ہیں۔ مگر ادب میں پیش کردہ ماحول سے اخلاق و اطوار کے امتیاز کی تشریح زیادہ ہوتی ہے۔ ادیب کی تشریح کی سب سے نچلی سطح تو فلسفیانہ ہوتی ہے مگر سب سے نچلی سطح کے اوپر بتدریج عمرانیات اور نفسیات ہوتی ہیں۔ انسانی رشتوں کا شارح ادیب، علم و دانائی کی سطح پر باطن شناس اور اظہار کی سطح پر حسن کا جویا ہوتا ہے۔ 'کفن' افسانے میں حسن کی تحقیق اور خیر کے معاملات انسانی آزادی سے متعلق ہیں۔ اخلاقی امتیاز کی تشریح کے ذریعے 'گھیسو'، 'مادھو' اور 'بدھیا' ایک طرح کے گھریلو ماحول میں رہتے ہوئے بھی اخلاق و اطوار کا الگ کورم ہیں۔ انسانی آزادی کی ادبی تحقیق کو ہم سارتر کے قول سے سمجھ سکتے ہیں کہ سارا نظام جہاں انسان کو کچلنے اور ناپید کرنے میں لگا ہو، وہاں عالمی سچائی کی شکست تو اس کا مقدر ہے، مگر ہار کے اس مخالف دھارے میں جو الگ الگ لوگ جدوجہد کر رہے ہیں، ان کے اخلاق و اطوار، ادب کی حقیقت ہیں۔ اس معنی میں 'کفن' احساس بے گانگی کے امتیازات کی تشریح ہے، جس میں ایک طرف گھیسو، مادھو ہیں، تو دوسری طرف انھیں کی طرح ناکام لیکن فرض شناس بدھیا جو سیسی فس کی طرح عمر بھر برعکس دھارے میں ہر قدم پر جدوجہد کرتی رہی ہے۔

'جدوجہد' اور ہجرت 'احساسِ بے گانگی' کی الگ الگ داخلی اور ہر قدم پر 'قسمت' کی نفی کرتی ہوئی، باطنی کیفیات ہیں۔ مگر احساسِ کم مائیگی کی منفی سوچ گھیسو، مادھو اور بدھیا کو جوڑتی ہے اور غیر واضح ہو کر بھی مضبوطی سے قارئین پر چوٹ کرتی ہے۔ 'دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرنے والی' شوہر کے خاندان میں رشتوں کے نظام کی بنیاد ڈالنے والی اور کسی کو اپنا دکھ نہ سنانے والی، محنت کش بدھیا کا خاوند اس کے آخری وقت میں جن داخلی کیفیات سے گزرتا ہے وہ جگ ظاہر ہے۔ 'وہی عورت آج زچگی کی تکلیف سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اس انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں، ہوا بھی یہی۔ آلو کھا کر پانی پینے کے بعد وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے جیسے دو بڑے اژدھے کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔'' ''کفن'' افسانے میں بدھیا کے شوہر مادھو کے برتاؤ اور دلی تاثرات کو سمجھنا سب سے ضروری ہے۔ افسانے میں اس کے دلی تاثرات کو باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ دلی تاثرات کی تشریح باپ، بیٹے کے مکالمے سے ہوتی ہے۔ دونوں نکمے، مطلبی، اور ناکارہ ہیں۔ بدھیا سے دونوں کو کوئی لگاؤ نہیں ہے، جس کا اظہار افسانے کے مکالمے سے ہوتا ہے۔ دو ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

1۔ گھیسو نے کہا ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔'' مادھو دردناک لہجے میں بولا۔ ''مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں؟''

''تو بڑا بے درد ہے بے۔'' سال بھر جس کے ساتھ جندگی کا سکھ بھوگا، اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی۔ ''مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔''

2۔ مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا۔ ''مجھے

وہاں ڈر لگتا ہے۔''
''ڈر کس بات کا، میں تو یہاں ہوں ہی۔''
''تو تمہیں جا کر دیکھو نا؟''

پریم چند نے یہاں مفاد پرست زندگی کی بے رحمی کے ضمن میں اس بھوک کی تصویر کشی کی ہے، جس کی تڑپ میں انسان مفاد کی بے رحم سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ وہ سطح ہے جہاں پہنچ کر خون کے رشتے بھی جھلس جاتے ہیں۔ کفن کے سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ گھیسو اور مادھو جن حالات کی وجہ سے دردِ زہ میں مبتلا بدھیا کو نظر انداز کر کے آلو کھانے میں مگن ہیں، اس میں کسی بھی ذات برادری کا آدمی ہوتا تو وہی کرتا جو ان دونوں نے کیا۔ دوسری بات یہ کہ گھیسو اور مادھو دلت کردار کی شکل میں ہی کفن کے پیسے کو کھا پی کر سماج کے ٹھیکیداروں کی ٹھیکہ داری پر قبضہ کرتے ہیں، یہ قبضہ ایک ساتھ دھرم کے ٹھیکے دار برہمنوں، دولتمند ساہوکاروں اور زمینداروں بلکہ سارے سماج کے استحصالی نظام کو چیلنج ہے۔ ایسا کر کے دونوں عوام، سماج اور مذہب سب کی اوقات بتاتے ہیں۔ یعنی انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔ نظر انداز کرنے کا یہ عمل دراصل بغاوت کا ہی روپ ہے۔ ایسا اور اس طرح سے صرف دلت کردار ہی کر سکتا تھا کیونکہ ہندوستانی سماج میں سب سے زیادہ استحصال اور تکلیف دلتوں کو ہی جھیلنی پڑتی ہے۔ یہ ہمارے سماج کی ایک بڑی حقیقت ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ شاید اس لیے گھیسو، مادھو، نسل در نسل، بھوگ رہے ظلم و زیادتی کی وجہ سے سماج کے کسی بھی قاعدے قانون کو نہیں مانتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ زمین دار، ساہوکار، پنڈت اور بھگوان سب کے کنٹرول کو رد کرتے ہوئے چیلنج کرتے ہیں۔

گھیسو اور مادھو استحصال پر پلنے والے دولتمند اور عزت دار لوگوں کی ذہنیت میں جینے والے ایسے غریب لوگ ہیں، جو محنت کش لوگوں کی بدحالی دیکھ کر پوری طرح مفت خور اور نا کارہ ہو گئے ہیں۔ ان کی مفت خوری سماجی نظریے سے اس بے گانگی کی دین ہے، جو زمیندارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی دنیا ہے۔ غریب محنت کشوں سے ان کی بے گانگی انھیں امیروں کی طرح انسانی رشتوں کے لیے حساس بنا دیتی ہے، استحصال شدہ معاشرہ کئی طرح کی بے گانگی کی وجہ بنتا ہے۔ یہ امیر، غریب کو ہی نہیں بانٹتا بلکہ غریب کو غریب سے بھی کاٹ دیتا ہے۔ 'کفن' میں بے گانگی کی سخت گیر حالت پر چوٹ ہے،

گھیسو اور مادھو استحصال پر پلنے والے دولتمند اور عزت دار لوگوں کی ذہنیت میں جینے والے ایسے غریب لوگ ہیں، جو محنت کش لوگوں کی بدحالی دیکھ کر پوری طرح مفت خور اور ناکارہ ہوگئے ہیں۔ ان کی مفت خوری سماجی نظریے سے اس بے گانگی کی دین ہے، جو زمیندارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی دنیا ہے۔ غریب محنت کشوں سے ان کی بے گانگی انہیں امیروں کی طرح انسانی رشتوں کے لیے حساس بنادیتی ہے، استحصال شدہ معاشرہ کئی طرح کی بے گانگی کی وجہ بنتا ہے۔

جہاں سوال زندگی و موت کا ہے، اور رشتے۔ باپ بیٹے اور بیوی کے ہیں۔ کہانی میں باپ، بیٹے کا اختلاف حصوں کو لے کر ہے، بھوک کی وجہ سے چرائے ہوئے آلوؤں کو لے کر، تو بدکاری کے لحات میں دبائے ہوئے 'کفن' کے پیسوں کے گل چھروں کا تفاعل ہے۔ دولتمند جس طرح دوسروں کا حق مار لیتے ہیں، اسی طرح گھیسو اپنے بیٹے کے حصے کے آلوؤں پر دانت گڑاتا ہے، امیر جس طرح دوسروں کے پیسوں پر عیش اُڑاتے ہیں، اسی طرح گھیسو بھی 'کفن' کے لیے جمع کیے چندے کی رقم سے شراب خرید لیتا ہے اور مادھو اس کی پوری تائید کرتا ہے۔ کاہلی اور شیطنت میں، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ فرق ہے تو زندگی کے تجربے کا۔ مادھو کبھی کبھی تکلیف کے وقت گھبرا جاتا ہے، وہیں گھیسو بالکل پریشان نہیں ہوتا ہے۔ سماجی نظام کو تجربے کار باپ زیادہ بہتر جانتا ہے۔ ثبوت کے طور پر درج ذیل اقتباسات پیش کیے جا سکتے ہیں:

1۔ ''میں سوچتا ہوں، کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ سونٹھ، گڑ، تیل، کچھ بھی تو نہیں گھر میں۔''
سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان 'بچہ' دیں تو — جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں، وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں بھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔

2۔ تو کیسے جانتا ہے کہ اسے 'کفن' نہ ملے گا؟ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے؟ ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا۔'' مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا ''کون دے گا؟ بتاتے کیوں نہیں؟''
وہی لوگ دیں گے، جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔

3۔ مادھو بولا۔ ''مگر دادا۔ بے چاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ کتنا دکھ جھیل کر مری۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔''
گھیسو نے سمجھایا۔ ''کیوں روتا ہے بیٹا، خوش ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔''

ایسے میں کوئی بھی سوال کر سکتا ہے کہ گھیسو اور مادھو جو بے حس اور بے رس ہیں، ان سے ہمدردی کی جائے یا نفرت؟ کہنا مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگ زیادہ نہیں تھے۔ لیکن یہ عوامل اتنے غیر فطری ہیں کہ ان کی سچائی پر آسانی سے یقین نہیں ہوتا۔ اس شک و یقین کے درمیان سے جو بات نکل کر سامنے آتی ہے، وہ بتاتی ہے کہ گھیسو اور مادھو برے کردار نہیں ہیں۔ دراصل اپنے افعال سے اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ سماجی صورت حال کتنی بھیانک اور تکلیف دہ ہے کہ انسان کو اس کے انسان ہونے سے منحرف کر دیتی ہے۔ شاید اس لیے پریم چند ان کرداروں کو کم گناہ گار مانتے ہیں۔

آخر میں یہ کہ پریم چند کے دلت کرداروں میں مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ باہمت اور جرأت مند نظر آتی ہیں۔ گنگی، ملیا، سکھیا، دُکھی اور کفن کی بُدھیا اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ (بدھیا) ''جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔'' شاید اسی لیے محنتی، سگھڑ، گھیسو، مادھو کا پیٹ پالنے والی فرض شناس بدھیا میں احساسِ بے گانگی جنم نہیں لیتا۔ احساسِ بے گانگی کے لیے بھی مفت خور زندگی کی بنیاد چاہیے جو خود دار، محنت کش اور دھن کی پکی بدھیا جیسی عورتوں میں نہیں پیدا ہوتا۔

■

Dr. Irshad Niazi
Associate Professor
Department of Urdu
University of Delhi, Delhi-110007
Mob: 9650467303
Email: niaziirshad@yahoo.com

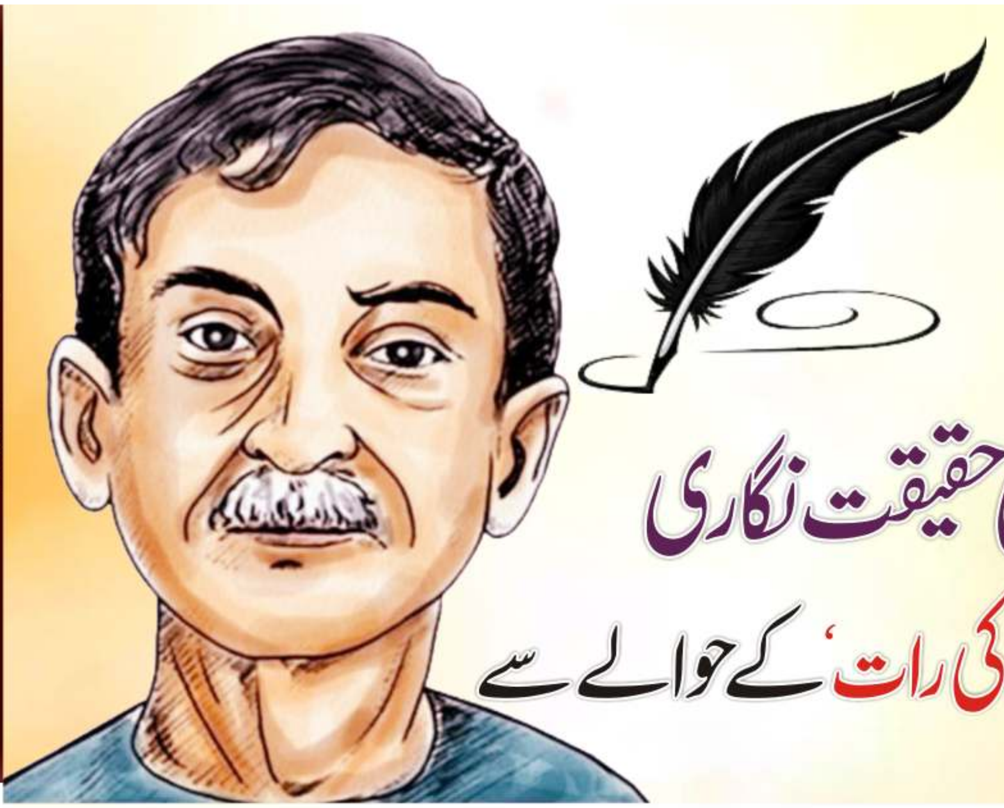

محمد انعام الحق

پریم چند کی حقیقت نگاری

'کفن' اور 'پوس کی رات' کے حوالے سے

فرانس کے مشہور ناول نگار اور ڈرامہ نگار Honore De Balzac، امریکہ کے William Dean Howells اور روس کے Nikolai Gogol کو حقیقت نگاری کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو ادب کی معروف صنف مختصر افسانے میں پریم چند کو حقیقت نگاری کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ پریم چند اتر پردیش کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مکتب سے حاصل کی۔ پریم چند نے اپنی تخلیقات کے ذریعے مظلوموں، غریبوں اور استحصال زدہ افراد کی صورت حال کو قلم بند کیا، گرچہ یورپین ادیبوں کی تخلیقات کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے، جب ہم پریم چند کی نگارشات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو وہ ایک بڑے ناول اور افسانہ نگار کی شکل میں دنیائے ادب میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے اردو، ہندی ادب کو ایک نیا لب ولہجہ عطا ہوا۔ تو اردو ہندی ناولوں اور مختصر افسانوں میں مزید جان پڑ گئی۔ جس طرح Leo Tolstoy نے روسی ادب کو شہر کے ناخوش گوار ماحول سے نکال کر دیہات کی فضا سے واقف کرایا۔ پریم چند نے بھی ہندوستانی ادب کو شہری زندگی سے نکال کر دیہات کی حقیقی زندگی سے روبرو کرایا۔

پریم چند کے افسانے جو منظر عام پر آئے۔ وہ 1920 سے 1936 تک کے عرصہ پر محیط ہیں۔ ان میں انسانی زندگی کے حالات وکوائف اور سماجی زندگی کے حقیقی واقعات کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک بیباک افسانہ نگار کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے۔ انھوں نے انگریز حکومت کے دور میں ہندوستان کی ابتر صورت حال کو اپنے فکر وخیال کی آمیزش سے افسانوی نگارشات میں ڈھال کر قارئین کی توجہ حاصل کی۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" کی 1908 میں اشاعت ہوئی۔ اس میں شامل 'دنیا کا سب سے انمول رتن' افسانہ مشرقی کہانیوں کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس کہانی کے ماحول وفضا میں مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ ان کی یہ نگارشات اپنے اندازِ بیان کی رو سے بہت رنگین ہونے کے باوجود حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کے جذبہ واحساس کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں وطن کی محبت اور آزادی کی تحریک کے جذبہ کی بیش بہا دولت کو بڑے موثر ادبی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے ابتدائی دور کے مختصر افسانوں میں رومانی طرز اور حب الوطنی کے جذبے کی کارفرمائی بخوبی تسلیم کی جاسکتی ہے۔ مثلاً ستیہ گرہ، جیل، بھاڑے کا ٹٹو وغیرہ۔ انھوں نے فرنگیوں کی حکمت عملی اور ہندوستانیوں کے جذبات واحساسات کو بڑے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔

پریم چند جس نقطۂ نظر کے تحت افسانوی ادب سے منسلک رہے ہیں۔ وہ انسان دوستی ہے۔ وہ معاشرے میں باہم بے تعلقی وبے رغبتی کے احساس کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے خاص طور سے دبے کچلے طبقے کی زندگی کو افسانوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے سماج کے مظلوم اور بیکس انسانوں کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ جس کے ذریعے حکمران طبقے کو ایک آئینہ دکھانے کی سعی کی ہے۔ اس ضمن میں کفن، پوس کی رات، راہِ نجات، سوا سیر گیہوں وغیرہ کہانیاں فنی نقطۂ نظر سے اردو ادب میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ سبھی کہانیاں نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کرتی ہیں۔ قاری ان کے مطالعہ سے حیران وششدر رہ جاتا ہے۔ مثلاً مختصر افسانہ 'پوس کی رات' کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے 'پوس کی رات' میں اپنی ذات کو کسان ہلکو کے وجود سے پورے طور پر ہم آہنگ کردیا ہے۔ ہلکو کے کردار میں قاری کے سامنے عام ہندوستانی کسان کی تصویر آجاتی ہے۔

پریم چند کا مختصر افسانہ 'کفن' آخری دور کی شہکار تخلیق ہے۔ انھوں نے اس میں دیہاتی زیست کی المناک سچائیوں کو بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے۔ حقیقت میں پریم چند کے دل میں سماج کے دبے، کچلے، غریب اور مفلس لوگوں کے لیے بے پناہ درد تھا۔ ان کی بیشتر تخلیقات، اسی جذبہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ 'کفن' سے پہلے کی بھی کہانیاں اسی نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ خاص طور سے شمالی ہندوستان کی جیتی جاگتی پریشان حال زندگی کی عکاس ہیں۔ انھوں نے اس عہد کے افسانوں میں مذہب، اخلاق، انسانیت اور انسانی فلاح وبہبود کے نظریے کو پیش نگاہ رکھا ہے۔ ان کہانیوں میں اخلاقی

اور سماجی اہمیت پر زور، خیر وشر کے بیچ ایک بڑا ٹکراؤ دکھائی دیتا ہے اور ان میں مثالیت پسندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ بہر حال 'کفن' اقتدار کے خلاف ایک احتجاج اور بغاوت کا احساس دلاتا ہے۔ اس دور کے ان کے مختصر افسانے حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہیں۔ اس میں 'کفن' سرِ فہرست ہے۔ یہاں ان کا فن و آرٹ عروج پر ہے، وہ ایک بڑے حقیقت نگار بن کر سامنے آتے ہیں، راقم الحروف نے اس کہانی میں نفسیاتی طور سے کردار کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ معاشرے کی اچھائی اور برائی کا فیصلہ خود قاری پر چھوڑ دیا، اس کہانی میں انھوں نے دیہات کی اسی زندگی کے خدوخال کو پیش کیا ہے، جہاں افلاس ہے، بدحالی، غربت، استحصال، زمیندارانہ ماحول، محنت کرنے کے بعد بھی تنگ دستی اور فاقہ کشی ہے۔ خصوصاً اس معاشرے اور سیاسی اقتدار کے تحت پرورش و پرداخت پانے والے ماحول میں چماروں کے کنبے کی کیا حیثیت ہوسکتی تھی، کہ کام کاج کے باوجود انھیں محنت کا معاوضہ نہیں مل پاتا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ گھیسو اور مادھو کس قدر کاہل سست ، لاپرواہ اور آرام پسند ہوگئے تھے۔ اس مختصر افسانے میں پریم چند نے گھیسو اور مادھو کی غربت اور فاقہ کشی کی صرف عکاسی نہیں کی ہے بلکہ اس طبقاتی ٹکراؤ کو بھی پیش کرنے کی سعی کی ہے، جس کی وجہ سے محنت ومشقت کرنے والے ہمیشہ نچلے اور پست درجہ کے ہوکر رہ جاتے ہیں۔ پریم چند نے اس رکاوٹ کی جانب کئی جگہ مکمل طور پر اور معنی خیز اشارے کیے ہیں۔ اس بنا پر ان کا بیانیہ بڑا پر اثر ہے۔

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت گھیسو اور مادھو کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی۔ کسانوں کے مقابلے میں محنت مزدوری کرنے والے لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہوتے ہوئے شاطر وچالاک لوگوں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہوگیا تھا۔

گھیسو کو ٹھاکر کی بارات کا بھوج یاد آنا، سرمایہ دار اور محنت کشوں کے درمیان ایک مسلسل آویزش جن کی

> اس مختصر افسانے 'کفن' میں پریم چند نے گھیسو اور مادھو کی غربت اور فاقہ کشی کی صرف عکاسی نہیں کی ہے بلکہ اس طبقاتی ٹکراؤ کو بھی پیش کرنے کی سعی کی ہے، جس کی وجہ سے محنت ومشقت کرنے والے ہمیشہ نچلے اور پست درجہ کے ہوکر رہ جاتے ہیں۔ پریم چند نے اس رکاوٹ کی جانب کئی جگہ مکمل طور پر اور معنی خیز اشارے کیے ہیں۔ اس بنا پر ان کا بیانیہ بڑا پر اثر ہے۔

بنیاد اگرچہ معاشی عدم مساوات پر ہے لیکن اس کا اظہار سیاسی کشمکش اور نظریاتی آویزش کی شکل میں ہوتی ہے۔ ایک جانب غریب اور پست طبقے کی محنت اور مشقت کے بعد بھی ایک وقت کی روٹی میسر نہیں ہوتی تو دوسری جانب امیر اور دولت مند لوگ شادی یا بیاہ میں بے جا روپے خرچ کرتے ہیں۔

افسانے کی کہانی نفسیات کی رو سے بڑی دلچسپ ہے۔ انھوں نے روایتی خاکہ سے گریز کیا ہے، واقعات اور حالات کے ساتھ انسانی نفسیات کی خوب مرقع کشی کی ہے۔ درحقیقت 'کفن' جدید افسانے کے معیار پر کھرا اترتا ہے۔ حادثات کی آراستگی میں شعور اور لاشعور دونوں کا دخل ہے۔ یہ مختصر افسانہ کیفیت کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے میں اس منظر کی عکاسی کی گئی ہے جہاں جھونپڑے کے باہر دروازہ پر گھیسو اور مادھو یعنی باپ اور بیٹے بجھی ہوئی آگ کے الاؤ کے سامنے آلو بھون کر کھا رہے ہیں۔ جھونپڑے کے اندر بیٹے کی جوان شریکِ حیات بدھیا دردزہ سے تڑپ رہی ہے۔ افسانہ نگار نے یہاں پر مادھو اور گھیسو کی بے مروتی، بے بسی، بے فکری، کاہلی، لاپرواہی، بدحالی، عریانی، مسکینی، فاقہ کشی اور بے حسی پر خصوصی توجہ مبذول کرائی ہے۔ ان کی بے نیازی، صبر، بھروسہ اور یاس وناامیدی کی افسانے میں خاطر خواہ عکاسی کی ہے، مزید اس میں وفا شعار بیوی بدھیا کی خوبی، وفاداری، شرافت اور جانفشانی کا بھی ذکر ہے، وہ جب سے بیاہ کر آئی ہے تب ہی سے گھیسو اور مادھو کا اپنی محنت ومشقت کے ذریعہ دونوں کا پیٹ بھرتی تھی۔ حالانکہ بدھیا کے سبب ان دونوں کی کاہلی اور بے حسی میں کس درجہ اضافہ ہوگیا ہے۔ کہ اب دونوں نہ محنت ومشقت کرتے ہیں اور حد درجہ کوتاہی برتنے لگتے ہیں، طرفہ تو یہ ہے کہ دوگنی مزدوری بھی مانگنے لگے ہیں۔ افسانہ نگار نے ان حالات کو مختصر افسانے میں ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

افسانے کا دوسرا حصہ انتہائی توجہ طلب ہے۔ کیونکہ بدھیا کے کردار کا دردزہ سے تڑپنا اور تڑپ تڑپ کر اس دنیا سے رخصت ہوجانا، دونوں باپ بیٹے کی بے حسی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ بدھیا کی موت کے بعد دونوں کا سماجی رسم ورواج کی خاطر لکڑی اور کفن کے لیے فکر مند ہونا، لاچار گاؤں کے زمینداروں کے پاس جانا، آہ وبکا کرنا، پاس پڑوس والوں کا آکر دلاسا دینا، دیہات والوں سے کفن کے نام پر 5 روپئے جمع کرنے اور کفن کی تیاری کرنے وغیرہ میں نفسیاتی کیفیت کی حقیقت کو چھپائے رکھنا قابل توجہ ہیں۔

تیسرے حصہ میں گھیسو اور مادھو 5 روپئے لے کر کفن خریدنے کے لیے بازار جاتے ہیں لیکن ان کی باطنی ونفسیاتی حقیقت رنگ لاتی ہے، دونوں بازار جاکر خوب عیش وعشرت کرتے ہیں، پوری دنیا کو خرید لینا چاہتے ہیں، شراب پوری، گوشت، سالن اور مختلف قسم کے کھانے اور ان کی ذاتی زندگی کی سب سے بڑی امید پوری ہوجاتی ہے۔ دونوں اسی دوران سماجی رسم ورواج کی بابت کفن کے موضوع پر تبصرہ کرتے ہیں۔ تاہم دونوں باہمی اتفاق رائے سے، دیرینہ خواہش کی تشنگی یعنی اپنے پیٹ کی آگ بجھانے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے کمال فن سے واقعات میں منطقی ربط قائم رکھا ہے، لیکن ان کی نفسیاتی فکر کے طور طریقے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ پریم چند نے یہاں پر انسانی

بے مروتی اور بے حسی کو افشا کردیا ہے۔ اس مختصر افسانے کے تینوں حصے باہم مربوط ہیں۔ جو افسانے کے وحدت تاثر کو قائم رکھنے میں معاون ہوتے ہیں۔

یہ افسانہ کردار نگاری کے اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پریم چند نے حقیقت نگاری کو بروئے کار لانے کے لیے کرداروں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ پریم چند نے دیہاتی لوگوں سے صرف دردمندی ہی نہیں بلکہ ان کے اندر سے غائب انسانیت کو بروئے کار لانے کی سعی کی ہے جو ان کی سرشت کا حصہ بن چکی ہے۔ اس افسانے کے تین اہم کردار گھیسو، مادھو اور بدھیا ہیں۔ مادھو کی بیوی بدھیا ایک بامروت شریک حیات اور خدمت گذار بہو ہے۔ گھیسو اور مادھو کے برخلاف اس کے اندر جاں فشانی، وفاداری اور ایثار وجذبہ ہے محنت ومزدوری کرکے وہ اپنا اور اپنے خاوند اور خسر کا پیٹ کسی طرح بھرتی رہتی ہے۔ یہی عورت جب دردزہ میں مبتلا ہوتی ہے تو گھیسو اور مادھو اپنے فرائض کی انجام دہی تو کجا وہ تو انسانیت کے اخلاقی پہلو سے بھی عاری رہتے ہیں۔ وہ دردزہ کے وقت بھی بدھیا کو بے یارو مددگار تڑپتا ہوا چھوڑے رکھتے ہیں۔ وہ دونوں کی بے اعتنائی کے سبب دنیائے فانی سے رخصت ہوجاتی ہے۔ دونوں باپ بیٹے معاشی حالت کے باعث کفن کا بندوبست کرنے میں بھی مجبور محض ہیں۔ وہ چندہ کرکے کفن کے لیے پیسہ جمع کرتے ہیں۔ مگر گھیسو اور مادھو بازار میں پہنچ کر دل ہی دل میں مسرور ہوتے ہیں۔ وہ بہت جلد ایشور کی کرپا سے مکت ہوجائیں گے اور اس پاؤں کی بیڑی سے بھی مکتی مل جائے گی۔ اگر گھیسو کو بدھیا کے درد دکھ کا گمان بھی آتا ہے تو مادھو بے توجہی اور بے رخی سے جواب دیتا ہے، مرنا ہے تو جلدی مرکیوں نہیں جاتی، دیکھ کر کیا آؤں؟ اس وقت بدھیا کو مادھو کی دلاسا اور سہارے کی سخت ضرورت ہے لیکن وہ اس قدر بے درد ہے کہ جیتے جی اس کی تیمارداری تو کجا مرنے پر اس کے کفن دفن کا اہتمام کرنے میں بھی غیر اخلاقی عمل کا مرتکب ہوتا ہے۔

گھیسو کو آخری وقت تک اسے کفن دینے کی فکر نہیں ہے وہ کائنات کے مایا جال میں ہی پھنسا پڑا ہے وہ اپنے تجربہ، اعتماد کی وجہ سے مادھو کو بھی ذہنی طور پر اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ مادھو ایک سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے آہستہ آہستہ چل کر وہ اپنے والد کے دام فریب میں اسیر ہو جاتا ہے حالانکہ دونوں سماجی احساس کے فرض سے بھی سبک دوش ہوچکے ہیں، یہاں تک کہ کفن جیسی اہم چیز کا بھی ان کو خیال نہیں ہے۔ دونوں باپ بیٹے کا رویہ بدھیا سے رشتہ کے اعتبار سے انتہائی غیر اخلاقی اور غیر انسانی بھی ہے۔ باپ بیٹے نے یہاں پر تمام سماجی اور اخلاقی قدروں کو پاؤں تلے روند دیا ہے اور بدنامی کے خوف سے ماورا آزادانہ طور پر شراب وکباب سے لطف اندوز ہونے کو فوقیت دیتے ہیں۔ پریم چند نے یہاں پر فقط خارجی ماحول اور اعداد وشمار پر ہی بس نہیں کیا بلکہ دوراندیشی سے کام لے کر گھیسو اور مادھو کی نفسیات پر ضرب لگائی ہے کہ ان کی سوچ وبچار کے عقب میں کون سا جذبہ واحساس کام کررہا ہے؟ کیونکر ان میں اس قدر بے حسی پیدا ہوگئی ہے؟ کفن میں تمام زور کردار نگاری پر ہے۔ پریم چند کا افسانہ کفن ہر اعتبار سے حقیقت نگاری کے پیمانہ پر پورا کھرا اترتا ہے انھوں نے اس میں دیہات کی زندگی گزر بسر کرنے والے معمولی آدمیوں کو بھی اپنی خلاقانہ بصیرت سے غیر معمولی کردار بنادیا ہے۔

”اگر گھیسو کو بدھیا کے درد دکھ کا گمان بھی آتا ہے تو مادھو بے توجہی اور بے رخی سے جواب دیتا ہے، مرنا ہے تو جلدی مرکیوں نہیں جاتی، دیکھ کر کیا آؤں؟ اس وقت بدھیا کو مادھو کی دلاسا اور سہارے کی سخت ضرورت ہے لیکن وہ اس قدر بے درد ہے کہ جیتے جی اس کی تیمارداری تو کجا مرنے پر اس کے کفن دفن کا اہتمام کرنے میں بھی غیر اخلاقی عمل کا مرتکب ہوتا ہے۔“

'پوس کی رات' اپنے عہد کے کسانوں کے حالات وکوائف کا عکاس ہے۔ افسانہ نگار نے اس میں بھی حقیقت نگاری کے تعلق سے فکر وخیال کو خوب پیش کیا ہے۔ پریم چند کے 'پوس کی رات' افسانہ میں 'کفن' کے مانند کاہلی وسستی، خودغرضی، بے رخی، بے غیرتی اور موقع پرستی دکھائی نہیں دیتی۔ حالانکہ 'پوس کی رات' کئی اعتبار سے مخصوص نقطۂ نظر سے حقیقت پسندی کے ادراک میں معاونت کرتا ہے۔ انھوں نے اس میں بھی دیہات کی زندگی گزارنے والے لاچار اور مجبور کسان کی مجبوری ومظلومی، غربت وافلاس اور مصیبت کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی سعی کی ہے۔ اس میں مصیبت زدہ کسانوں کی زندگی کا حقیقت پسندانہ تجزیہ ملتا ہے۔

مفلوک الحال کسان ہلکو محنت ومشقت کرکے کھیت سے جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ مال گذاری کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اس کا مقدر بے بسی اور محرومی بن چکا ہے۔ وہ شہنا کے دن بدن تقاضوں سے تنگ آچکا ہے۔ جب کہ اس کے لیے پوس کی سرد راتوں میں کھیت کی دیکھ بھال، صرف گاڑھے کی چادر اوڑھ کر کرنا مشکل ہے۔ اسی باعث وہ خواہش رکھتا ہے کہ کسی طرح سردی سے بچنے کے لیے ایک کمبل خریدا جائے۔ اس کی شریک حیات بہ مشکل 3 روپئے جمع کرپاتی ہے۔ مگر شہنا پھر تقاضے میں زور زور سے اناپ شناپ بکنا شروع کردیتا ہے، اس کی بداخلاقی کی وجہ سے ہلکو اپنی شریک حیات سے درخواست کرتا ہے کہ جو 3 روپئے، کمبل کے لیے جمع کررکھیں ہیں، شہنا کو جلد از جلد دے دو، اسی بابت خاوند اور بیوی میں تھوڑی دیر کے لیے نوک جھونک شروع ہوجاتی ہے آخر کار اس کی بیوی شہنا کو جمع پونجی دے دیتی ہے۔ مجبور محض ہلکو کھیت کی دیکھ بھال کمبل کے بغیر ہی کرتا ہے۔ جس وجہ سے وہ سردی کی تاب اور نیند کی شدت سے مغلوب ہوجاتا ہے۔ اسی اثنا میں پوری فصل نیل گائیوں کی نذر ہوجاتی ہے۔ ہلکو اور اس کی بیوی کے سامنے لگان کا بہت بڑا مسئلہ منھ کھول کر آکھڑا ہوتا ہے۔ وہ ظالمانہ نظام کے آگے مجبور اور بے بس ہوجاتے ہیں۔ قاری کو ہلکو کی غریبی، بے بسی اور ناچاری سے دردمندی نہیں بلکہ معاشرے کی غیر

منصفانہ اور ظالمانہ اقتدار سے سخت نفرت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دوسروں کی محنت ومشقت سے زمینداروں اور ساہو کاروں کا اپنی تجوریاں بھرنا ایسا قابل نفرت عمل ہے۔ جس کو کسی بھی عہد میں قابل قبول نہیں سمجھا گیا ہے۔ موصوف نے ایسے ہی اقتدار کے خلاف لگاتار آواز بلند کی ہے۔ خود ان کا رشتہ دیہات کی زندگی سے تھا۔ انھوں نے اس زندگی کا اچھی طرح سے مشاہدہ کیا تھا۔ وہ ہر اعتبار سے انسانی حالت کو پیش کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ ہلکو یہاں پر اپنی میانہ روی سے دولت مندوں، ساہوکاروں کی بیٹیوں کے ظلم وستم کو ظاہر کرتا ہے۔ 'پوس کی رات' اس عہد کے کسان کی عام حالت کی حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے اس سے معاشرے میں امیر وغریب کے حالات اور طرز عمل کا بخوبی ادراک ہوتا ہے۔

'پوس کی رات' افسانہ چھوٹے پلاٹ میں لکھی گئی موثر اور دلچسپ کہانی ہے۔ اس میں الجھاؤ نہیں بلکہ سادگی ہے۔ اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ہر حصہ ایک دوسرے سے ربط رکھتا ہے۔ جو فطری طور پر انجام کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں نفسیاتی کارفرمائی دیکھنے کوملتی ہے۔ افسانہ کے کرداروں کے حقیقی چہرہ مہرہ بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ مزید کہانی میں تکنیکی انضباط کے باعث وحدتِ تاثر بھی قائم ہے۔

اس افسانہ میں بھی تین اہم کردار ہلکو، اس کی شریک حیات (منی) اور اس کا وفادار دوست جبرا کتا ہے۔ ہر کردار اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے، منی ایک بامروت شریک حیات کی طرح ہلکو کے ساتھ غربت، بے بسی ولاچاری کی زندگی ضرور بسر کرتی ہے۔ مگر وہ ہلکو سے کہیں زیادہ اپنے گھر کے خیال میں لگی رہتی ہے۔ سردی سے بچاؤ کے لیے کمبل خریدنے کا اسے ہی گمان پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی طرح کفایت شعاری سے 3 روپئے بچا کر جمع کرتی ہے۔ وہ پر امید ہوتی ہے کہ اس دفعہ ماگھ پوس کے جاڑے کے لیے کمبل کا بندوبست ہوجائے گا۔ مگر شہنا جب اس کے گھر پر آتا ہے تو منی کس طرح سے تقاضا ٹالنے کے لیے عذر پیش کردیتی ہے۔ وہ قرض کی ادائیگی سے پراگندہ ہے۔ وہ ہلکو سے یہی کہتی ہے کہ ایسی کھیتی سے کیا فائدہ جس میں قرض ادا ہی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خاوند کی بے چینی اور پریشانی دیکھتے ہوئے جمع پونجی لاکر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتی

افسانہ نگار نے ہر ایک کردار کی کارکردگی میں ربط وتوازن برقرار رکھا ھے، خاص طور سے جبراکی کردار نگاری افسانوی تناظر میں خاصی موثر، اور جاندار ھے۔ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ کمبل ہوتے ہوئے بھی ھلکو کھیت کی نگرانی کرنے میں کامیاب ہوتا کوئی امکان اس بات کا تھا کہ وہ گھری نیند سوجاتا اس وقت بھی جبرا کام آتاھے۔ وہ نیل گائیوں کو کھیت میں گھسنے سے روکنے کی کوشش کرتا ھے۔ شاید ھلکو کے بس کی بات نہیں تھی۔ افسانہ نگارنے کردار نگاری میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ھے۔

ہے۔ مگر شوہر کو یہ رائے دیتی ہے کہ وہ ایسی کھیتی سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کرلے۔ وہ اپنے خاوند کے تئیں بے حد ہمدردی اور وفاداری رکھتی ہے۔ جس کا انکشاف شہنا کو دیے گئے جواب سے ہوتا ہے۔

''تین ہی تو روپئے 3 ہیں۔ دے دوں تو کمبل کہاں سے آئے گا؟ ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی۔ اس سے کہہ دو فصل پر روپئے دے دیں گے ابھی نہیں ہیں۔''

جب ہلکو اس سے کہتا ہے کہ کمبل کے لیے بعد میں سوچ بچار کروں گا، تو اس کے سلوک ورویہ میں تھوڑی شدت آجاتی ہے لیکن دردمندی میں کمی نہیں آئی، وہ گویا سکون اور آرام کے ساتھ باعزت زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتی ہے وہ کھیتی چھوڑ کر کے محنت مزدوری کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ کیونکہ نیل گایوں کے ذریعہ کھیت کی فصل کو خورد برد کردیا جاتا ہے۔ تو وہ کچھ اس طرح فکر مند ہوکر عرض کرتی ہے:

''اب مجوری کرکے مال گجاری دینی پڑے گی۔''

حاصل کلام یہ ہے کہ منی آئے دن قرض خواہ کی دھونس، بے عزتی اور بیگاری سے تنگ آگئی ہے اس کی بس یہی تمنا ہے کہ ہلکو کھیتی کا کام چھوڑ کر کے کوئی محنت مزدوری کا کام کھوج لے تاکہ آرام اور سکون سے دو وقت کی روٹی نصیب ہوسکے۔

نہ جاڑا کم ہوتا ہے اور نہ ہی کھیت کی نگرانی ہوپاتی ہے۔ ہلکو کی ساری محنت خاک میں مل جاتی ہے۔ ہلکو، منی اور جبرا کی قسمت میں بے بسی اور لاچاری لکھی ہوتی ہے، ہر ایک نامراد ہوتا ہے، کامیابی ملتی ہے تو ساہوکار شہنا کو۔ افسانہ نگار نے ہر ایک کردار کی کارکردگی میں ربط وتوازن برقرار رکھا ہے، خاص طور سے جبرا کی کردار نگاری افسانوی تناظر میں خاصی موثر، اور جاندار ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ کمبل ہوتے ہوئے بھی ہلکو کھیت کی نگرانی کرنے میں کامیاب ہوتا کوئی امکان اس بات کا تھا کہ وہ گہری نیند سوجاتا اس وقت بھی جبرا کام آتا ہے۔ وہ نیل گائیوں کو کھیت میں گھسنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاید ہلکو کے بس کی بات نہیں تھی۔ افسانہ نگار نے کردار نگاری میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔

کہانی میں بیانیہ انداز کے ساتھ گفتگو کا انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے، مکالمے ہلکو، منی اور جبرا کے مابین ہیں جبرا بے زباں جانور ہے لیکن وہ ہلکو کی ہر بات سمجھتا ہے اور اس کے اشارے کنائے پر اچھل کود کرتا ہے اس کہانی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز اور انجام ٹیکس کی ادائیگی سے ہوتا ہے۔ وہ کہانی کے مرکزی خیال سے جڑا رہتا ہے۔ اس افسانے کی زبان میں یہی خوبصورتی ہے کہ کہانی میں مقامی بولی اور لب ولہجے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ کرداروں کی طبیعت اور رہن سہن کے اعتبار ہی سے مکالمے پیش کیے گئے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں 'پوس کی رات' اس عہد کے کسانوں کے حالات کی خوب نمائندگی کرتا ہے۔ انھوں نے اس میں مصیبت زدہ کسانوں کی معاشرت کی راست تصویر کشی کرکے حقیقت نگاری کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

حواشی

1- اردو کے تیرہ افسانے، اطہر پرویز، ص:20,19
2- پریم چند کا نمائندہ افسانہ، مرتب ڈاکٹر قمر رئیس۔ ص:110

■

Dr. Mohd. Inamul Haque
Dayal Singh College,
University of Delhi, Delhi-110003
Mob: 8851062695
Email: mohdinamulhaque.urdu@dsc.du.ac.in

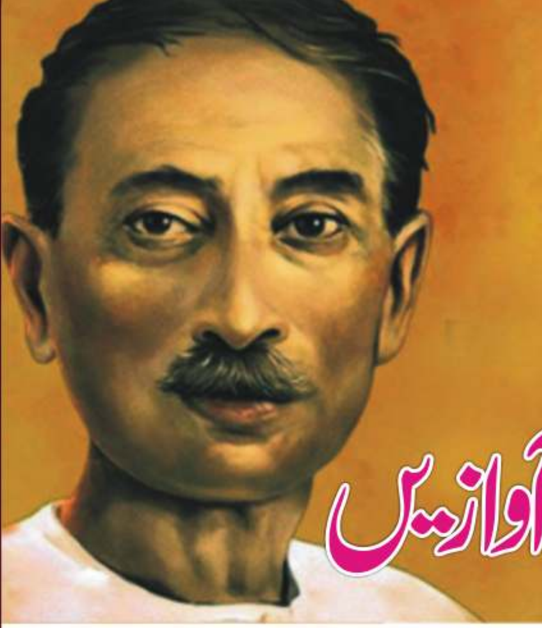

عافیہ حمید

پریم چند کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کی احتجاجی آوازیں

پریم چند کے افسانوں نے نسوانی کرداروں کی آبیاری کی اس میں تو کوئی شک نہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ وہ آواز کہیں کمزور رہے تو کہیں بے حد مضبوط۔ پریم چند کے افسانوں کی ہیروئن ایک عام سی، سیدھی سادی، بھولی عورت ہے جو کھیتوں میں کام کرتی ہے، اپنے شوہر کی خدمت کرتی ہے اور ہر رشتے کو نبھانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنے رشتوں میں اس قدر باوفا ہے کہ وہ شوہر کی زندگی سے لے کر موت تک ساتھ دیتی ہے۔ مگر پریم چند کا افسانہ خاص وہاں ہوتا ہے جب وہی عورت ظلم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ اور اپنے حق کے لیے ظالم سماج کے سامنے بے خوفی سے کھڑی ہو جاتی ہے۔

پریم چند کے ایسے، بہت سے افسانے ہیں جس میں عورت سیدھی سادی تو ہے مگر بیوقوف نہیں۔ وہ صرف ایک حد تک برداشت کرتی ہے۔ اصل میں پریم چند ازدواجی زندگی کو جوڑے رکھنے اور سماج کی اصلاح کے لیے لیے اپنی ہروئین کو آخری دم تک برداشت کرنے پر آمادہ رکھنا چاہتے ہیں مگر پھر اُن کے اندر کا ترقی پسند آدمی بول پڑتا ہے بس اب اور نہیں۔ اور ان کے افسانوں میں نسوانی آواز صدائے احتجاج میں بدل جاتی ہے۔ پریم چند کے افسانے اصلاحی ہونے کے ساتھ احتجاجی بھی ہیں۔ اُن کے افسانوں میں نسوانی آواز کمزور ضرور ہے مگر بااثر اور فکر انگیز ہے۔

پریم چند نے ایسے بہت سے افسانے لکھے جس میں نسوانی قوت برداشت کا عکس ہے مگر وہیں سرد آہوں کے ساتھ گرم جذبات بھی ہیں۔ مثلاً۔ پوس کی رات، بوڑھی کا کی، نئی بیوی، دو بہنیں، شکوہ شکایت، گھاس والی، بیٹی کا دھن، ستی، اناتھ لڑکی، بے غرض محسن وغیرہ۔

اردو افسانے کے آغاز سے ہی خواتین کے جملہ مسائل کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ازدواجی تعلقات کی پیچیدہ گتھیوں سے لے کر روزمرہ کے حادثات تک سب اس میں پیش کیے گئے جدید تعلیم کے اثرات کے سبب جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا اثر بھی اردو افسانوں پر پڑا۔ تہذیبی ٹکراؤ اور جدید طرز حیات کے نمونے بھی دیکھنے کو ملنے لگے۔ گھریلو حادثات و واقعات اور خاتون خانہ کی حقیقی روداد بھی ہمارے افسانوں میں کثرت سے ملتی ہے۔

ہندوستانی عورت کو اطاعت اور اخلاص و محبت کی بھرپور تعلیم ابتدائی زندگی سے دی جاتی ہے۔ پریم چند اسی جذبے کے حامی تھے، انھوں نے اپنے افسانوں میں ایسی خاتون کی تصویر کشی کی جو ہندوستان کی مخصوص سماجی حالت میں گھریلو نظام کو بہتر طور پر چلا سکے اور ازدواجی زندگی میں مسرت پیدا کر سکے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

''پریم چند کے اکثر افسانوں میں عورت کی فطرت میں قربانی کا جذبہ دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنے شوہر، اپنے بھائی اور اپنے ملک کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کو اپنا اہم فرض جانتی ہے۔ اس میں حسن ہے، نظر کا جادو ہے، اداؤں کا فریب ہے، موسیقی کا ترنم ہے لیکن ان سب سے زیادہ ایثار و قربانی ہے۔''

(فن افسانہ نگاری۔ وقار عظیم ص/329)

پریم چند نے اپنے افسانوں میں تقریباً عورت کے تمام تر روپ سے انصاف کیا ہے۔ نسوانی کرداروں کا دکھ پریم چند، مہدی، عصمت، منٹو، کرشن چندر کے یہاں صاف نظر آتا ہے۔ قریب قریب تمام ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں نسوانی کرداروں کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ اپنے افسانوں میں پریم چند نے ایسے مثالی نسوانی کردار پیش کیے ہیں جو ہر حال میں شوہر پرستی کا ثبوت دیتی ہیں۔ پریم چند اپنے فن اور کردار دونوں کے ساتھ مکمل انصاف کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی اور درپیش مسائل کو بہت اعتدال کے ساتھ بیان کیا ہے۔

افسانہ شانتی میں دیوناتھ کی بیوہ گوپا اپنی لڑکی سنی سنیتا کی شادی اپنے شوہر کے دوست مداری لال کے لڑکے کیدارناتھ سے آپسی تعلقات کی بنا پر کر دیتی ہے۔ لیکن ذہنی اور فکری عدم مناسبت کے سبب ازدواجی زندگی میں بدمزگی رہا کرتی ہے۔ دونوں ہی اپنے والدین کے اکلوتے ہیں اور بے جا لاڈ پیار نے دونوں کے اندر ایسی انانیت پیدا کر دی ہے جو ازدواجی زندگی کے نشیب وفراز میں درگذر کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ دونوں ایسی تربیت سے محروم ہیں جو ازدواجی زندگی میں اخلاص و محبت کے لیے ضروری ہیں، اور آخر میں سنی اپنے شوہر کی بے وفائی سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتی ہے۔ پریم چند ازدواجی تعلقات میں جہاں کشیدگی کا انجام صلح 'آتشی پر نہیں ہو پاتا' اسی نسخے کو استعمال کرتے ہیں۔

پریم چند فکرمند ضرور ہیں کہ وہ جس مشرقیت کے حامی تھے اس سے دونوں ہی محروم تھے گوپا اپنی لڑکی کے دفاع میں کہتی ہے:

''لڑکا چاہتا ہے کہ میں چاہے جس راہ پر جاؤں سنی میری پوجا کرتی رہے۔ سنی بھلا اسے کیوں سہنے لگی تم اسے جانتے ہو کتنی خوددار ہے۔ وہ ان عورتوں میں نہیں ہے جو اپنے شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں اور اس کی بدسلوکیاں برداشت کرتی رہتی ہیں اس نے ہمیشہ لاڈ پیار

پایا ہے۔ باپ بھی اس پر جان دیتا تھا میں بھی آنکھ کی تپلی بھی تھی۔ شوہر ملا چھلا جو آدھی آدھی رات مارا مارا پھرتا ہے۔ دونوں میں کوئی گانٹھ پڑگئی ہے۔ نہ وہ سنی کی پرواہ کرتا ہے اور سنی اس کی پرواہ کرتی ہے۔''

(شانتی مجموعہ واردات، پریم چند اص/67)

پریم چند کے افسانوں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اصلاحی نظریہ کے حامی تھے اور گاندھی جی سے کافی متاثر بھی تھے۔ وہ ستی جیسی بری رسم کے خلاف تھے وہ کم عمری کی شادی کو برا سمجھتے، نیز سماج میں رائج دیگر بے کار کی رسومات کے خلاف تھے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعے اخلاص اور محبت کا پیکر نسوانی کردار تراشا ہے۔

پریم چند مغربی تہذیب کے مضر اثرات سے واقف تھے۔ اس لیے ان کے اکثر افسانوں میں مشرقی خاتون کا پیکر ملتا ہے۔ مغربی طرز سے ان کو لگتا تھا گھر یلو زندگی تنازعہ کی شکار ہوسکتی ہے۔

افسانہ 'مس پدما' بیوہ ماں کی دو ایسی لڑکیوں کی کہانی ہے جو مغرب زدہ معاشرے سے متاثر ہیں۔ ڈاکٹر جھلا پہلے تو رتنا سے شادی کرتا ہے لیکن کچھ عرصہ بعد اپنی آزادہ روی سے رتنا کی زندگی کی رنگینی چھین لیتا ہے رتنا کی چھوٹی بہن مس پدما سے اس کی قربت اس کے کردار کی سطحیت کو اجاگر کرتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جھلا اس وقت مس پدما کو تنہا چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے جب وہ بچی کی پیدائش کے مرحلے سے گزرتی ہے۔ رتنا نے جھلا کی تصویر اور اثاثے جلا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

رتنا ڈاکٹر جھلا کے ساتھ اپنی ناکام شادی کے بارے میں کہتی ہے:

''یہی رونا ہے ہماری شادی بزرگوں کی طے کردہ نہ تھی ہم ایک دوسرے کے مزاج اور عادات سے خوب واقف تھے۔۔۔۔ ایک دوسرے کے عیب و ہنر پہچاننے کے جتنے مواقع ہمیں ملے بہت کم کسی کو ملے ہوں گے۔ اب معلوم ہوا کہ عورت کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ شادی کو لعنت کا طوق سمجھے۔''

(افسانہ مس پدما مجموعہ زادراہ۔ پریم چند،ص 143/)

اس حادثے سے مس پدما نے کوئی سبق نہیں لیا اپنی بہن کے سابق شوہر کے ساتھ بغیر شادی کے ہی ازدواجی زندگی گزارنے لگی کیونکہ یہ تعلقات اخلاص پر مبنی نہ تھے۔ بلکہ ہوس کاری کا نتیجہ تھے۔ ان میں خلوص اور ایثار نہ تھا مس پدما ڈاکٹر جھلا کو اپنی کمائی سے پالتی ہے پھر بھی وہ اس کی محبت کی قدر نہیں کرتا:

جھلا: اب آپ کو ذرا میرا انتظار کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔۔۔تو کیا چاہتی ہو کہ میں تمہارے آنچل سے بندھا دن رات بیٹھا رہوں۔

مس پدما: کچھ ہمدردی تو چاہتی ہوں۔

جھلا: میں اپنی عادتوں کو تبدیل نہیں کرسکتا۔

(افسانہ مس پدما مجموعہ زادراہ۔ پریم چند ص143/)

پریم چند کے افسانوں میں اگر ترقی پسندی کی مکمل عکاسی دیکھنا ہو تو کفن دیکھیں۔ جہاں نسوانی کردار تمام تر ہمدردی کے ساتھ نظر آتا ہے کفن میں جہاں ایک طرف عورت کے درد کی تکلیف کا کرب ہے کہ وہ کتنی تکلیفوں کو برداشت کر کے اپنے شوہر اور سسرال والوں کی نسل کو آگے بڑھاتی ہے۔ وہیں دوسری طرف ایک بے حس سماج کا ذکر بھی موجود ہے جس سماج میں غربت اتنی زیادہ ہے کہ مادھو اور گھیسو کفن کا پیسہ تک شراب اور پوڑی میں اڑا دیتے ہیں۔ سماج کی بے حسی اتنی زیادہ ہے کہ انسان دوسرے انسان کا کفن تک بیچ کر کھا جائے۔ کفن کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کرگئی وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں نہاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔

(کفن پریم چند،نقوش لاہور،افسانہ نمبر جلد دوم ص/360)

اسی طرح مشترکہ پریوار میں جو مسائل عورتوں کی وجہ سے ہوئے ہیں اور ان حالات میں ایک عورت کو کیسا کردار پیش کرنا چاہیے وہ پریم چند کے افسانے بڑے گھر کی بیٹی میں بخوبی نظر آتے ہیں۔ جہاں آنندی اپنے دیور لال بہاری سنگھ کو منا کر گھر واپس لاتی ہے۔ اور گھریلو جھگڑوں کا حل نکالتی ہے۔ جس کے جواب میں بنی مادھو سنگھ آنندی کا سسر آنندی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

''بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بگڑا ہوا کام بنالیتی ہیں۔''

(بڑے گھر کی بیٹی۔ دیہات کے افسانے۔ پریم چند ص۔100)

ایسا نہیں ہے کہ پریم چند کے یہاں نسوانی کردار صرف بہو، بیٹی، یا ماں کے روپ میں گھر کی چہار دیواری تک محدود ہیں بلکہ ان کے افسانوں میں نسوانی کردار آزادی کے جذبے سے سرشار جلسوں میں بھی شرکت کرتی ہیں لاٹھی اور گولیاں کھاتی ہیں۔ آزادی اور سوراج کے تصور سے واقف ہیں۔ افسانہ ''جیل کی روپ متی کہتی ہے:

''کم از کم میرے لیے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں کہ ''جان کی جگہ گو بند آبیٹھے۔ میں سوسائٹی کی ایسی حالت دیکھنا چاہتی ہوں جہاں غریب سے غریب آدمی کو بھی پیٹ بھر کھانا میسر آسکے۔''

(جیل۔ مجموعہ آخری تحفہ۔ پریم چند ص/108)

پریم چند کی پیش کش نے ہندوستانی عورت کے کردار کو انقلابی بنانے میں اہم رول ادا کیا اور خواتین کو ملکی جدوجہد آزادی کے جذبے سے سرشار دکھا کر اس طبقہ کی نمایاں طور پر نمائندگی کی ہے۔ آزادی کی تحریک میں خواتین کی عملی شرکت پر مشتمل افسانے پریم چند کے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتے۔ ضمنا تذکرہ البتہ ہوتا رہا ہے۔

پریم چند نے نسوانی کرداروں کی وہ تمام تصویریں ایک ایک کر کے سماج کے سامنے پیش کیں جس سے حقیقت میں اس وقت نسوانی کردار نبرد آزما تھے۔ ادیب اور مصنفین اپنے زمانہ اور دور کے گواہ ہوتے ہیں اور ادب اپنے زمانہ کا آئینہ۔ ٹھیک اسی طرح ہم ترقی پسند آئینے میں نسوانی کردار کے مختلف عکس تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس دور میں نسوانی کرداروں کو مختلف مسائل درپیش تھے۔ مثلاً معاشرتی زندگی میں بے حد کمزور ہونے کے باوجود ان کے کاندھوں پر خاندان بھر کی ذمہ داری تھی۔ گھر کی چہار دیواری سے لے کر باہر تک اس سے سخت محنت لی جاتی۔ مرد اور عورت دونوں ایک ساتھ معاشی ذرائع پیدا کرتے تھے۔ اس کے باوجود مرد اس پر بالا دست تھا۔ ان کے علاوہ کم عمری کی شادی، بیوہ کا ستی ہونا گھر اور سماج میں برابر کا حق نہ ملنا، عصمت کا تقدس صرف عورت کے ساتھ مخصوص ہونا، مرد کے لیے کھلی آزادی، نیز عورتوں کو کوٹھے پر بٹھانا وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام موضوعات کو پریم چند نے بڑی چابک دستی سے اپنے افسانوں میں جگہ دی

ہے۔ اور ہندوستان کے اس سلگتے ہوئے مسئلہ کو قلم برداشتہ اپنا موضوع بنایا۔ تقریباً ہر نمائندہ افسانہ نگار نے اپنے نمایاں افسانوں میں خواتین سے متعلق مسائل کو خاص اہمیت دی ہے۔ اور اپنے افسانوں کے ذریعے نسوانی کرداروں کی ترتیب وتشکیل پر پوری توجہ مرکوز کی ہے۔ ترقی پسندوں نے ہر آن نسوانی کردار کو مضبوط اور نڈر بنانے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر پریم چند کا افسانہ 'زادراہ' جس میں ایک ماں اس وقت سارے زمانے کے سامنے اکیلی کھڑی ہو جاتی ہے جب بات اس کی بیٹی ریوتی پر آتی ہے جس سے بوڑھا سیٹھ جھا برمل شادی کرنا چاہتا ہے تب سوشیلا پتھر کی چٹان بن کر اپنی بیٹی کی راہ میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور سوشیلا غصہ میں کہتی ہے:

''یہ پچاس سال کا کھوسٹ اور اس کی یہ ہوس۔۔ یہ احمق سمجھتا ہے کہ لالچ میں آ کر اپنی پھول سی لڑکی اس کے گلے میں باندھ دوں۔۔۔۔ نام کے لیے ساری جائیداد کھوئی، زیور کھوئے، مکان کھویا لیکن لڑکی کو کنویں میں نہیں ڈال سکتی نام رہے یا جائے۔

(زادراہ پریم چند،ص۔250)

اور جب سوشیلا کے سامنے پوری برادری کی کچھ نہ چل سکی تو سب نے مل کر جعلسازی کی اور سیٹھ جھا برمل کو یقین دلایا کہ روپ وتی کو اس کی بیوی ثابت کر کے رہیں گے سیٹھ کبیر داس کہتے ہیں:

''تم گھبراؤ نہیں جھا برمل اسے عدالت سے ٹھیک کروں گا، جاتی کہاں ہے''؟

باعزت زندگی سے مایوس روپ وتی سیٹھ جھابرمل کے خوف سے خودکشی کر لیتی ہے۔ پوری برادری ہاتھ مل کر رہ جاتی ہے۔ یتیم کی لاش پر چند آنسو بہانے کا سوال بھی کہاں، یہاں تو خراج عقیدت ان الفاظ میں ادا کیا گیا:

''چلو جھگڑا پاک ہوا۔ برادری کی بدنامی تو نہ ہوگی۔'' (ایضاً،ص:160)

پریم چند کے دور میں بہت سے ایسے افسانے لکھے گئے جو افسانے کی تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اردو میں عورتوں کی ترتیب وتشکیل اور ترقی کی فکر سب سے پہلے کامیاب انداز میں جس صنف میں پیش کی گئی وہ افسانہ ہے۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ہی روایتی فرسودہ سماج اور عورتوں کی ترقی وسماجی برابری کے

> پریم چند کے افسانے اگر چہ دیہاتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں مگر ان کے افسانوں کی ہروئین وفا کی مورت کے ساتھ ساتھ بیداری کا ثبوت بھی ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں نسوانی کردار اگر چہ مذہبی اور روایتی ہیں مگر اس کے باوجود اُن کے یہاں نسوانی آوازوں میں احتجاج بھی موجود ہے۔

خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے اسے ایک سمت عطا کی۔ ترقی پسند تحریک کے دوران جن افسانہ نگاروں نے عورتوں کے مسائل، ان کی ارتقائی فکر کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ان میں پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری، رضیہ سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، جیلانی بانو وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ نسوانی کردار کے ارتقائی سفر کو بخوبی پیش کیا۔

پریم چند کے افسانے اگر چہ دیہاتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں مگر ان کے افسانوں کی ہروئین وفا کی مورت کے ساتھ ساتھ بیداری کا ثبوت بھی ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں نسوانی کردار اگر چہ مذہبی اور روایتی ہیں مگر اس کے باوجود اُن کے یہاں نسوانی آوازوں میں احتجاج بھی موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں نسوانی کردار کے یہاں ظلم کے خلاف فہم اور زبان دونوں موجود ہیں، پریم چند کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب سماج ذہنی احتجاج کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔ مطلب اس وقت عورت کا سماج کے ظلم کے خلاف یا کسی روایت کے خلاف بولنا تو دور کی بات سوچنا بھی حرام تھا۔ ایسے حالات میں ایک شخص اپنے قلم کے ذریعے لوگوں کے ذہن کو بیدار کرنے پر آمادہ تھا۔

ایسے بہت سارے افسانے پریم چند نے لکھے جو واقعی سماج ومعاشرے کا عکس تھے۔ کہیں زمینداروں کی بربرتا تھی تو کہیں ساہوکاروں کا ظلم، کہیں غربت کی انتہا تھی تو کہیں توہمات کا غلبہ، کہیں کسان کی خودکشی تھی تو کہیں فصلوں کے تباہ کن اثرات، کہیں کم عمری کی شادی، تو کہیں ستی پرتھا، گویا ہر طرف ظلم و ناانصافی۔ ایسے حالات کا جو سب سے زیادہ شکار تھیں وہ سماج کی عورتیں تھیں۔ کبھی اُن کو دھرم کے نام پر قربانی کے لیے مجبور کیا جاتا تو کبھی مضبوط مرد سماج اُس کو دبانے کی کوشش کرتے۔ ایسے میں پریم چند جیسے حساس شخص نے اپنی کہانیوں کے ذریعے نسوانی ذہن کو بیدار کیا۔ اُن کی سوچ کو زبان دی۔ انھوں نے اپنے افسانوں سے ثابت کیا کہ عورت باوفا تو رہے مگر ہوشمندی سے بھی کام لے۔ انھوں نے کہا کہ عورت گھر میں تو رہے مگر باہر کی دنیا سے بےخبر نہ رہے۔ جس وقت پریم چند نے لکھنا شروع کیا اور جب تک لکھا۔ اس دوران بہت کچھ بدل گیا۔ جس کا اثر اُن کے افسانوں پر صاف نظر آتا ہے۔ ابتدا کے افسانے میں عورت چار دیواری تک محدود تھی۔ مگر بعد کے افسانوں میں وہی عورت گھر سے باہر، صدائے احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے پریم چند کے آخر کے زمانے میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو چکا تھا جس میں پریم چند نے خود کہا تھا کہ ''اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا'' اس حسن میں ادب کے ساتھ نسوانی آواز بھی موجود تھی۔

ماخذ و مصادر

1۔ فن افسانہ نگاری، وقار عظیم
2۔ واردات، پریم چند
3۔ نقوش، لاہور افسانہ نمبر جلد دوم
4۔ دیہات، کے افسانے، پریم چند
5۔ آخری تحفہ، پریم چند
6۔ زادراہ، پریم چند

■

Dr. Aafiya Hameed
Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032
Mob: 7897811988

سورداس

منشی پریم چند

سورداس ہندی بھاشا کے بزم سخن کا صدر نشین ہے۔ نقادوں نے اُسے ہندی شاعری کا آفتاب قرار دیا ہے اور گوسائیں تلسی داس کو ماہتاب۔ ان کا کلام پریم اور بھگتی کا ایک لازوال سرچشمہ ہے۔ ان کا ایک ایک پر معرفت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ خود عارف کامل تھے۔ مکروہات روزگار سے الگ تھلگ۔ فکر دنیا سے دور برندابن میں جمنا ندی کے کنارے فقر و قناعت کی زندگی بسر کی۔ اور وہیں وہ آب حیات کی بارش کی جس سے آج تک ہندی بھاشا سرسبز ہے اور رہے گی۔ ان کی شاعری ان کی بھگتی کی ظاہری صورت تھی۔ جو کچھ اندر تھا اس کا ایک جزو باہر لفظوں میں ظاہر ہوا۔ معمولی شاعروں کی طرح حسن وعشق کے وہ جذبات نہیں ادا کیے جن کا کبھی حس ہی نہیں ہوا۔ ہم آج کل اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے فکر سخن کرتے ہیں تکلفات اور آرائشات کے بیچ میں درد فراق اور صدمہ ہجر کا رونا روتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ہمارے اشعار بے مزہ بے جان۔ خشک اور بے اثر ہوتے ہیں۔ ہم ہنستے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہنسی میں رونے کا درد پیدا کریں۔ شہر سے باہر ایک قدم نہیں رکھتے۔ مگر وادی وصحرا کی مصیبتیں بیان کرتے ہیں۔ سورداس کا کلام اس تصنع سے پاک ہے۔ اور یہی اُس کی تاثیر کا راز ہے۔ اس کی قبولیت کا یہ حال ہے کہ شاید ہی کوئی راگیا ہو جو ان کے پد نہ گاتا ہو ان کا پد زبان پر آیا اور اہل ذوق کے دلوں میں درد کا مزہ محسوس ہونے لگا۔ ایک شاعر نے ان کے کمال کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

اتم پد کب گنگ کے   اپما کے بربیر
کیسو ارتھ گنبھیر تا   سور تیں گن دھیر

یعنی گنگ کو پد میں کمال ہے۔ راجہ بیربر کو تشبیہات میں۔ کیشو داس کو معنی آفرینی میں۔ مگر سورداس کو ان تینوں باتوں میں کمال حاصل ہے۔ تان سین دربار اکبری کے ایک رتن تھے۔ فن موسیقی میں کوئی ان کا ثانی نہیں پیدا ہوا۔ سورداس سے یقیناً صحبتیں رہی ہوں گی۔ وہ ایک صاحب ثروت آدمی تھے۔ مگر سورداس کا کمال ان کی خدمت میں کھینچ لاتا تھا۔ ایک بار تان سین نے سورداس کو یہ دوہا سنایا۔

کدھوں سور کو سر لگیو   کدھوں سور کی پیر
کدھوں سور کو پد لگیو   تن من دھنت سریر

یعنی کسی دلاور کے تیر یا درد ریاح۔ یا سور کے پد۔ تینوں۔ تن اور من کو بے تاب کر دیتے ہیں۔ اس دوہے میں صنعت لفظی ہے۔ سور کو مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ سورداس نے یہ دوہا سنتے ہی معاً برجستہ کہا۔

بدھنا یہ جیہ جان کے   سیسہی دیئے نہ کان
دھرا میرو سب ڈولتا   تان سین کے تان

سیسناگ کی نسبت روایت ہے کہ وہ زمین کو اپنے پھن پر سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور دوسرے سانپوں کی طرح ان کے بھی کان نہیں ہوتے۔ صانع قدرت نے سیسناگ کو محض اس لیے سامعہ نہیں عطا کیا کہ اگر وہ تان سین کے تان سنتے۔ تو عالم بے خودی میں جھومنے لگتے۔ اور اس سے زمین پر ایک زلزلہ آجاتا۔ مبالغہ ہے مگر کتنا لطیف۔ دونوں باکمال تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے کلام کے معترف، سورداس نے اپنے سارے پد مختلف راگنیوں کی دھن میں بنائے ہیں۔ اور یقیناً زمرہ عارفین میں کسی سایہ دار درخت کے نیچے اپنے بین پر اپنے پد گا گا کر سنائے ہوں گے۔

مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اس لاثانی شاعر کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہوں۔ ان کا حسب و نسب اور مولد و مسکن بھی محتاج تحقیق ہے۔ بعض سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ وہ ذات کے بھاٹ اور اُس چند بردائی کے خاندان میں تھے جو راجہ پرتھی راج کا رفیق جاں نثار اور سوانح نگار تھا اور جس کی تصنیف آج بھی اس کے کمال کی معترف ہے۔ مگر سورداس کے پیرزادے گوسائیں گوکل ناتھ نے بھی ان کے جو حالات لکھے ہیں۔ وہ اس روایت کی تصدیق نہیں کرتے۔ وہ سورداس کے معاصر تھے۔ اور اکثر ان سے لطف صحبت اٹھایا ہوگا۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ ان کے حسب ونسب سے بھی آگاہ نہ ہوں۔ ان کے بیان کے مطابق وہ سارسوت برہمن تھے۔ ان کے باپ کا نام رام داس تھا۔ دلی کے قریب ایک موضع سیہی میں پیدا ہوئے۔ اور یہی بیان قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ ان کا سن ولادت تحقیقی طور پر 1540 معلوم ہوا ہے۔ اور قیاساً سال وفات 1620 ہے۔ سوامی بلبھ آچاریہ بھی اس وقت کے مشہور ویشنو گرو تھے۔ سورداس اُن کے مرید ہوئے۔ بعد ازاں گوسائیں بٹھل داس جی سے تلقین حاصل کی۔

سورداس اندھے کیوں ہوئے یہ بھی معرض بحث

میں ہے۔ ایک روایت ہے کہ وہ پیدائش سے اندھے تھے۔ مگر ان کے کلام میں مناظر اور رمز و کنائے اس واقعیت سے بیان کیے گئے ہیں کہ ایک نابینا شخص محض سامعہ کی بنا پر نہیں کرسکتا۔ انھوں نے ضرور دنیا دیکھی۔ اس کی دلچسپیوں اور بوقلمونیوں کا مشاہدہ کیا۔ اور نہایت پرذوق نگاہوں سے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری روایت زیادہ قرین قیاس ہے یعنی عالم شباب میں وہ کسی حسینہ کو دیکھ کر فاسد خیالات سے باز نہ رہ سکے۔ چونکہ خلقت پاک نفس تھے۔ نفس کی یہ سرکشی ناگوار گذری۔ اس کا قلق ہوا اسی وقت، سوئی سے دونوں پتلیاں نکال ڈالیں۔ کتنا رفیع۔ مافوق البشر اخلاقی احساس ہے۔ گناہ سے کیسی نفرت! نفس کشی کی ایسی اعلیٰ تمثیل مشکل سے ملے گی۔

سورداس ابھی دس ہی برس کے تھے کہ ان کے والدین زیارت کے لیے متھرا آئے۔ سورداس اُن کے ساتھ تھے۔ کئی دن کے بعد جب وہ واپس ہونے لگے تو سورداس نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کیا۔ ماں باپ رونے لگے اور کہا یہاں تمھیں کس کے آسرے پر چھوڑ جائیں؟ کون تمہاری خبر گیری کرے گا۔ سورداس نے کہا۔ جب یہاں خود کرشن چندر ہی ہیں تو مجھے کس کے سہارے کی ضرورت ہے؟ کتنا زندہ اعتقاد تھا۔ اور ابھی عالم طفلی ہی کے دن تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بچے میں یہ وہبی خلقی وصف تھا۔ والدین جب لڑکے کو کسی طرح راضی نہ کر سکے تو روتے پیٹتے گھر لوٹ گئے۔ اس وقت سے تا دم مرگ سورداس متھرا اور برندابن رہے۔ انھیں کنجوں میں ساری زندگی گذار دی۔ جس کا دل کرشن کے پریم سے سرشار ہو اس کے لیے اس سے زیادہ دلفریب مقام اور کہاں ہوسکتا تھا جس کی ایک ایک انگل زمین اُس کے قدموں سے پاک ہوگئی ہے۔ جس طرح خود اہل دنیا سے محترز رہے۔ اسی طرح اپنی شاعری کو دنیا اور ترغیبات سے بے نیاز رکھا۔ اس وقت بڑے بڑے راجے مہاراجے ان کے قدموں کے تلے آنکھیں بچھاتے۔ مگر عجب استغنا تھا۔ جو سر کرشن کے سامنے جھکا دیا اسے پھر کسی کے سامنے نہ جھکایا۔ کسی سے صلہ کی خواہش۔ نہ کسی کی خوشی ناراضی کی فکر نہ تعریف کی تمنا۔ ہندی شعرا میں بھی بجز گوسائیں تلسی داس کے ایسی استغنا کی مثالیں معدوم ہیں۔ اور اردو شعرا تو ہمیشہ رؤسا اور امرا کے دست نگر رہے۔ اس نورانی بزرگ کا دم آخر اس کی ساری زندگی کا خلاصہ تھا۔ اپنے معبود کی تعریف کرتے کرتے اس جہان سے رخصت ہوگئے۔

سورداس نے اپنے تئیں کرشن کی بھگتی پر وقف کر دیا تھا۔ وہ انھیں اپنا سچا معبود سمجھتے تھے۔ کرشن ان کی نگاہوں میں پرماتما کی عالمگیر محبت کے اوتار تھے۔ اور کسی صورت میں انھوں نے اُن کو نہیں دیکھا فلسفی کرشن مدبر کرشن، معرکہ آرا کرشن کا ان کے کلام میں کہیں ذکر نہیں۔ جس وقت کرشن برندابن سے متھرا چلے گئے انھوں نے اُنکا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہاں ان کے فراق میں اشک کے دریا بہایا کیے۔ وہ کرشن کو رادھا سے، گوپیوں سے، گوالوں سے اور گایوں سے الگ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کیونکہ انھیں بساطوں پر کرشن نے اپنی محبت کی بازی کھیلی تھی۔ ان کی پرعقیدت نگاہ میں رادھا اور کرشن ایک ہی ہستی کی دو مختلف صورتیں تھیں۔ یہ وہ نازک میدان ہے۔ جہاں فلسفہ اور استدلال اور استقرا کو حیران ہو جانا پڑتا ہے۔ موٹی نگاہوں میں کرشن ایک عیش پسند انسان نظر آتے ہیں۔ اور ان کا پھر ایک عالم تبحر کی صورت میں ارتقا پانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے اسی وجہ سے اس خیال کے ماننے والوں کی کمی نہیں ہے کہ یہ دو مختلف بزرگوں کی داستانیں ہیں اور کسی غیر معلوم طریقہ پر مخلوط ہوگئی ہیں۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ ہندوؤں کے مخالفین نے کرشن کی عظمت اور احترام کو گھٹانے کے لیے یہ فرضی واقعے اُن کی ذات سے منسوب کر دیے ہیں۔ مگر سورداس کو ان مباحث سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ پریم جو برندابن کے ہر مرد و زن کے دلوں پر یکساں طور پر حاوی ہو۔ جس میں اتنی کشش اتنا جذبہ، اتنی لطافت ہو کہ اس کی ایک آواز پر ساری گوپیاں دوڑی ہوئی چلی آئیں۔ جو اس حسد اور رقابت اور کینہ سے پاک ہو۔ جو ایسی حالت میں ہونا ضروری تھا۔ وہ پریم خواہ کسی رمز شناس شاعر کی رنگین بیانی ہو۔ خواہ محبت مجاز کی خیالی شاعرانہ پرکیف تصویر ہو۔ مگر اُس میں نفس کو کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ واقعہ نہیں ہے تو جس دماغ نے اس کرشن کو پیدا کیا وہ رموز الفت کا ماہر کامل تھا۔ وہ شرارت، وہ چربانکپن، وہ کھلاڑی پن، وہ دلآویز چوریاں۔ وہ خوشگوار شرانگیزیاں جو بچپن میں کرشن کی امتیازی خوبیاں تھیں کسی کا دل نہ دکھاتی تھیں۔ عورتیں جسودا کے پاس شکایتیں کرنے آتیں۔ مگر اس شکایت میں لذت ذوق کا مزہ ہوتا تھا۔ یہ بچہ جوان ہو کر وہی ہوسکتا تھا جو وہ ہوا۔ جب تک بچہ تھا سارا شہر اس کی شرارتوں پر جان دیتا تھا۔ جب وہ جوان ہوا۔ سارا شہر اس کی محبت میں متوالا ہوگیا۔ سورداس نے یہ سارے واقعات کرشن کے بچپن سے لے کر برندابن سے روانگی کے وقت تک نہایت پراثر دلآویز، رقت انگیز انداز سے بیان کیے ہیں۔ اس کے ایک ایک پر میں بھگت کی عقیدت اور محبت جھلکتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ کرشن کو مخدومانہ نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ ان کی بھگتی ہیں صوفیانہ پن تھا۔ تلسی داس رام کے بھگت تھے۔ مگر وہ اپنے تئیں رام کا خادم سمجھتے تھے۔ سورداس کی بھگتی میں دوستی غالب تھی۔ وہ کرشن کو اپنا محبوب سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے بڑی بامزہ۔ رنگین شکایتیں کی ہیں گوپیوں کی زبان سے کرشن کو صلواتیں سنائی ہیں۔ انھیں برا بھلا کہا ہے۔ مگر اس طعن میں بھی عقیدت کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ تلسی داس بار بار یاد دلاتے رہتے ہیں کہ وہ ایشور کے اوتار کی داستان لکھ رہے ہیں۔ اس لیے جب رام چندر کی کوئی حرکت انھیں ناپسندیدہ معلوم ہوتی ہے تو وہ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ رموز قدرت میں ناقص الف انسان کو کیا دخل۔ مگر سورداس نے کبھی کرشن پر یہ پردہ نہیں ڈالا کبھی ان کی الوہیت کی یاد نہیں دلائی۔

> سورداس فنافی العشق انسان تھے۔ اُن کے نزدیک ذات پات، دولت وثروت، علم و ہنر کی کوئی وقعت نہ تھی۔ جس شخص میں بھگتی نہ ہو اسے وہ چوپایہ سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔ بھگت انسان خواہ وہ کتنا ہی نیچی ذات اور ادنیٰ رتبہ کا ہو ان کی نگاہوں میں قابل تعظیم تھا۔ وہ مجاز اور حقیقت کے گورکھ دھندے میں نہیں پڑے۔ وجود مطلق کا تخیل اُن کے لیے غیر ممکن تھا۔

سورداس فنافی العشق انسان تھے۔ اُن کے نزدیک ذات پات، دولت وثروت، علم وہنر کی کوئی وقعت نہ تھی۔ جس شخص میں بھگتی نہ ہو اسے وہ چوپایہ سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔ بھگت انسان خواہ وہ کتنا ہی نیچی ذات اور ادنیٰ رتبہ کا ہو ان کی نگاہوں میں قابل تعظیم تھا۔ وہ مجاز اور حقیقت کے گورکھ دھندے میں نہیں پڑے۔ وجود مطلق کا تخیل اُن کے لیے غیر ممکن تھا۔ ایک پد میں کہا ہے:

روپ ریکھ۔ گن۔ جاتی۔ جگت بن
نرا لب من چکرت دھاوے

سورداس کی شاعری کی دوسری صفت ان کی قادر الکلامی ہے۔ انھوں نے جس مضمون کو لیا ہے۔ انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ کسی دوسرے کے لیے طبع آزمائی کی گنجائش نہیں رکھی۔ کرشن کا عالم طفلی ان کی شوخیاں اور شرارتیں۔ ان کا مچلنا اور روٹھنا۔ پھر ان کا شباب اور اس کی مستانہ کیفیتیں عشق و محبت کی کہاوتیں۔ راز و نیاز کے کرشمے گوپیوں کی بیقراریاں۔ اُن کی میٹھی میٹھی شکایتیں، ہجر و وصال، پھر کرشن کا متھرا کو جانا۔ اور گوپیوں کا ان کی محبت میں گھلنا۔ پھر کرشن کا اودھو کو گوپیوں کے پاس بیراگ کا پیغام دے کر بھیجنا اور گوپیوں کا اودھو سے اپنے دلی محرموں کی داستان بیان کرنا۔ ان تمام واقعات میں اس زندہ جاوید شاعر نے کمال سحر نگاری کی ہے۔ روایت ہے کہ سورداس نے پورے ایک لاکھ پد بنائے تھے۔ مگر اس وقت سورساگر کے جتنے نسخے موجود ہیں ان میں چار ہزار پد سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان پدوں کو پڑھیے اور دیکھیے کہ یہ کتنا وسیع النظر شخص تھا۔ طفلی اور شباب اور بڑھاپا غرض زندگی کے ہر ایک دور میں ان کا خیال یکساں آزادی سے پرواز کرتا ہے۔ جسودا کرشن کو گود میں لے کر دل میں سوچتی ہے کب یہ گھٹنوں کے بل چلے گا۔ کب میرا آنچل پکڑ کر ساتھ ساتھ دوڑے گا۔ کب اپنے ہاتھوں کھائے گا۔ کبھی خوش ہو کر بلائیں لینے لگتی ہے کبھی انھیں انگلیاں پکڑ کر چلنا سکھاتی ہے۔ کرشن گر گر پڑتے ہیں۔ وہ انھیں اٹھا لیتی ہے۔ پھر کرشن کو ٹھک ٹھک چلتے دیکھ کر پھولی نہیں سماتی۔ پھر کرشن دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہیں بدن میں مٹی اور دھول لپیٹے دوڑتے ہیں۔ بچوں کی فوجداریاں، نالشیں، بیانات، فیصلے جس واقعیت کے ساتھ انھوں نے ادا کیے ہیں اس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ ماں کی آرزوئیں اور خواہشیں اور حوصلے کیا بیان کیے ہیں تصویر کھینچ دی ہے۔ محض تصویر نہیں کھینچی۔

سورداس کی شاعری کی دوسری صفت ان کی قادر الکلامی ہے۔ انھوں نے جس مضمون کو لیا ہے۔ انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ کسی دوسرے کے لیے طبع آزمائی کی گنجائش نہیں رکھی۔ کرشن کا عالم طفلی ان کی شوخیاں اور شرارتیں۔ ان کا مچلنا اور روٹھنا۔ پھر ان کا شباب اور اس کی مستانہ کیفیتیں عشق و محبت کی کہاوتیں۔ راز و نیاز کے کرشمے گوپیوں کی بیقراریاں۔ اُن کی میٹھی میٹھی شکایتیں، ہجر و وصال، پھر کرشن کا متھرا کو جانا۔ اور گوپیوں کا ان کی محبت میں گھلنا۔ پھر کرشن کا اودھو کو گوپیوں کے پاس بیراگ کا پیغام دے کر بھیجنا اور گوپیوں کا اودھو سے اپنے دلی محرموں کی داستان بیان کرنا۔ ان تمام واقعات میں اس زندہ جاوید شاعر نے کمال سحر نگاری کی ہے۔

بلکہ تصویر میں جان ڈال دی ہے۔ دیکھیے ایک موقع پر کرشن اپنی ماں سے کیا شکایت کرتے ہیں۔

کھیلن اب میری جات بلیا

یعنی میری بلا کھیلنے جاتی ہے۔ مجھے لڑکے چڑھاتے ہیں۔ کرشن کی شرارت دیکھیے:

پانڈے نہیں بھوگ لگاون پاوے

بے چارہ جب کھانا پکا کر ٹھاکر جی کا بھوگ لگانا چاہتا ہے کرشن جا کر اسے چھو آتے ہیں۔

اس کے بعد زیادہ نقصاندہ شرارتوں کا دور آتا ہے۔ کرشن گوپیوں کے گھر جاتے ہیں اور ماکھن چرا کر کھا لیتے ہیں۔ گوپیاں جسودا سے الہنے دینے آتی ہیں۔ ماں کو یقین نہیں آتا کہتی ہے کیا میرے گھر پر مکھن نہیں ہے۔ یہاں تو چھوتا بھی نہیں۔ تیرے گھر کیونکر کھا آتا ہے۔ گوپی کہتی ہے۔

سانور یہی برجت کیوں جو نہیں
کہا کروں دن پرت کی باتیں ناہیں پرت سہی

یعنی تو اپنے سانولے کو منع کیوں نہیں کرتی۔ روز روز کا نقصان نہیں سہا جاتا۔ ایک دن کی ہو تو کوئی در گذر کر جائے۔ جسودا جواب دیتی ہے۔

میر و گوپال تنک سوں کہا کری جانے ددھی کی چوری

یعنی میرا گوپال ننھا سا بچہ ہے۔ وہ دودھ چرانا کیا جانے میرے گھر کموریاں ماکھن سے بھری پڑی ہیں ہاتھ نہیں لگاتا۔ تیرے گھر چھینکے پر چڑھ کر کھا آتا ہے۔ جھوٹ موٹ بچے کی شکایت کرتی ہے۔ یہ واقعے اور یہ شرارتیں اس زمانہ کی یاد دلا دیتے ہیں جو ہماری زندگی کے بہترین دن تھے۔ اپنا بچپن آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اور اس کی یاد شیریں دل کو بے قرار کر دیتی ہے۔

اس کے بعد گوالپن کا زمانہ آتا ہے۔ کرشن گائیں چرانے جاتے ہیں۔ گایوں کو بانسری بجا بجا کر سناتے ہیں شام کو گرد وغبار چہرے پر جمائے گھر آتے ہیں۔ گلہ بانی شعرا کی سادہ قانع، پر اطمینان زندگی کا معراج ہے۔ دنیا کے بہترین شاعر اسی زندگی کی خوشیوں کا خواب دیکھا کیے ہیں۔

اس کے بعد شباب کی امنگوں کا دور آتا ہے۔ یہاں سورداس نے حسن اور عشق کے ایسے ایسے جذبات ایسے ایسے رموز بیان کیے ہیں جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اس دریا کی غواصی کی تھی۔ کنارے پر ایسے در بے بہا کہاں؟ گوپیوں سے زکوٰۃ حسن مانگتے ہیں۔ ان کا رستہ روکتے ہیں پنگھٹ پر جاتے ہیں۔ اور انھیں چھیڑتے ہیں۔ وہ تیور بدلتی ہیں۔ منہ سے کوستی ہیں۔ آنکھوں سے ہنستی ہیں۔ خود بھاگتی ہیں۔ پر دل سینہ سے اُچھل کر ملتا ہے۔ رادھکا آتی ہے۔ کمسن، شوخ چلبلی چنچل عشق کے تیر چلتے ہیں۔ ایک پد میں رادھکا اپنی سکھی سے کہتی ہے۔

سن ری سکھی دشا یہ میری
جب تے ملے شیام گھن سندر
سنگہی پھرت بھئی جنو چیری

یعنی جب سے شیام کا دیدار ہوا ہے اُن کے پیچھے پیچھے لونڈی بنی پھرتی ہوں۔

پھر کہتی ہے اگر میں قدرت کو اپنے بس میں کر سکتی۔ تو اپنے بدن میں ایک ایک روئیں کے بجائے آنکھیں بناتی۔ کبھی کہتی ہے۔

کو جانے ہری کہا کیو ری
من سمجھت مکھ کہت نہ آوت
کچھ ایک رس لوچن جو پیوری

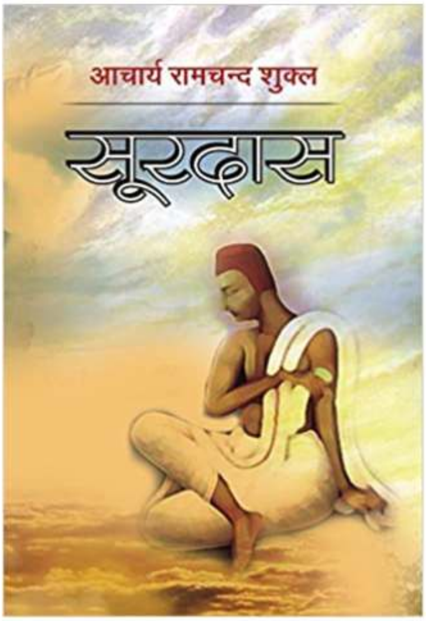

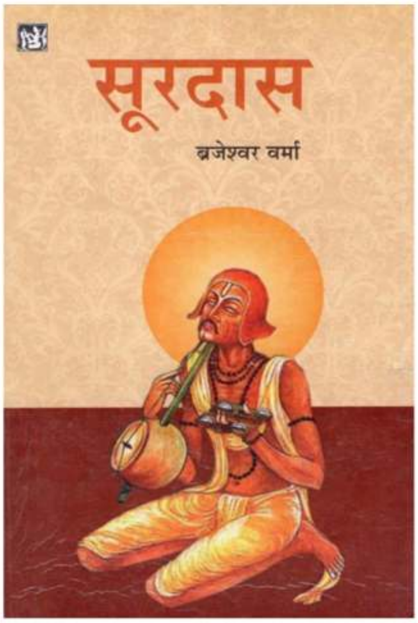

یعنی معلوم نہیں شیام نے کیا جادو کر دیا۔ لطف دیدار کا مزہ دل سمجھتا ہے۔ زبان سے نہیں ادا ہوتا۔

اس طرح کے سیکڑوں پد ہیں محبت کے جذبات سے لبریز۔ مگر سورداس کا پدا کبرا گر دیکھنا ہو تو وہ پد پڑھیے جو انھوں نے کرشن کی متھرا سے روانگی کے وقت گوپیوں کی زبان سے ادا کرائے ہیں۔ ہجر کی کلفتیں۔ گذشتہ مسرتوں کی یاد شیریں۔ دل کو مختلف پہلوؤں سے سجانے کی کوششیں، تغافل کی ناکام تدبیریں۔ نہایت پرحسرت انداز سے بیان کی گئی ہیں۔ بالخصوص جسودا کا بلاپ تو دل کو ہلا دیتا ہے۔

میرے کمل نین پران تے پیارے

رو رو کر کہتی ہے برج میں ایسا نہیں کوئی ہے جو کرشن کو روک لے۔ دیکھو میں لڑکے کو گود میں کھلایا وہ کتنا نروئی ہوا جاتا ہے۔ میرا لڑکا ابھی بھولا نادان ہے۔ وہ متھرا کی ریت رسم کیا جائے۔ ہائے کہتی ہے۔

موہن اتنو موہے چت دھر یئے
جننی دکھت جان کے
کبھوں متھرا گمن نہ کریئے

یعنی پیارے مجھ پر اتنی دیا کرو۔ میرے غم کو خیال کر کے متھرا نہ جاؤ۔ بے اُس عورت اس کے سوا اور کیا کہے!

کچھ دنوں کے بعد نند جی کرشن کو لوٹانے کے لیے متھرا گئے۔ اس اثنا میں کرشن نے کنس کو قتل کر دیا تھا اور امور سیاست میں مصروف تھے۔ نند سے کہا آپ میرے باپ ہیں۔ آپ کے سوا میں کسی کو نہیں جانتا۔ آپ نے میری پرورش کی۔ اس کے لیے ہمیشہ آپ کا مرہون رہوں گا۔ آپ کی مہربانیاں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ مگر آپ بزرگ ہیں۔ جانتے ہیں دنیا میں کسی چیز کو قیام نہیں۔ مجھے ابھی دنیا میں بہت کام کرنا ہے۔ آپ لوٹ جایئے۔ غریب نامراد نند یہ فلسفیانہ تقریر سن کر رو دیا۔ بولا:

نٹھر بچن جن کہو کنھائی
تم ہنس کے بولت یہ بانی
میرے نین بھرت ہے پانی
پنتھ نہارت یشو متی ہوے ہے
تم بن مو کو دیکھ سوکھے ہے

کرشن ایسی بے رحمانہ باتیں مت کرو۔ تم یہ باتیں ہنس ہنس کے کہتے ہو۔ میری آنکھیں بھر بھر آتی ہیں۔ جسودا تمہارا راستہ دیکھ رہی ہوگی۔ مجھے اکیلے دیکھ کر سوکھ جائیگی۔ جب وہ دوڑی ہوئی آئے گی تو میں اُس سے کیا کہوں گا! اب پھر تمہارے منہ سے دادا کیونکر سنوں گا!

کرشن نے پھر سمجھایا۔ اس پر نند جی بولے:

میرے موہن، تمرے بنا نہیں جیہوں

آخر جب کرشن کسی طرح راضی نہ ہوئے تو نند اٹھ کھڑے ہوئے۔ آنکھوں سے جوے اشک جاری تھا۔ زبان سے بات نہ نکلتی تھی۔ پھر کچھ جواب نہ دیا۔ اصرار نہ کیا۔ مایوس ہو گئے۔ جب برندا بن پہنچے۔ اُس وقت کی داستان جگر خراش ہے۔ قادر الکلام شاعر وہ ہے جو ہر ایک جذبہ کو صداقت سے ادا کر سکے۔ ناظر اس کے مرکز میلان تک نہ پہنچے۔ اس کے ایک ایک رنگ کو دیکھ کر گمان ہو کہ یہی اُس کا اصلی رنگ ہے۔ سورداس میں یہی وصف تھا۔ کریش نے جب اودھو کو برج باسیوں کے پاس یوگ اور بیراگ کی تلقین کرنے کے لیے بھیجا۔ اس وقت گوپیوں کے دل میں جو جذبات وارد ہوئے ہیں۔ انھیں سورداس نے دو سو سے زائد پدوں میں بیان کیا ہے۔

ایک ایک پد حسرت اور رقت اور غم کا دفتر ہے۔ وہ نالہ محزوں۔ وہ فغاں پردرد۔ وہ یاس بے پایاں۔ سورداس کے پدوں میں جگر پر تیر کی طرح لگتا ہے۔ کرشن جانتے تھے کہ ان کے فراق میں گوپیوں کا برا حال ہے۔ ان کی تشفی کے لیے کسی کو بھیجنا ضروری تھا۔ یہ سمجھانا بھی ضروری تھا کہ وہ میرے غم میں نہ گھلیں۔ مجھے بھول جائیں۔ مجھے اب دوسری ہی صورت میں دیکھیں۔ اودھو سے کہا۔

اودھو اتنو کہیو جائے
ہم آویں گے دوؤ بھیا
میّا جنی اکٹائے (گھبرائے)
یدپی یہاں انیک بھانت سکھ
تدپی رہو نا جائے

اودھو کا رتھ جب برج میں پہنچا۔ دور سے دیکھ کر لوگوں نے خیال کیا کرشن آتے ہیں۔ خوشی سے متوالے ہو گئے۔ پیش قدمی کرنے دوڑے۔ جسودا روتی ہوئی

”
کچھ دنوں کے بعد نند جی کرشن کو لوٹانے کے لیے متھرا گئے۔ اس اثنا میں کرشن نے کنس کو قتل کر دیا تھا اور امور سیاست میں مصروف تھے۔ نند سے کہا آپ میرے باپ ہیں۔ آپ کے سوا میں کسی کو نہیں جانتا۔ آپ نے میری پرورش کی۔
“

گھر سے نکل آئی۔ گوپیاں دروازوں پر کھڑی ہو گئیں۔ گھر گھر خبر پھیل گئی۔ جب رتھ قریب آیا۔ خواب پریشاں ہو گیا۔ نند نے اودھو سے خط لے لیا۔ پڑھا۔ تب پوچھنے لگے کبھی شیام ہم لوگوں کو بھی یاد کرتے ہیں جسودا کہتی ہے:

ہمتے کچھ سیوا نہ بھئی

کتنی مادرانہ محبت ہے۔ کیسا سچا جذبہ کتنی حسرت! خط پڑھا گیا۔ مضمون سن کر گوپیوں کے دل بیٹھ گئے۔ مجاز کے متوالے حقیقت کیا جانیں۔ رنگ روپ کے عاشق یوگ کیا سمجھیں۔ اودھو پر طنز اور ملامت کی بوچھار پڑنے لگی۔ خوب! اچھا اُپدیش ہے! آپ تو داں کو بری کے ساتھ بھار کر رہے ہیں۔ نہیں لوگ کی صلاح دیتے ہمیں یوگ کی صلاح دیتے ہیں۔ اودھو تمھیں برج کی عورتوں سے یہ کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی ہمیں تو یقین نہیں آتا کہ شیام نے یہ سندیسا کہا ہوگا۔ تم خود بھول رہے ہو۔ ایسے ہی لوگ بے شرم کہلاتے ہیں۔ سوچتے بچارتے نہیں۔ جو منہ میں آیا کہ ڈالتے ہیں۔ عورتوں سے یوگ بتاتے ہیں۔ جس دل میں شیام بس رہے ہیں وہاں برہم کے لیے کہاں جگہ ہے۔ ہم گنوار لوگ یوگ کیا سمجھیں! ایک گوپی کہتی ہے۔

اودھو ہو ہو آگے تے نیارے
تمھیں دیکھ تن اِدھک جرت
ارو نینوں کے تارے

اس پد میں کتنا عاشقانہ جذبہ ہے۔

اودھو ہم آج بھین بڑبھاگی
جن آنکھیں تم شیام بلوکے
تے انکھیاں ہم لاگی

اودھو جیسے پھول کی خوشبو سے بھری ہوا سے بھونرا مست ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم خوش نصیب ہیں کہ تمہاری ان آنکھوں کو دیکھ رہے ہیں جنھوں نے شیام کو دیکھا ہے۔ ایک پد اور ملاحظہ کیجیے۔

انکھیاں ہری درشن کی پیاسی
دیکھا چاہت کمل نین کو
نس دن رہت اداسی

اس پد میں سوتیاڈاہ کا جذبہ بھرا ہوا ہے۔

اودھو سن سن آوت ہانسی
کہاں وے برہمادک کے ٹھاکر
کہاں کنس کی داسی

ایک گوپی کہتی ہے:

اودھو من نہ بھئے دس بیس
ایک ہتو سو گئو شام سنگ
کو اور ادھے ایس

یعنی دل ایک تھا۔ وہ شیام کے ساتھ گیا۔ اب ایشور کی عبادت کون کرے۔ آخر اودھو جی بھی اپنا گیان بھول گئے۔ پریم کے سیلاب میں نہ تھم سکے۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ سورداس جس مضمون کو لیتے ہیں، انتہا تک نبھاتے ہیں۔ کرشن کی بنسی مشہور ہے۔ اسکا ذکر بیس پچیس پدوں میں ہوا ہے۔ سورداس آنکھ کے اندھے تھے۔ مگر سو سے زائد پد آنکھوں ہی کے متعلق ہیں۔ کہیں آنکھوں کا گن گایا ہے۔ کہیں اُن کی شکایت کی ہے۔ تشبیہ اور تلازمے اور استعارات پر یہ قادر تھے۔ ان کے تلازمے بڑے لطیف پر معنی رسیلے ہوتے ہیں۔ تشبیہوں میں یہ کالی داس کو نہیں پہنچتے۔ زیادہ تر پامال ہیں مگر ان کا استعمال ایسی خوبی سے کیا ہے کہ اُن میں اولیت کا مزہ آ گیا ہے۔ رادھکا کے سیندور کی سرخی کو طلوع آفتاب کی سرخی سے مشابہ کیا ہے۔ ناک کو دو کھنجنوں کے بیچ میں بیٹھے ہوئے

> سورداس ہندی لٹریچر کا آفتاب ہے۔ حسن بیان، حسن جذبات، حسن اخلاق۔ یہی اس کے کلام کی خوبیاں ہیں۔ وہ صناع ہے مگر فطری مناسبت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

ایک طوطے سے تشبیہ دی ہے۔ ان کے جذبات کے نمونے ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ ان کی روانی بیان بندش الفاظ سراپا وغیرہ کے نمونے اُردو میں نہیں دیے جاسکتے۔ ان کی تشریح تو ہوسکتی ہے مگر متن کا پڑھنا ہی دشوار ہے۔ اتنا لکھنا کافی ہے کہ ان اوصاف میں بھی ہندی کا کوئی شاعر ان سے سبقت نہیں لے گیا۔ حسن کی ایسی سجی ہوئی دلکش تصویریں بنائی ہیں۔ مناظر کے ایسے فرحت بخش مرقعے کھینچے ہیں کہ کوئی چار آنکھوں والا شاعر بھی اس سے بہتر نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے تلازمے اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ رادھکا کا سراپا کھینچتے ہوئے ایک پد میں اسے ایک باغ سے ملایا ہے۔ اس میں کنول ہے۔ ساگر ہے۔ مست ہاتھی کلولیں کر رہا ہے۔ جھرنے ہیں کہساریں ہیں۔ روشیں ہیں۔ کنج ہیں۔ پھول ہیں۔ پھل ہیں۔ چاند ہے۔ سہانی چڑیاں ہیں۔ سب اپنے اپنے موقع پر اپنے اپنے دھن میں مست ہیں۔ اور ان کا مجموعہ حسین رادھکا ہے۔

سورداس کے معمے مشہور ہیں۔ مفہوم کو اتنا غامض اور تلمیح طلب بنا دیا ہے کہ بغیر شرح کے اُس کا سمجھنا مشکل ہے۔ ایسے پدوں کو انھوں نے چھانٹ کر یکجا کر دیا ہے۔ اس کا نام ہے ''ساہتیہ لہری''۔ ان پدوں کے بنانے میں غایت درجہ کی دقت نظری اور مشکل پسندی سے کام لیا گیا ہے۔ پہلے پد کو پڑھیے مہمل معلوم ہوتا ہے۔ مگر شرح دیکھیے تو آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ جاتا ہے اور معنی کی درخشاں شعاعیں نظر آنے لگتی ہیں۔ ان سے سورداس کے تبحر اور تحقیق کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔

سورداس نے اوصاف نگاری میں بہت اونچا معیار پیش نظر رکھا ہے۔ اپنے کیرکٹروں کی زبان سے جو باتیں کہلائی ہیں۔ برجستہ با موقع کسی کو تہذیب سے نہیں گرنے دیا۔ جسودا کرشن پر جان دیتی تھی۔ مگر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے خلاف شکایتیں بالکل بے بنیاد نہیں ہیں تو انھوں نے کرشن کو ایک اوکھلی سے باندھ دیا۔ یہ مادرانہ تادیب کی بہت اچھی مثال ہے۔ جب کرشن متھرا چلے گئے ہیں تو جسودا نے کرشن کی اصلی ماں دیوکی کو جو سندیسا کہلا بھیجا ہے۔ اس میں ماتما کا بہت شوخ، قدرتی رنگ ہے۔ کہتی ہے میں تمہارے لڑکے کی دایہ ہوں۔ مجھ پر ہمیشہ عنایت کی نگاہ رکھنا۔ تمہارے لڑکے کو صبح کے وقت مکھن روئی بہت بھاتی ہے۔ تیل ابٹن اور گرم پانی دیکھ کر بھاگ گیا ہے۔ پھسلا کر بہلا کر نہلاتی تھی۔ مجھے بڑی فکر ہے کہ کہیں میرا پیارا شرماتا نہ ہو۔

متھرا میں کرشن کبجا کے دام محبت میں اسیر ہوئے۔ جب اودھو یوگ کا پیغام لے کر چلنے لگے تو کبجا نے بھی گوپیوں کو سندیسا دیا۔ اس میں فیاضی اور شرافت بھری ہوئی ہے۔ مگر گوپیوں نے اُس کی توہین اور تخریب میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ یہ بالکل فطری جذبہ ہے۔ جس کی دوکان چل رہی ہے وہ فیاض ہوسکتا ہے۔ اسے فیاض ہونا چاہیے مگر دیوالیہ فیاضی کہاں سے لائے۔

الغرض سورداس ہندی لٹریچر کا آفتاب ہے۔ حسن بیان، حسن جذبات، حسن اخلاق۔ یہی اس کے کلام کی خوبیاں ہیں۔ وہ صناع ہے مگر فطری مناسبت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ہاں اس میں ایک خامی ہے۔ خدم وحشم شاہی آداب وآئین۔ جدال وقتال کے تذکرے اُس سے ادا نہیں ہوتے۔ اس کی رقیق، گداز طبیعت ایسے کرخت مضامین کے لیے ناموزوں ہے۔ جو دل محبت اور عقیدت سے سرشار ہو۔ وہ خونیں داستانیں اور تیر و تفنگ کے ہنگامے کیا بیان کرے گا۔ اس کے کمالات کا خلاصہ یہی ہے کہ وہ شاعر ہے جذبات کا۔ ■

(مطبوعہ: 'ترجمان' لاہور، مارچ 1917، ص 121 تا 130)

منشی پریم چند

بھوشن

بھوشن ہندی شاعری کے خاقانی ہیں۔ انھوں نے اپنا سارا کمال مدح سرائی میں صرف کیا۔ اس رنگ کے سوا انھوں نے کسی دوسرے رنگ میں فکرِ سخن نہیں کی۔ لیکن محض سیم و زر کی خواہش انھیں قصیدہ گوئی پر آمادہ نہ کرتی تھی۔ وہ حب وطن، شجاعت، کارہائے مردانہ، قومی غرور کے ثناگر تھے۔ اور جس کسی کو انھوں نے ان اوصاف سے آراستہ پایا اُس کی ستائش دل کھول کر کی۔ وہ اورنگ زیب اور شیواجی کا زمانہ تھا کہیں ہندوؤں پر جزیہ لگتا تھا۔ کہیں ان کے مندروں کی بے حرمتی کی جاتی تھی۔ راجپوتانہ اور دکن میں ہندو سرکشی پر آمادہ تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مخالفت اور عناد کا شعلہ دہک رہا تھا۔ مظلوم ہندوؤں کا حامی اور معاون کوئی نہ تھا۔ صرف شیواجی ہی ایک ایسا بشر تھا جو اس طوفان میں ہندوؤں کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اُس کے معرکوں کو غارتگری کہیے۔ قزاقی کہیے لیکن چونکہ وہ مسلمان بادشاہ کی مخالفت میں ہوتے تھے۔ اس وجہ سے ہندووں کی نگاہ میں وہ قوم پرور قوم پرست۔ قومی شہید بن رہا تھا۔ وہ ہندوؤں کی گرتی ہوئی دیوار کا ستون ڈوبتی ہوئی کشتی کا ناخدا سمجھا جاتا تھا۔ ہر ایک سچا شاعر اپنے زمانہ کا مرقع ہوتا ہے۔ وہی حرارت جو عوام کے دلوں میں ساری رہتی ہے۔ اس کے دل میں شعلہ زن ہو جاتی ہے۔ شیواجی اگر بھوشن کا ممدوح بنا تو یہ ایک قدرتی امر تھا۔ بھوشن نے شیواجی کی تعریف اس لیے نہیں کی کہ وہ ایک صاحب ثروت راجہ تھا۔ اور شاعر کے کمال کی داد دے سکتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ پامال ہندوؤں کا دوست اور ان کا سہارا تھا۔ قدیم شعرا میں جس قدر قومیت کا رنگ بھوشن کے کلام میں موجود ہے اتنا کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتا صف اول کے ہندی شعرا میں یا تو بھگتی کا مذاق غالب تھا۔ یا حسن وعشق کا۔ سورداس، تلسی بھگتی کی طرف۔ جھکی بہاری کیشو دیو وغیرہ حسن وعشق کی طرف۔ فی الجملہ ہندی شاعری اس الزام سے بری نہیں ہے جو اُردو شاعری کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔ بیشتر اہل کمال نے ہجر ووصال اور خط وخال کے دائرے سے قدم باہر نہیں نکالا۔ لیکن بھوشن کی پرغرور طبیعت۔ ان کی مردانہ اسپرٹ عشق اور بھگتی کے رنگ میں جولاں پذیر نہ ہو سکی۔ جانبازی اور شجاعت کا رنگ ان کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ اور اس رنگ میں وہ ہندی دنیا میں فرد ہیں۔ پرتھوی راج کا رفیق چندر بردائی بھی اس رنگ کا شاعر ہے۔ لیکن اس کا کلام اس قدر متروک الفاظ سے پر، اتنا ادق ہے کہ اس کی زبان کو ہندی بھاشا کہنا ہی نہ چاہیے۔ آج کل کے معمولی ہندی جاننے والوں کے لیے ان کا کلام عربی سے کم نہیں۔

بھوشن کانیہ کبج برہمن تیواری تھے۔ ان کے باپ کا نام رتنا کر تھا۔ یہ چار حقیقی بھائی تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام چنتا من تھا۔ دو چھوٹے بھائیوں کے نام متی رام اور جٹا شنکر۔ ضلع کانپور تحصیل گھاٹم پور کے موضع تکوان پور میں رہتے تھے۔ کانپور سے ایک سڑک گائم پور ہوتی ہوئی ہمیر پور کو جاتی ہے۔ گھاٹم پور سے سات میل پر ایک مقام سچنتی پڑتا ہے سچنتی سے تکوان پور صرف دو میل پر واقع ہے۔ قیاساً یہ 1636 میں پیدا ہوئے۔ اور 1715 میں انتقال کیا۔ اس خاندان پر ہمہ آفتاب کی مثل صادق آتی ہے۔ باپ بھی شاعر اور چاروں بیٹے بھی شاعران میں متی رام اور بھوشن تو ہندی کی صف اولیں کے بیٹھنے والے ہیں۔ ایسے با کمال خاندان کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ بھوشن کا اصلی نام معلوم نہیں تخلص نے اصلی نام کو مٹا دیا۔ لیکن یہ یگانہ روزگار شاعر بیس برس کی عمر تک لہو ولعب میں مصروف رہا۔ یا تو کسی نے تعلیم دینے کی فکر نہ کی۔ یا اس کی طبیعت خود نفور تھی۔ بڑے بھائی چنتا من کی کمائی پر بسر اوقات تھی۔ ایک روز یہ بےفکر نوجوان کھانے بیٹھا تو بھاوج سے نمک مانگا۔ بھاوج نے نمک تو نہ دیا۔ زخم پر نمک چھڑک دیا۔ نکھٹوؤں کی یہی گت ہوا کرتی ہے۔ بھوشن کی غیور طبیعت ان سخن ہائے تیز کی متحمل نہ ہوسکی۔ یہ اسی دن سے تحصیل علم میں محو ہو گئے۔ اور آٹھ دس سال کی ریاضت شاقہ نے انھیں عالم اور شاعر دونوں ہی بنا دیا۔ اب کسب معاش کی فکر ہوئی۔ قدرداں کی تلاش میں نکلے چتر کوٹ اس زمانہ میں بڑی ریاست تھی۔ ہر دے رام سولنکی وہاں کے راجہ تھے۔ بھوشن اُن کے دربار میں آئے۔ راجہ نے ان کی خوب خاطر و مدارات کی۔ اور بھوشن کا لقب عطا کیا۔ یہاں کئی سال تک بھوشن اُس کے دربار کے رتن بنے رہے۔

یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ چتر کوٹ سے بھوشن اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ان کے ساتھ ایسی کج خلقی سے پیش آیا کہ یہ اسے برسر دربار نشانہ ملامت بنا کر وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ یہ روایت قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ جب ہندوؤں کی مخالفت کا خوف بلوے اور بغاوتیں اورنگ زیب کے لیے مصلح نہ ثابت ہوسکیں تو ایک شاعر کی کوشش کیا کارگر ہوسکتی تھی۔ وہ بھی ہندی شاعر کی۔ اور بالفرض اپنے کمال کے غرور میں بھوشن کو یہ جرات ہوئی بھی ہوتو اورنگ زیب ایسا شخص نہ تھا جو کسی شاعر کی ہرزہ درائی کا متحمل ہوسکتا۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ بھوشن شاہی دربار میں کوئی ذاتی تمنا لے کر نہ گئے ہوں گے۔ ہندوؤں پر اس وقت جو مظالم ہو رہے تھے انھیں دیکھتے کسی ہندو شاعر کو خواب میں بھی اورنگ زیب سے قدردانی کی امید نہ ہوسکتی تھی۔ غالباً بھوشن چتر کوٹ سے براہ راست شیواجی کے دربار میں پہنچے۔ اس وقت ان کا سن بتیس سال سے متجاوز ہو چکا تھا۔ کلام میں مہارت

ہوگئی تھی۔ اپنے اوپر اعتماد تھا۔ کچھ شہرت بھی حاصل تھی۔ شیوا.جی سے ان کی ملاقات آداب دربار کے مطابق نہ ہوئی۔ یہ کسی مندر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شیوا.جی وہاں پوجا کرنے آیا۔ انھوں نے اسے پہچانا نہیں۔ لیکن اپنا تعارف کہ دیا شیوا.جی نے کچھ سننے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے شیوا.جی کی شان میں ایک کبت کہا تھا۔ اُسے پڑھا۔ شیوا.جی اس کبت سے ایسا محظوظ ہوا۔ کہ دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ بھوشن نے دوبارہ پڑھا۔ تیسری بار فرمائش ہوئی۔ بھوشن نے پھر تعمیل کی۔ غرض شیوا.جی بار بار فرمائش کرتا تھا۔ اور بھوشن بار بار سناتے تھے لیکن انیسویں باران کے تحمل نے جواب دے دیا۔ انھوں نے کچھ جھنجلا کر انکار کر دیا۔ اگر معلوم ہوتا کہ یہی شیوا.جی ہے تو شاید وہ زیادہ صبر سے کام لیتے۔ انکار سن کر شیوا.جی نے افسوس سے کہا تمہاری تقدیر میں اٹھارہ لاکھ روپے ہی بدے تھے۔ ورنہ میں نے تو ارادہ کیا تھا کہ جتنی بار یہ کبت سناؤ گے اتنے ہی لاکھ روپے اور اتنے ہی موضعے عطا کروں گا۔ غرض بھوشن کو اٹھارہ لاکھ روپے اور اٹھارہ موضعے ملے۔ اصل حقیقت روشن ہونے پر بھوشن یقیناً پچھتائے ہوں گے۔ معلوم نہیں یہ روایت کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن اگر صحیح ہے تو شاید شاعرانہ قدردانی کی ایسی مثال دنیا میں اور کہیں نہ ملے گی۔ شیوا.جی جوان باہمت شخص تھا نام ونمود کی تمنا بھی رکھتا تھا۔ ممکن ہے اس فیاضی سے اس نے سارے فرمانروایان ہند کے لیے ایک حد مانع کھڑی کر دی ہو۔ بہر حال شیوا.جی نے بھوشن کے کمال کی قرار واقعی داد دی اور انھیں اپنے دربار کا راج کوی بنایا۔ بھوشن ابھی تک بھاوج کے طعنوں کو بھولے نہ تھے۔ تیغ زبان کا زخم کبھی پر نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں انھوں نے ایک لاکھ روپے کا نمک لے کر بھاوج کے پاس بھیج دیا۔ دیگر اوصاف نیک کی طرح غیرت بھی اعتدال سے گذر کر بغض پروری میں جاملتی ہے۔

شیوا.جی کے دربار میں بھوشن چھ سات برس رہے۔ اور اپنا کمال ممدوح کی قصیدہ گوئی میں صرف کرتے رہے۔ ''شیوراج بھوشن'' ان کی بہترین تصنیف ہے۔ وہ انھیں کبتوں کا مجموعہ ہے۔ وہ اب سرمد شعرائے ہند تھے۔ ان کی شہرت ہر ایک دربار میں پھیل چکی تھی۔ شہرت کے ساتھ دولت اور ثروت بھی حاصل تھی۔ جس کا بالعموم شعرا ہمیشہ رونا رویا کرتے ہیں۔ ساتویں برس وہ وطن کو لوٹے۔ راستہ میں بندیل کھنڈ کے راجہ چھتر سال سے ملاقات کی جو شعر وسخن کا عاشق اور خود بھی خوش گو تھا۔ اُس کے دربار میں بڑے بڑے قادر کلام شاعر موجود تھے۔ بہاری کو بھی تمنائے دادرسی دربار میں کھینچ لائی تھی۔ شاعر کے نزدیک سخن شناس کی دادناشناس کے سیم و زر سے کم نہیں۔ اگرچہ چھتر سال نے بھوشن کو وہ زر و مال نہیں دیا جو شیوا.جی کی سرکار سے ملا تھا۔ لیکن اس نے ان کی خاطر وتواضع بڑے فیاضانہ طریق سے کی۔ اور

شیواجی نے بھوشن کے کمال کی قرار واقعی داد دی اور انھیں اپنے دربار کا راج کوی بنایا۔ بھوشن ابھی تک بھاوج کے طعنوں کو بھولے نہ تھے۔ تیغ زبان کا زخم کبھی پر نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں انھوں نے ایک لاکھ روپے کا نمک لے کر بھاوج کے پاس بھیج دیا۔ دیگر اوصاف نیک کی طرح غیرت بھی اعتدال سے گذر کر بغض پروری میں جاملتی ہے۔

جب وہ چلنے لگے تو اُن کی پالکی کا ڈنڈا اپنے کندھے پر اٹھالیا۔ ان کا یہ اخلاق کریمانہ شیوا.جی کے لاکھوں سے بدرجہا پر اثر ثابت ہوا۔ بھوشن نے چھتر سال کی شان میں جو کبت کہے ہیں وہ زور بیان اور اظہار عقیدت میں شیوا.جی کے تعریفی قصائد سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

کچھ دنوں وطن میں رہنے کے بعد بھوشن کمایوں کے مہاراج کے دربار میں پہنچے اور قصیدہ گذرانا۔ مہاراج نے ان کی آؤ بھگت نہ کی۔ اگرچہ ایک لاکھ انعام پیش کیا۔ لیکن بھوشن ان کی سرد مہری سے ایسے چیں بہ جبیں ہوئے کہ انعام لینے سے انکار کر دیا اور روٹھ کر پھر شیوا.جی کے دربار میں حاضر ہوگئے۔ اس سے اُن کی نازک مزاجی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب شعرا کو ایک ایک کبت کے صلہ میں لاکھوں مل جاتے تھے۔ ایک ایک لاکھ روپیوں پر شعرا لات مار دیتے تھے۔ اور ایک زمانہ یہ ہے جب شاعر کا کلام پڑھنا تضیع اوقات سمجھا جاتا ہے۔ وہ جذبات کا دور تھا۔ لوگ شجاع تھے۔ قدر دان تھے۔ ہنر شناسی کا مادہ موجود تھا۔ اب مادیات کا دور ہے۔ طبیتوں میں ذوق نہیں، درد نہیں۔ جذبہ نہیں۔ شاعر کی داد کون دے۔ اور یہ کچھ ہندوستان کی ہی کیفیت نہیں ہے۔ ساری دنیا میں یہی حال ہے۔ مادیات نے جذبات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ اب ویسے شاعر نہیں رہے۔ لیکن شاعروں کو اسی مادی ناشناسی نے بگاڑا ہے۔ اس کا الزام اس کے سر ہے۔ اب کارآمد لٹریچر کا دور ہے۔ لوہے پر یا ربڑ پر تصانیف کی زیادہ قدر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں حصول دولت میں مدد ملتی ہے۔ ہوس زر نے جذبات حسنہ کا خاتمہ کر دیا۔ اچھے خیال کا احساس باقی نہیں رہا تھیٹروں کا اب بھی لوگوں کو شوق ہے۔ گانا لوگ اب بھی شوق سے سنتے ہیں۔ لیکن یہ کیفیات مادی ہیں۔ ان سے حواس کو حظ ہوتا ہے۔ کسی نازک خیال کا مزہ لینا وجدانی کیفیت پر منحصر ہے۔ وہ اب سلب ہوگئی ہے۔ آیا یہ فقدان انسان کے لیے مفید ثابت ہوگا یا مضر یہ مسئلہ دیگر ہے۔ اس پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جذبات نفسیہ سے عاری قوم دولتمند بن جائے۔ طاقتور بن جائے۔ اعلیٰ دماغ نہیں بن سکتی۔

شیوا.جی کے دربار میں دوبارہ پہنچ کر بھوشن نے پھر وہی قصیدہ گوئی کا شغل اختیار کیا۔ وقتاً فوقتاً کہتے رہے۔ لیکن وہاں مستقل قیام نہیں کیا ان سب کبتوں کا مجموعہ ''شیوا باوونی'' کے نام سے مشہور ہے۔

شیوا.جی نے 1680 میں انتقال کیا۔ بھوشن وطن لوٹ آئے۔ اب بجز راجہ چھتر سال کے ان کا کوئی قدردان نہ رہا کبھی کبھی انھیں کے دربار میں جا کر قصیدے پیش کرتے تھے۔ ان کبتوں کا مجموعہ ''چھتر سال دسک'' کہلاتا ہے۔ ایسے باکمال شاعر کی یادگار یہی باکمال تین مختصر مجموعے ہیں۔ حالانکہ وہ فکر معاش سے آزاد تھے۔ اور ان کے پرواز خیال میں کوئی امر مانع نہیں ہوسکتا۔ بعض سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ اُن کی تصانیف اور بھی ہیں۔ لیکن متذکرہ بالا تین کتابوں کے علاوہ اب تک اُن کی دوسری تصنیف کا سراغ نہیں ملا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد 1708 میں راجہ ساہو جو شیوا.جی کے پوتے تھے۔ قید مغلیہ سے آزاد

ہوئے غالباً بھوشن ان کے دربار میں بھی حاضر ہوئے۔ یہ راجہ شیواجی کی بالکل ضد تھا۔ لیکن بھوشن نے اُسے بھی اُسی نگاہ سے دیکھا۔ اور اس کی شان میں بھی چند کبت کہے۔ اُس نے ان کی خوب قدر کی بےفکر عیش وعشرت کا بندہ شکار کا عاشق راجہ تھا۔ لیکن شان پر جان دیتا تھا۔ عرصہ دراز تک مغلوں کے زیر اثر رہنے کے باعث وہ مغل سلاطین کا حلقہ بگوش بننے میں اپنا فخر سمجھتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی فتوحات کا جوش پیدا ہو جاتا تھا 1716 میں اس نے شمالی ہند کا رخ کیا۔ اس وقت بھوشن نے یہ کبت کہا۔

بلخ بخارے ملتان لون ہر پارے
کپی لون پکارے کوؤ دھرت نہ سار ہے
روم روند ڈارے۔ خراسان کھوند مارے
خاک کھادرلوں جھارے ایسی ساہو کی بہار ہے
ککر لوں ۔ ککرلوں ۔ مکرلوں چلے جات
ٹکر لیو یا کوئی وار ہے نہ پار ہے
بھوشن سروج لوں پراونے پرت
پھیر دلی پرت پرندن کی چھار ہے

اس وقت بھوشن کی عمر 80 سال کے قریب تھی۔
اس کے بعد ان کے کلام کا کچھ پتہ نہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ وہ اس کے بعد زیادہ نہ جیے۔ ان کی جیسی عزت اور ثروت کسی ہندی شاعر کو نصیب نہ ہوئی۔ لیکن ہمارے خیال میں اس کا باعث اُن کا کلام نہیں۔ بلکہ ان کی تملق سازی تھی۔ بہاری نے سات سو لاجواب دوہے کہے۔ لیکن چونکہ انھوں نے اپنے ممدوح راجہ جے سنگھ کی شان میں کوئی تعریفی دوہا نہ کہا۔ اس لیے ان کی ویسی قدر نہ ہوئی۔

بھوشن دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ خوشامد پسند راجے اپنی تعریف سن کر پھولے نہ سماتے تھے۔ ان پر زر وجواہر نثار کرتے۔ بالخصوص شواجی کی قدرشناسی نے انھیں چمکا دیا۔ ان کا وقار قائم کر دیا۔ اس کے بعد وہ جس دربار میں گئے انھیں سر اور آنکھوں پر لیا گیا۔ اعزاز واکرام کی بارش ہونے لگی۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ان کے کلام میں محاسن نہیں۔ اپنے رنگ میں اُن کا کلام لاجواب ہے۔ مگر تعریفی کلام میں شاعرانہ جذبات نہیں ہوتے۔ صرف مبالغہ اور لاف وگزاف کی بھرمار رہتی ہے۔ ہندی کے بیررس کے کبتوں میں شوکت اور رعب قائم کرنے کے لیے کرخت اور ثقیل الفاظ کی کثرت رہتی ہے۔ جیسے خونی اور پُر ہیبت جذبات ہوتے ہیں۔ ویسے ہی سنگ خارا کی طرح الفاظ رکھے جاتے ہیں۔ یہ ایک صنعت ہے۔ لیکن اس کے لیے جذبات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی الفاظ کی۔ یہ ایک محدود میدان ہے اور بڑے سے بڑا شاعر بھی اس رنگ میں تاثیر نہیں پیدا کر سکتا۔ جذبات کے ادا کرنے میں شاعر ساری دنیا کو خطاب کرتا ہے۔ اس لیے ہر خاص و عام کو اس میں لطف آتا ہے۔ تعریفی کلام میں اس کا روئے سخن صرف اپنے ممدوح کی طرف ہوتا ہے اس لیے یہ ایک شخصی امر ہے۔ اس محدود رنگ کو بھوشن نے اور بھی محدود کر دیا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر کبتوں میں شیواجی کی ہیبت اور دھاک ہی کی تعریف کی ہے۔ مدحیہ کلام کا جو عام نقص ہے۔ اُس سے بھوشن کا کلام بھی نہیں بچا وہی ہے جو شیواجی کی۔ ساہو کا رعب داب وہی ہے۔ جو شیواجی کا۔ صرف تبدیل نام کی ضرورت ہے۔ تعریفی کلام میں امتیاز اسی حالت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جب شاعر ظاہر کو چھوڑ کر باطن کی طرف جھکے۔ بھوشن کے شیواجی، چھتر سال، ساہو، رودرام سولنگی میں کوئی تمیز نہیں ہے۔ لیکن تلسی کے رام اور لکشمن، اور بھرت یا سمترا کیکئی اور کوسلیا میں امتیازی خصوصیات موجود ہیں۔ ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھ دینے سے ساری داستان میں انقلاب ہو جائے۔ تاہم بھوشن کے کلام میں قومیت اور ہندوین کی ایسی گہری چاشنی ہے کہ وہ بالکل روکھا نہیں معلوم ہوتا۔ اور ان کا ممروح بھی کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں۔ یہ وہ ہے جس نے ایک بار ہندوؤں کو تباہی سے بچا لیا۔ ہر ایک ہندو کے سینہ میں شیواجی کا ایک خاص احترام اور اس سے ایک خاص عقیدت ہے۔ اس کی تعریف میں شاعر کتنا ہی مبالغہ کرے۔ اُسے کتنا ہی سراہے طبیعت پر گراں نہیں گذرتا۔ انھوں نے شیواجی کی تعریف ذاتی حیثیت سے نہیں کی۔ بلکہ قومی حیثیت سے۔ اور شیواجی ہی پر موقوف نہیں۔ ہر ایک ممدوح کو انھوں نے اسی ہندوانہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ غرض بھوشن کے کبت بیشتر اس منافرت غصہ جذبہ انتقام قومی غرور اور خودداری سے مضمر ہیں جو اس وقت ہندوؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہندوؤں کے نعرہ ظفر ہیں۔ وہ ہر ایک ہندو راجہ جس نے مسلمانوں کے ساتھ معرکے کئے ہوں ان کا ممدوح تھا۔ یہ تقاضا زمانہ تھا۔ بھلا یہ تو شاعر تھے مسلمانوں میں تو مورخین نے بھی ہندوؤں کی مٹی خراب کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

بھوشن کی تصانیف کا کچھ ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان کی یادگار صرف چار کتابیں موجود ہیں (1) شیوراج بھوش (2) شیواا باونی (3) چھتر سال دسک (4) متفرق کبت۔ ان میں اول الذکر ہی تصنیف کہلانے کی مستحق ہے۔ باقی تینوں کتابیں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ ہیں۔ لیکن ہندی میں ان کی خاص عزت اور اہمیت ہے۔ وہ ایک خاص رنگ اور خاص دور کے نمونے ہیں۔ ہم ان میں سے دو ایک کبت نموناً ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:۔

ڈاڑھی کے رکھئن کی ڈاڑھی سی رہت چھاتی
باڑھی مرجاء جس حد ہندوان کی
کڑھ گئی رعیت کے من کی کسک سب،
مٹ گئی ٹھسک تمام ترکان کی
بھوشن بھنت دلی پت دل دھک
دھکا سن سن دھاک سیو راج مردانے کی
موٹی بھئی چنڈی بن چوٹی کے چباے سیس
کھوٹی بھئی سمپت چکتا کے گھرانے کی
دان سمیے دوج دیکھی میتر ہو
کبیر ہو کی سمپت لٹایئے کوہیا للکت ہے
ساہی کے سپوت سیو ساہی کے بدن پر
سیو کی کتھان میں سینہ جھلکت ہے
بھوشن جہان ہندوان کے اُبارنے کو
ترکان مارنے کو بیر بلکت ہے
ساہن سوں لرنے کی چرچا چلت آنی
سرجا کے درگن اوجھا چھلکت ہے
کامنی کنت سوں۔ جامنی چند سوں
دامنی پاوس میگھ گھٹا سوں
کیرت دان سوں۔ صورت گیان سوں
پریت بڑی سنسان مہا سوں
بھوشن بھوشن سوں ترُنی
نلنی نو پوشن دیو پر بھاسوں
جا ہر چار ہو اور جہان
لیے ہندوان کھمان سیوا سوں

نازنین کی شوبھا شوہر سے ہے۔ رات کی چاند سے۔ برسات کے گھٹا کی بجلی سے۔ نام کی سخاوت سے۔ بھگتی کی گیان سے۔ محبت کی عزت ہے۔ حسینہ کی زیور سے۔ کمل کی سورج سے۔ اسی طرح ہندو قوم شیواجی کی بدولت سارے جہان میں نامور ہو رہی ہے۔ ■

(مطبوعہ: 'ترجمان' لاہور، اپریل 1917، ص 161 تا 167)

منشی پریم چند

جنگل میں منگل

دیہی پانڈے موضع مادھوگنج کے ایک غریب برہمن تھے۔ اس پر مصیبت یہ کہ شادی بھی کر چکے تھے۔ بڑی مشکلوں سے روٹیاں نصیب ہوئیں۔ نہ گھر میں اثاثا تھا نہ کھیتی باڑی کرتے۔ نہ علم کا سرمایہ تھا۔ کہ پوتھی پیترے دیکھ کر تباہ کر لیتے۔ مزدوری ہی ایک ذریعہ تھی اور دیہات میں وہ بھی آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ چاہتے تو بھیک مانگ سکتے تھے۔ مگر موٹے تازے آدمی کو بھیک بھی کون دیتا ہے؟ اس پر جہاں جاؤ وہیں پھٹکار۔ بیچاروں کو اکثر فاقے کرنے پڑتے تھے۔ صرف پتر پکش کے دن چین سے کٹتے تھے۔ کبھی پوریاں مل جاتیں کبھی دہی پیڑے۔ سال بھر انہی دنوں کا انتظار کرتے اور دل میں کہتے کہ کاش ایسے دن مہینہ میں دس پانچ بار تو آتے۔ نوکری کی بہت تلاش تھی۔ مگر گھر بار چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتے تھے۔ یہ سہی تھا مگر دھرم کرم کو ہاتھ سے نہیں دیتے تھے۔ کبھی بلا نہائے منھ میں پانی نہ ڈالتے تھے اور روز شیوجی کو جل چڑھاتے۔

ہارے نصیب جاگے۔ مادھوگنج کے علاقہ میں ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ زمیندار ایک متمول سیٹھ تھا جو شہر میں رہتا تھا۔ ایک بار وہ دیہات کی سیر کرنے آیا۔ دیکھا تو جنگل صاف ہوتا جاتا تھا۔ گاؤں کے ہی نہیں آس پاس کے دیگر مواضعات سے لوگ آ آ کر لکڑیاں کاٹ لے جاتے تھے۔ سوکھی لکڑیاں بٹور لے جانے کی تو انھوں نے عام اجازت دے رکھی تھی۔ مگر لوگ ہرے درخت بھی کاٹ لے جاتے تھے۔ سوچ کہ اگر یہی کیفیت رہی تو تھوڑے دنوں میں جنگل کا نام بھی نہ رہے گا۔ اس کی حفاظت کیے بغیر کام نہ چلے گا کسی ہٹے کٹے آدمی کی تلاش ہوئی۔ نظر انتخاب دیہی پانڈے پر پڑی۔ 5 روپیہ تنخواہ مقرر کی اور حکم دیا کہ جسے لکڑیاں کاٹتے دیکھو۔ فوراً گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کردو۔

دیہی پانڈے کے دن پھرے۔ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے۔ اب دیکھوں کون میرے پنجے سے نکل جاتا ہے۔ ایک ایک کو دھر کے بندھوا نہ دیا تو نام نہیں۔ یہ بھر اور پاسی اور چمار جن کو چھونا بھی پاپ ہے۔ مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ اب ایک ایک کی خبر لوں گا۔ اسی گاؤں میں میں دانہ دانہ کو ترستا رہا اور لوگ چین سے کھا کھا کر میٹھی نیند سوتے رہے۔ اب دیکھتا ہوں۔ کون مائی کا لال میرے سامنے اکڑ کر چلتا ہے۔

پانڈے جی اپنے ارادوں کے مضبوط آدمی تھے۔

دوسرے ہی دن وہ صبح سے کندھے پر لٹھ رکھے جنگل میں کسی بھوکے گیدڑ کی طرح منڈلاتے نظر آنے لگے۔ مجال نہ تھی کوئی ان کی خوشنودی حاصل کرلے بغیر ایک پتا بھی توڑ سکے۔ شام کو وہ خوش خوش گھر لوٹتے اور بھنگ گھوٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ جو کسل و ماندگی کے دفعیہ کا ایک نہایت مجرب نسخہ ہے۔

چاروں طرف ہائے وائے کا شور مچ گیا۔ جنگل آپ اجڑتا ہے پر گاؤں کو بساتا ہے۔ اس جنگل سے لوگوں کے کتنے کام نکلتے تھے۔ وہ مویشیوں کا ان داتا تھا۔ وہ ہرے بھرے کھیتوں کو اپنی گود میں لیتا اور انھیں جنگلی جانوروں سے بچاتا۔ گاؤں کے در و دیوار اسی کے سایہ حمایت میں باد و باراں کا مقابلہ کرتے تھے۔ اسی کے فیض عام سے چولھے جلتے تھے۔

برسات کے دن تھے۔ لیکن آسمان پر برکت اور زندگی کی کالی گھٹاؤں کو دیکھ کر لوگوں کے دل سہم جاتے عورتیں لکڑی کے لکڑ ہارے بنا بنا کر آنگن میں کھڑے کرتیں۔ ہرن اور سور لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں اس طرح آزادی سے اینڈنے لگے۔ جیسے کسی فاسق کی آنکھیں حسینوں کی صورتوں پر پھرا کرتی ہیں ہمارے منصوبوں کی طرح گھر کرنے لگے۔

گاؤں کا تو یہ حال تھا۔ لیکن دیہی پانڈے کے گھر روز عید کے جشن ہوتے۔ زمیندار کی یہ ممانعت ان کے لیے دیوتا کا بردان ثابت ہوئی۔ ان کے دروازہ پر ہردم سائلوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا۔ لوگ ان کی بڑائی کرتے۔ مہاراج! نارائن نے آپ کو اتنا درجہ دیا ہے۔ تو ہماری بھی پرورش ہوتی رہے۔ اب آپ ہی کی نگاہ ہوگی تو گاؤں میں بسیں گے۔ آپ ہی ہمارے مالک ہو۔ کوئی گھر کے لیے لکڑی کا سوال کرتا۔ کوئی ہل اور چولہے کے لیے۔ پانڈے جی متکبرانہ انداز سے کہتے بھئی ایک بار تو کہہ دیا کہ لکڑی کاٹنے کا سرکاری حکم نہیں۔ اب کیوں پیچھے پڑے ہو۔ جان کھائے جاتے ہو۔ لکڑی کے بغیر کام نہیں چلتا تو جا کر شہر سے مول لاؤ۔ یہاں ایک پتا بھی نہیں مل سکتا۔ اس پر لوگ اور بھی عاجزی سے منت سماجت کرتے۔ رفتہ رفتہ پانڈے جی کچھ نرم پڑتے پھر کچھ سائیں سائیں باتیں ہوتیں۔ سائل کمر میں ہاتھ لے جا کر کچھ نکالتا۔ تب بادل سے نکل آنے والے آفتاب کی طرح پانڈے جی کا چہرہ کھل جاتا۔ لکڑی کاٹنے کی پروانگی مل جاتی۔

پنڈائن کا دربار الگ لگتا۔ وہاں بھی عورتوں کا میلہ رہتا۔ چاروں طرف سے دعاؤں کی بارش ہوتی۔ کوئی ان کے سہاگ کی داعی تھی۔ کوئی ان کی اولاد کی صورت دیکھنے کے لیے بیقرار۔ اب انھیں چکی پیسنے یا برتن مانجھنے کی ضرورت نہ تھی۔ جس پر ان کی شفقت ہوتی اسے یہ خدمت سپرد ہوتی تھی۔ معمولی کاشتکاروں کی عورتیں دودھ اور دہی لاتیں اور گھنٹوں بیٹھ کر ٹھکر سہاتی کیا کرتیں۔ جس کے بچے کو وہ گود میں لے لیتیں وہ نہال ہو جاتی۔

پنڈائن اب نت نئے روپ بدلتیں۔ ان کے دروازہ پر ہر دم سنار کے ہتھوڑوں کی آواز سنائی دیتی، نئی نئی چال کے گہنے بنتے اور گاؤں کے بزاز کی دکان کے کپڑے پسند نہ آتے۔

پانڈے جی پہلے کسی مجلس احباب میں شریک ہوتے تو خنجری یا کرتال بجایا کرتے تھے۔ اب روز شام کے وقت اپنے چند بے تکلف اور ارادت مند مداحوں کے حلقے میں انداز پرغرور سے بیٹھے ہوئے ہارمونیم کی مشق کیا کرتے۔ اس وقت ایک جم غفیر لگ جاتا۔ لوگ کبھی باجے کی طرف حیرت سے دیکھتے کبھی دیہی پانڈے کی طرف اور آپس میں آنکھیں ملا ملا کر سر ہلاتے۔

دولت حرص کی آگ کا ایندھن ہے۔ جتنا زیادہ ایندھن لگاؤ اتنی ہی دہکتی ہے۔ وہ پانڈے جی جنھیں نان جو بھی ایک نعمت تھی۔ اب بے چپڑی چپاتیاں نہ کھا سکتے تھے صبح اٹھتے ہی کچھ ناشتہ کر کے جنگل کا ایک چکر لگاتے وہاں سے دو چار مجرموں کو پکڑے ہوئے اپنے دروازہ پر آ بیٹھتے۔ ان سے من مانا جرمانہ وصول کرتے۔ پہلے کوئی غریب دکھیا سوال کرتا تو انھیں درد آ جاتا تھا۔ پر اب وہ کسی سے بغیر اپنی نذر و نیاز لیے بات نہ کرتے تھے۔ یہ نشہ یہاں تک بڑھا کہ اکثر وہ رات کو جنگل کی طرف چوروں کی تاک میں نکل جاتے۔ یہ کام اب مالک کا نہیں ان کا اپنا تھا۔ جو لوگ رات کو چوری چھپے لکڑیاں کاٹ لے جاتے تھے انھیں بھی اب پانڈے جی کی آستاں بوسی کرنا پڑی۔ بلی تو چاہے چوہے پر رحم بھی کر جائے پر پانڈے جی کو اپنے شکار پر مطلق رحم نہیں آتا تھا۔ وہ مارتے پیٹتے تھانہ کی دھمکی دیتے اور بغیر جرمانہ لیے گلا نہ چھوڑتے۔ ہاں آن میں ایک وصف یہ تھا۔ کہ اپنے گاؤں والوں پر زیادہ سختی نہ کرتے تھے۔ مگر اس تمام چوکسی اور تندہی اور جان فشانی کا اثر جو کچھ تھا۔ وہ ان کی ذات پر تھا۔ جنگل کی حالت بدستور تھی یا کچھ اور بھی ابتر۔ گو اس کی احتیاط کی گئی تھی کہ جنگل کے بیرونی حصوں پر کلہاڑے نہ چلیں مگر اندر کی طرف قطعے کے قطعے صاف ہو گئے۔ پہلے اس سے ہر خاص و عام کو براہ راست فیض پہنچتا تھا اب پانڈے جی کی معرفت، اس کے سوا اور کوئی فرق نہ تھا۔

اس طرح ایک سال گذر گیا۔ پانڈے جی ہر مہینے سیٹھ چندن داس کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی کار گذاریوں کی داستان سنا آتے سیٹھ جی کو اول تو اپنے کاروبار سے فرصت نہ ملتی تھی دوسرے پانڈے جی پر ایسا یقین آ گیا تھا کہ وہ سال بھر تک نہ آئے مگر چیت کے مہینہ میں تحصیل وصول کا حساب کتاب سمجھنے کے لیے آنا لازمی تھا اور وہ آئے۔ پانڈے جی نے خوب پیش بندیاں کر رکھی تھیں۔ سوچا تھا پہلے تو انھیں ایسی باتوں میں لگاؤں گا۔ کہ وہ جنگل کا رخ ہی نہ کریں اور اگر جائیں گے بھی تو صرف ادھر اُدھر دکھا کے ٹوٹا دوں گا۔ اندر جانے کی نوبت ہی نہ آئے گی سیٹھ جی کے مختار عام اور ان کے چپراسیوں کو پہلے ہی سے ملا رکھا تھا۔ اس وقت سیٹھ جی کے خدمتگار اور رسویں پکانے والے مہراج اور ان کی پوجا پاٹ کے سامان جمع کرنے والے مالی کی خاطر و مدارات کی خوب تیاریاں کر رکھی تھیں۔ پانڈے جی کی اہلیہ نے اپنے ہاتھوں سے خوب دبیز پوریاں پکائی تھیں۔ گجھیاں اور سموسے، سیو بنائے تھے۔ ساری کیسریے رنگ میں رنگائی تھی۔ بھلا جب وہ گہنے پاتے پہن کر زعفرانی ساری میں چمکتی ہوئی تھال میں جیونار لیے ہوئے ان بن بلائے مہمانوں کے سامنے آئیں گی اور گھونگھٹ کی آڑ سے جھانک کر مسکرائیں گی تو کیا وہ بن داموں غلام نہ ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ پانڈے جی نے گاؤں کے دو تین معززین کو سکھا رکھا تھا۔ کہ جب موقع ملے۔ ان کی دیانت اور مشقت کی تعریف کے پل باندھ دیں۔ اس طرح پانڈے جی نے اپنی محافظت کا پورا انتظام کر لیا تھا۔

مگر ''کرم لیکھ نہیں مٹتے کرے کوئی لاکھوں چترائی''

سیٹھ چندن داس شام کو ہوا خوری کرنے چلے۔ انھیں ضعف ہاضمہ کی شکایت تھی اور معمولاً ٹہلا کرتے تھے۔ پانڈے جی کے ہوا خواہوں نے کہا یہاں حضور کے سیر کرنے کے قابل جگہ کہاں چاروں طرف کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے۔ مگر جب یہ عذر بار بار پیش کیا گیا۔ تو سیٹھ جی کو شبہ ہو گیا۔ گھومنے نکل پڑے۔ کھیتوں اور باغوں میں گھومتے گھامتے کھلہانوں میں کسانوں سے بات چیت کرتے وہ جنگل کی طرف چلے۔ پانڈے جی اور ان کے ہوا خواہ ساتھ ساتھ تھے۔ جنگل کے قریب جا کر دیکھا۔ تو سارے درخت ہرے بھرے نظر آئے۔ سبز پوش تناور سپاہیوں کی لمبی قطار شانوں سے شانے ملائے کھڑی تھی پامالی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ سمجھا کہ پانڈے کارگذار آدمی ہے اور خوب نگرانی کی ہے۔ قریب تھا کہ دل میں یہ رائے قائم کیے ہوئے وہ اپنے فرودگاہ کی طرف چلیں کہ پانڈے جی کی شومی تقدیر نے زور کیا۔ جنگل میں سے بھیڑوں اور بکریوں کا ایک جھنڈ نکلتا ہوا نظر آیا۔ سیٹھ جی کو تعجب ہوا کہ ایسے گنجان درختوں میں اس گلہ کو چرنے کی جگہ کہاں مل گئی۔ جہاں سے یہ گلہ نکل رہا تھا۔ اُدھر لپکے اور قریب جا کر اندر کی طرف گھسے تو باوجود شام ہو جانے کے روشنی نظر آئی اور اندر داخل ہوئے تو جا بجا کٹے ہوئے درختوں کے ٹھونٹھ نظر آئے۔ ذرا اور گھسے تو قطار کی قطار صاف دکھائی دی۔ پانڈے جی دم بخود ست پٹائے ہوئے ذرا دور کھڑے تھے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اپنی قسمت کو کوس رہے تھے اور اس گڈریے کو دل میں ہزاروں گالیاں دے رہے تھے۔ کیسی آسانی سے بلا ٹلی جاتی تھی۔ مگر اس پاپی دشٹ نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ مجھے بھی پہلے نہ سوجھا نہیں تو آج منع کر دیا ہوتا کہ جنگل میں بکریاں نہ لانا۔ پر اب تو پھنس گئے۔ بھگوان، دینا ناتھ، دین بندھو اس وقت میری مدد کرو۔ مہابیر سوامی! پار لگاؤ۔

دفعتاً سیٹھ جی نے ان کی طرف غصے کی نگاہ سے دیکھ کر سخت لہجہ میں کہا ''یہ درخت کیونکر کٹ گئے؟''

ہوا خواہوں نے یہ نقشہ دیکھا تو اور دبک گئے۔ شاعر کہہ گیا ہے۔ مصیبت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ بھرے ہوئے گھڑے پر پھول چڑھتا ہے۔ خالی گھڑے کی طرف دیکھنا منع ہے۔ پانڈے جی کو جواب دینا پڑا کانپتے ہوئے بولے ''ہجور! نارائن جانتے ہیں کہ میں نے کیسی چوکسی کی ہے۔ لیکن سرکار! دھرماوتار! یہاں کے لوگ بڑے چور ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ رات کو آ کر کاٹ لے گئے ہیں۔''

سیٹھ جی نے ڈپٹ کر کہا ''تم کس مرض کی دوا ہو؟ کیا تمھیں دروازے پر آرام سے تکیہ لگائے بیٹھے رہنے کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ رات کو اس طرح جنگل میں گھس کر کوئی لکڑی نہیں کاٹ سکتا۔ یا تو تم بھنگ کھا کر مست پڑے رہتے ہو۔ یا یہ سب تمھارے ہی کرتوت ہیں۔ تم نے مجھے لوٹ کر اپنا گھر بھرا ہے۔''

یہ کہہ کر سیٹھ جی نے جنگل کے پامال قطعوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ پھر پارہ چڑھا۔ گرج کر بولے ''تم نے مجھے بالکل بدھو سمجھ لیا کیوں؟ میں نے تمھارا اعتبار کیا۔ اس کا تم نے مجھے یہ بدلہ دیا ہے۔ میری آنکھوں میں خاک ڈالنے کے لیے سامنے ٹٹی کھڑی کر دی ہے۔ اور اس کی آڑ میں یہ شکار کھیلے ہیں۔ اسی دو تین بیگھہ میں کم سے کم 100 درخت کٹے ہوئے ہیں سارے جنگل میں معلوم نہیں کتنے کٹ گئے ہوں گے۔ یہ سب تمھاری شرارت اور بے ایمانی ہے۔ کہاں گیا مختار! ادھر آؤ کل سویرے تم سارے کٹے ہوئے پیڑوں کا شمار کرو۔ کتنے ساکھو کے ہیں، کتنے مہوئے کے، کتنے جامن کے۔ بے ایمان کا سر کچلنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اپنے

سپاہیوں کو حکم دو کہ وہ اس گاؤں میں اور قریب کے دوسرے گاؤں میں جا کر سب کو اطلاع دے دیں کہ جس نے جنگل سے لکڑی کاٹی ہو۔ وہ میرے سامنے حاضر ہو کر صاف صاف بتلائے۔ ورنہ بری طرح پیش آؤں گا۔"

یہ کہہ کر سیٹھ جی غصے میں بھرے ہوئے ڈیرے کی طرف چلے۔ ان کے پیچھے مختار صاحب تھے۔ پانڈے جی کے ہوا خواہوں میں کسی کو پتہ نہ تھا۔ وہ اکیلے بادل بریاں وچشم گریاں اپنی غلطی اور حماقت پر کف افسوس ملتے فکر عمیق میں غوطے کھاتے چلے آتے تھے۔

گاؤں میں تہلکہ پڑ گیا۔ پنڈائن نے یہ کیفیت سنی تو رونے لگیں۔ کتنی محنت سے سموسے اور پوریاں بنائی تھیں۔ دیوی کی مانتا کی۔ مہابیر سوامی کو لڈو چڑھانے کی دعوت دی۔ رات بھر میاں بیوی جاگتے رہے کہاں روز چین سے بھنگ کے نشہ میں مست ہارمونیم بجایا کرتے تھے۔ کہاں آج یوں، رونی صورت بنائے پڑے ہیں۔ بار بار یہی پچھتاوا ہوتا ہے کہ گڈریے کو منع کیوں نہ کر دیا تھا۔ ہوا خواہوں میں کسی کی صورت نہ نظر آتی تھی۔

صبح ہوتے ہی سپاہی دوڑے اور سیٹھ جی کا حکم سنایا۔ دس بارہ گاؤں ملحق تھے۔ ہر ایک گاؤں سے خطاواروں کی قطاریں آنا شروع ہوئیں سیٹھ جی پر بلا کسی تردد کے ساری حقیقت روشن ہو گئی۔ اس وقت لوگوں کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ پانڈے جی کی حمایت کون کرتا۔ اسی اثناء میں مختار صاحب نے آ کر کٹے ہوئے درختوں کی تعداد بتائی۔ سیٹھ جی سکتے میں آ گئے۔ ایک ہزار! لمبی سانس لی۔ اور اٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگے۔ تب متانت سے بولے۔ "اس شخص نے تو مجھے تباہ کر دیا۔ کم سے کم 5000 کا چرکا دیا۔ اچھا کوئی مضائقہ نہیں۔"

لکڑی کاٹنے والوں کے بیانات موجود تھے۔ فوراً بگھی تیار کروائی۔ پانڈے جی دروازہ پر کھڑے رو رہے تھے۔ سمجھ گئے۔ کہ گلے پر چھری چلنے والی ہے۔ دوڑے اور سیٹھ جی کے پاؤں پر گر پڑے۔ پنڈائن بھی ایک بوسیدہ ساری پہنے دست بستہ کھڑی تھیں۔ رو کر سیٹھ جی سے بولیں۔ دھرماوتار! ہم گریب باہمن مر جائیں گے۔ ہمارے اوپر دیا کی جائے۔ سیٹھ جی غصہ سے لال ہو رہے تھے ایک نہ سنی۔ دم کی دم میں بگھی ہوا ہو گئی اور اسی کے ساتھ پانڈے جی کی امیدیں بھی ہوا ہوئیں۔

دوسرے ہی دن مقدمہ دائر ہو گیا۔ گاؤں میں داروغہ آ گئے۔ بیانات لیے۔ تلاشیاں لیں۔ گواہ لیے۔ پانڈے جی کو حراست میں لے لیا اور جو کچھ نقد ملا وہ بھی لے کر رخصت ہوئے۔ کتنا دردناک نظارہ تھا۔ پانڈے جی ہائے ہائے کرتے تھے۔ پنڈائن پچھاڑیں کھا کھا گرتی تھیں۔ بوڑھی عورتیں جابجا بیٹھی ہوئی سائیں سائیں باتیں کر رہی تھیں۔ بہوئیں جھروکے سے یہ نظارہ دیکھتی تھیں۔ گاؤں کے ذی وقار لوگ از راہ ہمدردی پانڈے جی کو سمجھا رہے تھے۔ چار دن کی چاندنی آ گئی اور چلی گئی۔ پھر وہی اندھیرا پاکھ آیا۔ پہلے سے کہیں زیادہ اندھیرا! کہیں زیادہ خوف ناک خوشحالی کی چند روزہ جھلک نے مصیبت کی سیاہی کو اور بھی زیادہ سیاہ کر دیا۔

معینہ تاریخ کو پانڈے جی کا مقدمہ پیش ہوا۔ مجسٹریٹ صاحب کٹگھروں کے بیچ میں اس طرح اکڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے شیر پنجرے میں۔ سامنے پانڈے جی بہت کڑیاں پہنے رونق افروز تھے استغاثہ کی طرف سے پیروی کے لیے وکیلوں کا ایک قافلہ تھا۔ پانڈے جی کی طرف سے ایک بوڑھے مختار صاحب کھڑے تھے۔ استغاثہ کی طرف سے شہادتیں گذریں۔ کسی نے کہا میں نے جنگل سے دو ساکھو کے پیڑ پانڈے جی کے حکم سے کاٹے اور انھیں 5 روپیہ نذرانہ دیا۔ کسی نے ایک ہی درخت کاٹنا تسلیم کیا۔ ایک صاحب نے اپنا گھر بنانے کے لیے 50 رخت کاٹے اور پورے 100 روپے پانڈے جی کی نذر کیے۔ پانڈے جی کے چند ہمدم وہمنشیں حضرات بھی شہادت میں طلب ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا۔ صاحب ہم نے پانڈے جی کو اپنی آنکھوں سے روپیہ لیتے تو دیکھا نہیں پر سنا ہے کہ لیتے تھے۔ بوڑھے مختار صاحب ہر ایک گواہ سے جرح کے سوالات کر کے پانڈے جی سے اس کی مخالفت اور معاندت اور سیٹھ جی سے غرضمندانہ تعلق ثابت کرنا چاہتے تھے۔ پر ان کی مساعی جمیلہ کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ ایک گواہ بھی نہ بگڑا۔

ان گواہوں کے بیانات ختم ہو گئے۔ تو مجسٹریٹ نے پانڈے جی سے اپنی صفائی پیش کرنے کا حکم دیا۔ مگر وہاں صفائی کہاں تھی۔ پنڈائن جی گھر کا سب اثاثا لے کر میکے جا چکی تھیں۔ پانڈے جی بڑے زور سے رو کر بولے "دھرماوتار! سرکار کے ہاتھ میں کلم ہے جو چاہیں کریں۔ گریب باہمن ہیں۔ چھوٹ جائیں گے تو کہیں مانگ کھائیں گے کید ہو گئے۔ تو ہجور ہمارے بال بچے سب بھوکوں مر جائیں گے۔ دین بندھوا ہمارے اوپر دیا کی جائے۔ ہم اناتھ ہیں۔ ہم سے بڑا کسور ہوا۔ اب کی جان بکسی ہو جاوے اب ہم کبھی بے ایمانی کے کنارے نہ جائیں گے۔ سرکار ہمارے اوپر اتنی نگاہ ہو جائے۔"

یہ کہہ کر وہ بآواز بلند رونے لگے۔

مجسٹریٹ نے دل میں سوچا۔ اس غریب پر سختی کیوں کی جائے۔ میں ہزاروں تعلیم یافتہ بڑی بڑی تنخواہ والوں کو جانتا ہوں وہ رشوتیں لیتے ہیں اور کوئی ان کا کچھ نہیں کرتا۔ ان پر بڑی بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ ان کے بڑے بڑے اختیارات ہیں۔ مگر ان میں ایسے کتنے ہیں۔ جو اپنی ذمہ داریوں اور اختیاروں کے دیانت مندانہ استعمال پر قانع ہوں گے۔ شاید بہت کم! جب وہ اپنی اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ اخلاقی احساس کے باوجود ڈگمگاتے ہیں اور منھ کے بل گر پڑتے ہیں تو ایک لٹھ گنوار کریا اچھر بھینس برابر دہقان کے ساتھ قانونی برتاؤ کرنا سراسر بے انصافی اور بے رحمی ہے۔ ہمارے عمال بھی گلا دباتے ہیں اور خون چوستے ہیں۔ پر کلوروفارم دے کر عیب کو ہنر کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ ان کی اعلیٰ تعلیم کی برکت ہے۔ اس غریب نے عیب کیا پر کرنا نہ جانا۔ اگر وہ اس فن میں ہمارے عمال کی چند روز شاگردی کر لیتا تو آج کون تھا۔ جو اسے قانون کے پنجہ میں پھنسا سکتا۔

سیٹھ جی اجلاس کے قریب کھڑے تھے۔ مجسٹریٹ نے ان سے پوچھا۔

"آپ چاہتے ہیں۔ کہ ملزم کے ساتھ قانون کا پورا برتاؤ کیا جائے؟"

سیٹھ جی نے عرض کی "جیسی حضور کی منشا ہو۔ مجھے حضور کے فیصلہ پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

مجسٹریٹ صاحب نے زیادہ گفتگو نہ کی۔ فیصلہ سنانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ کمرہ میں بے جان خموشی چھا گئی۔ پانڈے جی کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا۔ گویا ہونٹوں تک آ جائے گا۔ صاحب بہادر نے فیصلہ سنایا۔

"میں ملزم کو رہا کرتا ہوں اور اسے تاکید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ اس قسم کا موقع نہ دے۔ ورنہ کوئی رعایت نہ کی جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے سرقہ اور غبن اور بیجا تصرف سب کچھ کیا۔ پر وہ ناخواندہ جاہل گنوار ہے اور ایسی حالت میں سزا کی بجائے ہمدردی کا زیادہ مستحق ہے۔"

(مطبوعہ: 'ترجمان' لاہور، نومبر 1916، ص 219 تا 225)

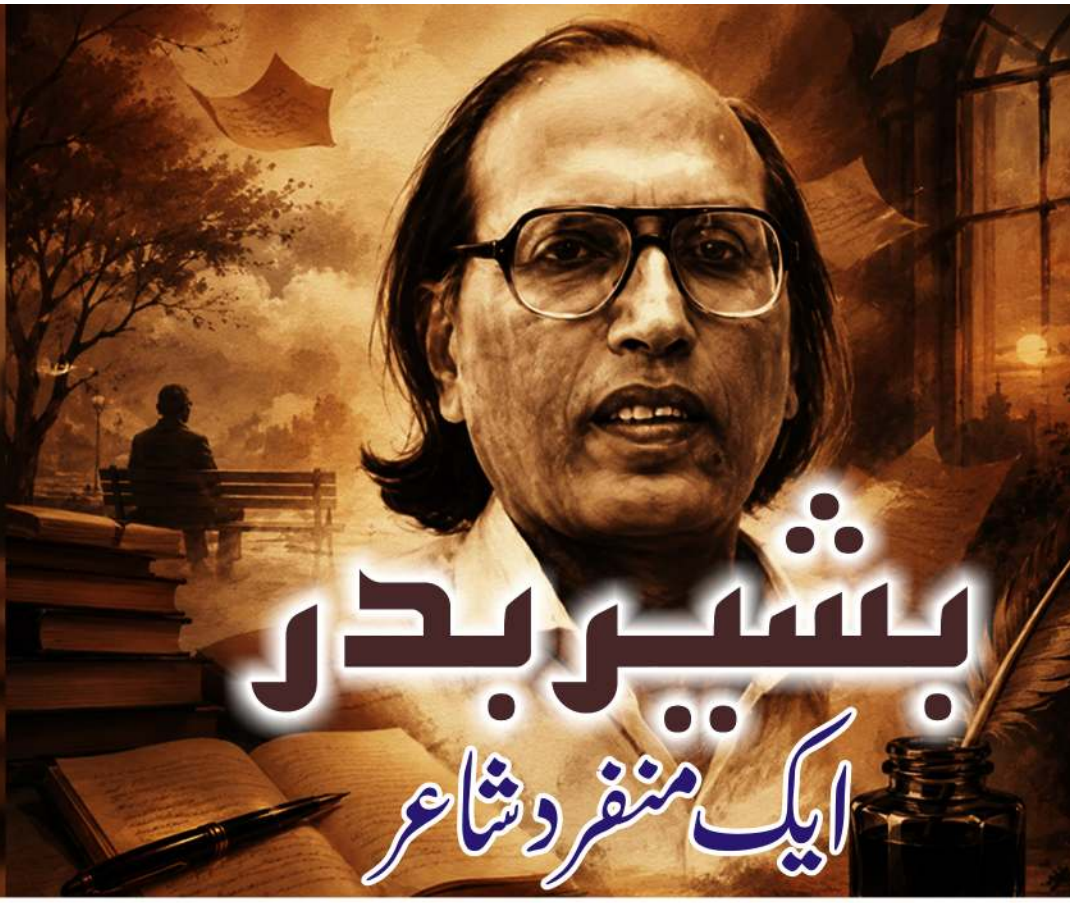

بشیر بدر
ایک منفرد شاعر

احمد نثار

بشیر بدر کا شمار جدید اردو غزل کے اُن ممتاز شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے محبت، تنہائی، انسانی رشتوں اور زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کو نہایت سادہ، دل نشین اور عام فہم انداز میں بیان کیا۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی غزل کی لطافت کے ساتھ جدید احساسات کی آمیزش ملتی ہے، جس کی وجہ سے وہ عوام اور خواص دونوں میں یکساں مقبول ہوئے۔

بشیر بدر کی غزلوں کا سب سے نمایاں وصف سادگیِ بیان، موسیقیت اور فکر کی گہرائی ہے۔ ان کے اشعار روزمرہ زندگی کے تجربات سے جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور قاری کے دل پر براہِ راست اثر ڈالتے ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کو ایک نئی زبان اور نیا لہجہ عطا کیا، جس کے باعث انھوں جدید غزل کے اہم ترین نمائندہ شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ بشیر بدر کا نام محبت، تہذیب اور نرمی کے استعارے کے طور پر جگمگاتا ہے۔ وہ شاعر جس نے غزل کو صرف ایک صنفِ سخن نہیں، بلکہ دلوں کے درمیان خاموش ربط کی زبان بنا دیا۔ بشیر بدر صرف ایک شاعر نہیں، ایک عہد کی علامت ہیں، ایک ایسا عہد جو وقت کے گرداب میں گم ہوتا جا رہا ہے، لیکن جس کی خوشبو ان کے اشعار میں محفوظ ہے۔

بشیر بدر کا اصل نام سید محمد بشیر ہے۔ ان کی پیدائش 15 فروری 1935 کو فیض آباد، اتر پردیش (ہندوستان) میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی، جہاں سے انھوں نے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد تعلیم و تدریس کو پیشہ بنایا اور مختلف جامعات میں اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ میرٹھ کالج میں سترہ سالوں تک ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ رہے۔ پہلی بیوی سے ان کی تین اولادیں ہیں، سید نصرت بدر، سید معصوم بدر اور بیٹی صبا بدر۔ ڈاکٹر راحت بدر ان کی دوسری منکوحہ ہیں ان سے ایک بیٹا سید طیب بدر ہے۔

> بشیر بدر کا نام محبت، تہذیب اور نرمی کے استعارے کے طور پر جگمگاتا ہے۔ وہ شاعر جس نے غزل کو صرف ایک صنفِ سخن نہیں، بلکہ دلوں کے درمیان خاموش ربط کی زبان بنا دیا۔ بشیر بدر صرف ایک شاعر نہیں، ایک عہد کی علامت ہیں، ایک ایسا عہد جو وقت کے گرداب میں گم ہوتا جا رہا ہے، لیکن جس کی خوشبو ان کے اشعار میں محفوظ ہے۔

ان کی زندگی میں ایک کربناک موڑ میرٹھ فسادات کے دوران آیا، جب ان کا مکان جلا دیا گیا اور ان کے بیش قیمت مسودات تباہ ہوگئے۔ بعد میں وہ بھوپال منتقل ہوگئے۔ انھیں پدم شری سمان (1999) اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (اردو) 1999 سے نوازا گیا۔ ان کے اشعار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وودھ بھارتی نے اپنے ایک ریڈیو پروگرام کا نام ''اجالے اپنی یادوں کے'' رکھا تھا۔

بشیر بدر کی شخصیت میں ایک عجیب کشش تھی۔ وہ جب مشاعروں میں کلام پڑھتے تھے تو سامعین صرف ان کے الفاظ نہیں، ان کی شخصیت کی تہذیبی خوشبو بھی محسوس کرتے تھے۔ ان کے لہجے میں دبے دبے دکھ، نرم احتجاج، اور مخلص جذبات کی جو آمیزش ہوتی تھی، وہ آج کے شور شرابے میں ایک نایاب نعمت لگتی ہے۔

ان کی سادہ، شستہ اور عام فہم زبان نے انھیں نہ صرف خواص کا شاعر بنایا بلکہ عوام کا دل بھی جیت لیا۔ ان کے اشعار سوشل میڈیا کی دنیا سے لے کر چائے

خانوں کی گفتگو تک، ہر جگہ گونجتے ہیں۔ لیکن اس مقبولیت کے پیچھے جو شخصیت ہے، وہ کئی زخموں، کئی خوابوں، اور کئی ادھورے وعدوں سے بنی ہوئی ہے۔

فسادات، جلا ہوا مکان، ضائع شدہ مسودے، اور پچھتاووں کی دھند میں لپٹی ان کی زندگی، دراصل ایک کبھی نہ ختم ہونے والی غزل ہے۔ ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی، وہ دراصل ایک گہری خاموشی کا پردہ ہوتا تھا۔

بشیر بدر نے اردو غزل کو ایک نئی فکری بے چینی، داخلی کرب اور وجودی اضطراب عطا کیا۔ ان کی شاعری صرف محبت کی داستان نہیں بلکہ انسان کے ٹوٹتے ہوئے باطن، سماجی بے معنویت اور تہذیبی زوال کا نوحہ ہے۔

بشیر بدر کی انفرادیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے روایت سے بغاوت بھی کی اور اسی روایت کے اندر رہ کر اظہار کی نئی جہتیں بھی پیدا کیں۔ ان کے یہاں کلاسیکی لفظیات بھی ہیں اور جدید عہد کی شکست و ریخت بھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری نوجوان نسل کے دل و دماغ پر غیر معمولی اثر رکھتی ہے۔ ان کے اشعار میں جو اداسی، بے یقینی اور خود کلامی پائی جاتی ہے، وہ دراصل موجودہ انسان کی داخلی کیفیت کی ترجمان ہے۔

بشیر بدر کا شعری اسلوب بے ساختگی، فکری گہرائی اور طنزیہ تلخی سے عبارت ہے۔ وہ محبت کو محض رومانوی جذبہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے انسانی محرومی اور روحانی خلا کے استعارے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں شکست بھی ہے، انکار بھی، احتجاج بھی اور خود احتسابی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری قاری کو محض لطف نہیں دیتی بلکہ اسے اپنے وجود کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ بشیر بدر نے معاشرتی منافقت، مذہبی جمود اور فکری سطحیت پر جس جرات کے ساتھ سوال اٹھائے، وہ اردو شاعری میں کم کم دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک ایسا ذہن بولتا ہے جو مسلسل اضطراب میں مبتلا ہے، جو خود سے بھی مطمئن نہیں اور دنیا سے بھی۔ اسی داخلی کشمکش نے ان کے فن کو غیر معمولی تاثیر عطا کی۔

بشیر بدر کی شخصیت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ شاعری صرف الفاظ کا کھیل نہیں، احساس کا آئینہ ہے۔ وہ ان معدودے چند شعرا میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کو جیا بھی، جھیلا بھی، اور جلا بھی بخشی۔ ان کی شاعری میں جو "فاصلوں کا ادب" ہے، وہ محض دنیاوی فاصلے نہیں بلکہ رشتوں، وقت، اور تہذیب کے درمیان بڑھتی خلیج کا اظہار یہ ہے۔

"یہ نئے مزاج کا شہر ہے، ذرا فاصلے سے ملا کرو" یہ مصرع صرف ایک تنبیہ نہیں، بلکہ بشیر بدر کی تہذیبی بصیرت کا بیان ہے۔

آج جب شاعری، مشاعروں اور میڈیا میں شور اور نمائشی پن کا غلبہ ہے، تو بشیر بدر جیسے شعرا کی شخصیت اور شاعری ایک خاموش شائستگی کی آخری مثال معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اشعار میں جو "تمہیدِ گفتگو" ہے، وہ ہماری کھردری زبان، بکھرے احساسات، اور الجھے رشتوں کو سلجھاتی ہے۔

بشیر بدر کی شخصیت پر لکھنا، دراصل ایک تہذیب کے رخصت ہونے پر آنکھ نم کرنا ہے۔ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی شاعری ہمیں آنے والے زمانوں کے لیے ادب، اخلاق اور احساس کی روشنی دے رہی ہے۔

بشیر بدر اردو غزل کے اُن منفرد شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے رومان، احساس، تہذیبی دکھ اور جمالیاتی شعور کو ایک دلکش اور سادہ پیرایۂ اظہار دیا۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں اردو غزل کو نئی جمالیات، نئی زبان اور نیا تجربہ دینے والے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی غزل نہ صرف روایتی حسن سے مزین ہے بلکہ عہدِ جدید کی روح سے بھی ہم آہنگ ہے۔

بشیر بدر کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل کو عوامی سطح پر مقبول بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ 'اکائی'، 'امیج'، 'آس'، 'آمد' ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آئے جنھیں زبردست عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ" اور "بیسویں صدی میں غزل" ان کی غزلوں کی تنقید پر لکھی گئی بہترین کتابیں ہیں۔

بشیر بدر کی غزل میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے سادگی میں گہرائی، اور روزمرہ زبان میں غیر معمولی فکری لطافت۔ وہ نہ فلسفے کے بھاری بھرکم جال میں قاری کو الجھاتے ہیں، نہ کلاسیکی تلمیحات سے بوجھ ڈالتے ہیں۔ اس کے برعکس، وہ دل کے نرم جذبات کو بڑی خوبصورتی اور نرمی سے پیش کرتے ہیں۔

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے، ذرا فاصلے سے ملا کرو
ہم بھی دریا ہیں ہمیں اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف بھی چل پڑیں گے راستہ ہو جائے گا

یہ اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ بشیر بدر عصری حساسیت اور تہذیبی تبدیلیوں کے شناور شاعر ہیں۔

محبت اور رومان ان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے، لیکن وہ محبت کو صرف جذباتی وابستگی تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ اس کے سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ بشیر بدر کی غزلوں میں ہمیں بارہا ایک ٹوٹتی

بشیر بدر کی شخصیت پر لکھنا، دراصل ایک تہذیب کے رخصت ہونے پر آنکھ نم کرنا ہے۔ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی شاعری ہمیں آنے والے زمانوں کے لیے ادب، اخلاق اور احساس کی روشنی دے رہی ہے۔

ہوئی تہذیب، اجڑتے رشتے، اور اکیلے پن کا احساس ملتا ہے۔ وہ نئی زندگی کے پیچ وخم کو بہت نرم لہجے میں بیان کرتے ہیں، جس میں نہ احتجاج ہے، نہ خطابت، بلکہ ایک نرماہٹ سے بھرا طنز ہے۔

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

بشیر بدر نے اردو اور ہندی کے امتزاج سے ایسی زبان پیدا کی جو عام قاری کے دل تک پہنچتی ہے۔ ان کے کئی اشعار ہندی بولنے والوں میں بھی یکساں مقبول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری مشاعروں، فلموں، نغموں اور عام گفتگو میں بھی جگہ پا گئی ہے۔

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا
کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

نقادوں کی اکثریت بشیر بدر کو جدید اردو غزل کا نمائندہ شاعر مانتی ہے۔ بشیر بدر نے اردو غزل کو ایک نئی عوامی زندگی بخشی ہے، جو نہ صرف کلاس روم میں پڑھی جاتی ہے بلکہ بازار میں، چائے خانوں میں، سوشل میڈیا پر بھی زندہ ہے۔ ان کی شاعری کو بعض تنقید نگاروں نے ''زیادہ سادہ'' کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی، لیکن وقت نے ثابت کیا کہ عوامی رسائی اور جمالیاتی تاثر کسی بھی شاعر کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

ان کے کئی اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے
گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا
میں ترے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں
کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے

بشیر بدر کے یہاں جو چیز انھیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے، وہ اُن کے ہاں استعاروں کا بھرپور اور تخلیقی استعمال ہے۔

مری نگاہ مخاطب سے بات کرتے ہوئے
تمام جسم کے کپڑے اتار لیتی ہے

''کپڑے اتار لینا'' ایک استعارہ ہے جس کے ذریعے داخلی حقیقت کو برہنہ کرنے کا تصور جھلکتا ہے۔ شاعر نے اپنی نظر کے اثر کو حد سے بڑھا کر بیان کیا ہے، تا کہ اس کی شدت اور اثر پذیری واضح ہو۔ یہاں بصارت اور مکالمہ دونوں کا امتزاج ایک جاندار تصویر پیدا کرتا ہے۔

یہ شعر روایتی غزل یا کلاسیکی انداز سے ہٹ کر جدید اردو شاعری کی جرأت، نفسیاتی تہہ داری اور علامتی اسلوب کو اپناتا ہے۔ جسمانی عریانی کا ذکر دراصل سماجی ونفسیاتی برہنگی کے لیے کیا گیا ہے، جو قاری کو چونکانے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

بشیر بدر نے اردو غزل کو ایک نئی عوامی زندگی بخشی ھے، جو نہ صرف کلاس روم میں پڑھی جاتی ھے بلکه بازار میں، چائے خانوں میں، سوشل میڈیا پر بھی زندہ ھے۔ ان کی شاعری کو بعض تنقید نگاروں نے ''زیادہ سادہ'' کهه کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی، لیکن وقت نے ثابت کیا که عوامی رسائی اور جمالیاتی تاثر کسی بھی شاعر کی سب سے بڑی کامیابی ھے۔

یہ شعر ایک نفسیاتی اور علامتی بیان ہے کہ شاعر کی گہری، کھوجتی ہوئی نگاہ مخاطب کی تمام نقابیں اور سماجی پردے ہٹا دیتی ہے، اور اس کی اصل حقیقت کو سامنے لے آتی ہے۔ اس میں جرات، علامت اور داخلی بصیرت کا خوبصورت امتزاج ہے۔

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو نفرتیں
آج انسان کو محبت کی ضرورت ہے بہت

یہ شعر ایک نہایت بامعنی اور عصری حسیت رکھنے والا پیغام دیتا ہے۔ شاعر نے نفرت اور محبت کو مرکزی استعارے کے طور پر برتا ہے۔ یہ ایک سماجی وانسانی پیغام ہے کہ موجودہ دور میں نفرتوں کو ختم کرنا اور محبت کو فروغ دینا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

''سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو'' ایک علامتی اور تصویری پیکر (Imagery) ہے، جو نفرت کو کسی مادی شے کی طرح بند کرنے اور مٹی تلے دفن کرنے کا عمل ظاہر کرتا ہے۔ ''سات'' کا عدد محض گنتی کے لیے نہیں بلکہ تکمیل اور تاکید کے لیے آیا ہے، گویا شاعر نے نفرت کو ختم کرنے کے لیے حد سے زیادہ احتیاط اور پوری قوت صرف کرنے کی تاکید کی ہے۔

عصری تناظر میں یہ شعر ہمارے موجودہ عالمی اور قومی حالات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ سیاسی، مذہبی، اور سماجی تقسیم نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے۔ شاعر اس رویے کو بدلنے کی تلقین کر رہا ہے۔

یہ شعر نہ صرف ایک اخلاقی نصیحت ہے بلکہ سماجی اصلاح کی دعوت بھی ہے۔ شاعر کی زبان سادہ مگر پُر اثر ہے، اور اس میں تخیل وعلامت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ پیغام واضح، آفاقی اور ابدی ہے۔

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی،
جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انھیں کچھ ہنسی آ گئی
بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

یہ شعر جمالیاتی اور جذباتی تاثر دونوں اعتبار سے نہایت خوبصورت ہے، اور اس میں دو بنیادی عناصر نمایاں ہیں۔ تصویریت (Imagery) اور ڈرامائی موڑ (Dramatic Turn)۔

پہلا مصرع آنکھوں اور پلکوں کی ایسی تصویر کھینچتا ہے جو نہ صرف بصری تاثر رکھتی ہے بلکہ حسی وجذباتی اثر بھی پیدا کرتی ہے۔

''آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی'' یہاں آنکھوں کا آنسوؤں سے بھرا ہونا اور پلکوں کا بوجھل وگھنا ہونا ایک دل گرفتہ کیفیت ظاہر کرتا ہے۔ ''جیسے جھیلیں بھی ہوں، نرم سائے بھی ہوں'' یہ تشبیہات حسن کو فطرت کے پُرسکون اور گہرے مناظر سے جوڑتی ہیں۔ جھیلوں کی گہرائی اور نرم سایوں کا سکون ایک ساتھ مل کر آنکھوں میں اداسی اور دلکشی کا امتزاج پیدا کرتے ہیں۔ یہ مصرع قاری کو ایک بصری اور جذباتی تصویر میں لے جاتا ہے۔

دوسرا مصرع اچانک فضا بدل دیتا ہے ''وہ تو کہیے انھیں کچھ ہنسی آ گئی، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے''

یہاں شاعر ایک استعاراتی منظر پیش کرتا ہے، گویا آنکھوں کی کشش اور کیفیت ایسی تھی کہ شاعر خود کو ''ڈوبتا'' محسوس کر رہا تھا، یہ ڈوبنا محبت وکشش میں محو

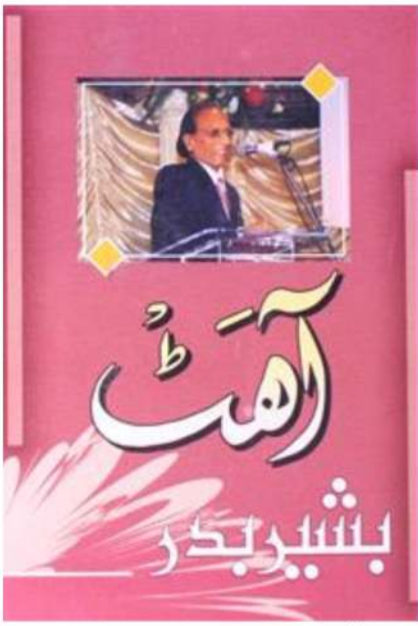

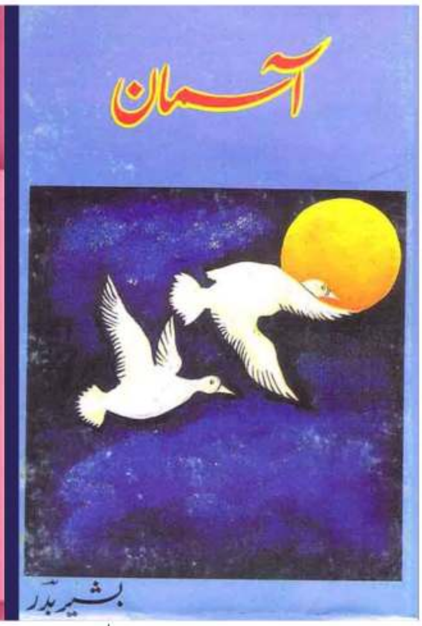

ہونے کا استعارہ بھی ہے اور جذباتی گرفت میں آنے کا اشارہ بھی۔ مگر ''ہنسی آجانا'' اس سنجیدہ اور گمبھیر کیفیت کو توڑ دیتا ہے، اور شاعر اس ''ڈوبنے'' سے بچ نکلتا ہے۔

اس شعر کی سب سے بڑی فنی کامیابی یہ ہے کہ یہ دو مختلف کیفیات کو یکجا کرتا ہے، آنکھوں کو جھیل اور نرم سائے سے تشبیہ دینا۔ ''ڈوبنا'' جذبات میں کھو جانے یا محبت میں گرفتار ہونے کا استعارہ۔ مصرعوں کی ترکیب اور ربط ایسا ہے کہ قاری بہاؤ کے ساتھ چلتا ہے اور آخر میں ایک غیر متوقع موڑ کا لطف لیتا ہے۔

یہ شعر ایک نادر مثال ہے کہ کس طرح حسن کی تصویر، جذباتی گہرائی، اور ہلکی سی شوخی کو ایک مختصر پیرائے میں سمویا جا سکتا ہے۔ اس میں رومانی کشش کے ساتھ ایک لطیف مزاح کا پہلو بھی جھلکتا ہے، جو اسے صرف سنجیدہ یا صرف مزاحیہ نہیں، بلکہ دونوں کا حسین امتزاج بناتا ہے۔

بشیر بدر کے استعارے محض آرائشی نہیں ہوتے بلکہ وہ جذبے اور خیال کی ایسی گاڑھی تہہ پیدا کرتے ہیں جو غزل کے معنی کو وسعت اور گہرائی عطا کرتی ہے۔ ان کے اشعار میں روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزیں، انسانی تعلقات کے پیچیدہ رنگ، اور وقت کے نشیب وفراز استعاروں کے ذریعے ایک علامتی کائنات میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ استعارے قاری کے ذہن میں صرف ایک تصویر نہیں بناتے بلکہ احساسات کا ایک سلسلہ جگا دیتے ہیں، گویا لفظ، منظر اور جذبہ یکجا ہو کر ایک ہم آہنگ تجربہ تخلیق کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر، وہ چاند، بارش، چراغ یا ہوا جیسی اشیا کو صرف فطری منظر کشی کے لیے نہیں برتتے بلکہ ان میں انسانی تنہائی، محبت کی لَو، یا جدائی کی کسک سمو دیتے ہیں۔ ان کا فن یہ ہے کہ ایک عام اور مانوس شے کو غیر معمولی معنویت دے دیتے ہیں۔ یہی فنکارانہ مہارت اُن کے استعاروں کو دیرپا اور قاری کے دل میں نقش کر دیتی ہے۔

بشیر بدر کی شاعری میں استعاروں کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ پیچیدگی کے باوجود سادگی سے سمجھ آجاتے ہیں۔ یہ سادگی فریب دہ ہے، کیونکہ جتنا زیادہ غور کیا جائے، اتنی ہی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری عام قاری کو بھی متاثر کرتی ہے اور سنجیدہ قاری کو بھی طویل فکری سفر پر لے جاتی ہے۔

آج کے دور میں جب غزل میں سطحیت اور براہِ راست اظہار کا رجحان بڑھ رہا ہے، بشیر بدر کے استعارے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ شعر کی اصل قوت لفظ اور معنی کے بیچ پوشیدہ فاصلوں میں ہے۔ اُن کے ہاں یہ فاصلہ کبھی دھندلا سا منظر بناتا ہے، کبھی آئینہ دکھاتا ہے، اور کبھی دل میں ایک سوال چھوڑ جاتا ہے جو برسوں ساتھ رہتا ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ بشیر بدر کے ہاں استعارہ محض ایک شعری تکنیک نہیں بلکہ احساس اور فکر کو بیک وقت سنبھالنے کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ ان کی شاعری کو نہ صرف خوبصورت بلکہ دیرپا اور معنوی طور پر بھرپور بناتا ہے، اور یہی ان کے فن کا اصل کمال ہے۔

بشیر بدر کے اشعار کتابوں کی حدود سے نکل کر محفلوں، گلی کوچوں اور روزمرہ کی گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں۔ بشیر بدر کی شاعری نے جس مقبولیت کا سفر طے کیا، اس کے پس پشت کئی نمایاں عوامل کارفرما ہیں۔

سب سے پہلی وجہ ان کی زبان کا سحر ہے۔ بشیر بدر نے غزل کو عام قاری کے قریب کرنے کے لیے زبان و بیان کو نہایت سادہ، شفاف اور دلکش رکھا۔ ان کے الفاظ میں ادبی لطافت بھی ہے اور عام فہم شیرینی بھی، جو سننے والے کو بلا تکلف متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار نہ صرف ادبی محفلوں میں بلکہ عام نشستوں اور سوشل میڈیا پر بھی گونجتے ہیں۔

دوسری نمایاں خصوصیت ان کا رومان اور انسانی جذبات کو بڑی سادگی سے بیان کرنے کا ہنر ہے۔ وہ عشق، جدائی، امید اور مایوسی جیسے احساسات کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنی کہانی اس میں تلاش کر لیتا ہے۔ ان کے اشعار میں وہ درد اور نرمی ہے جو قاری کے دل تک براہِ راست پہنچتی ہے۔

تیسری اہم وجہ ان کا عصری شعور اور زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھنا ہے۔ بشیر بدر نے صرف روایتی غزل گوئی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے دور کے بدلتے ہوئے سماجی اور نفسیاتی منظرنامے کو بھی اپنی شاعری میں سمویا۔ اس توازن نے ان کی شاعری کو کلاسیکی وقار اور جدید احساس دونوں سے مالا مال کیا۔

میڈیا اور مشاعروں میں ان کی بھرپور موجودگی بھی مقبولیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان کی ترنم بھری آواز، برجستہ جملے اور خوش گفتاری نے سامعین کو مسحور کیا۔ یوں ان کے اشعار صرف کتابوں میں نہیں رہے بلکہ براہِ راست لوگوں کے دلوں میں اتر گئے۔

مختصر یہ کہ بشیر بدر کی مقبولیت کا راز ان کی سادہ مگر گہری زبان، جذبات کی سچی عکاسی، عصری شعور اور ذاتی شخصیت کی کشش میں پوشیدہ ہے۔

بشیر بدر ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو دلوں کی دھڑکن بنا دیا۔ ان کی شاعری میں نرمی ہے، تہذیب ہے، جدت ہے، اور دل کی گہرائیوں سے جڑا ہوا سچ ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو ایک نئی شناخت دی، جس میں نہ صرف روایت کی خوشبو ہے بلکہ زمانے کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔

■

Ahmad Nesar
Mohammad Ali Road, City Colony, By Pass
P.O.B-Polytechnic-828130
Distt.-Dhanbad,(Jharkhand)
Mob: 8409242211
Email: ahmadnesar2211@gmail.com

اُردو ماس میڈیا کی تدریس اور پروفیسر محمد شاہد حسین

شفیع ایوب

مئی 20 سنہ 2026 کو 77 سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہونے والے پروفیسر محمد شاہد حسین کی شناخت کے کئی حوالے ہیں۔ بنیادی طور پر اتر پردیش کے تاریخی شہر گورکھپور کے رہنے والے محمد شاہد حسین جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں تقریباً تین دہائیوں تک درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ عوامی ترسیل اور اردو ڈراما کی تدریس کے حوالے سے خاصی شہرت رکھنے والے پروفیسر محمد شاہد حسین کی کتابیں ہندوستان کی مختلف جامعات میں شامل نصاب ہیں۔ ڈراما نگاری اور ڈرامے کی تاریخ کے ساتھ ساتھ انھوں نے ماس میڈیا کی تدریس کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اردو ڈرامے کی تاریخ پر کام کیا۔ اپنے زمانے کے مشہور ڈراما نگار، نقاد اور دانشور پروفیسر محمد حسن کی نگرانی میں محمد شاہد حسین نے ڈراما اندر سبھا کی روایت کے موضوع پر مقالہ لکھ کر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ 1982 میں پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے فوراً بعد وہ جے این یو کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ یو جی سی ریسرچ ایسوسی ایٹ، یو جی سی ریسرچ سائنٹسٹ، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر کے طور پر تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے انھوں نے کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ وہ ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئر پرسن بھی رہے۔ کئی اہم پروجیکٹ پر کام کرتے ہوئے انھوں نے ماس میڈیا کی تدریس کو سہل بنانے اور اردو میں عوامی ترسیل کے ذرائع سے متعلق کتابیں تیار کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

واضح رہے کہ جب ہم عوامی ترسیل کی تدریس کی بات کر رہے ہیں تو ہمارے ذہن میں صرف صحافت کی تعریف اور تاریخ کا تصور نہیں ابھرنا چاہیے۔ صحافت دراصل '' ماس کمیونیکیشن '' کے بہت بڑے دائرے کا ایک حصہ ہے۔ ابتدا میں ہمارے ملک ہندوستان میں جب صحافت کی تعلیم و تربیت کی اہمیت کو محسوس کیا گیا تو جو نصابات تیار ہوئے ان میں ماس کمیونیکیشن کے پورے نظام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ صرف صحافت کی تاریخ اور فن پر بات کی گئی۔ لیکن جب ہم نے یورپ اور امریکہ کی جامعات میں پڑھائے جانے والے کورس کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ درون ذاتی ترسیل، بین شخصی ترسیل، جماعتی ترسیل اور طبقاتی ترسیل کے بعد عوامی ترسیل کا نمبر آتا ہے۔ اور جہاں تک ترسیل کے ذرائع کا تعلق ہے وہ صرف عوامی ترسیل کے لیے ہی ناگزیر ہیں۔ ترسیل کے باقی مراحل میں سورس، میسیج اور ریسیور سے کام چل جاتا ہے۔ لیکن جب ہم عوامی ترسیل یعنی ماس کمیونیکیشن کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں تو ایک چینل یعنی میڈیا کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور تب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوامی ترسیل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے ڈانڈے سیاسیات، سماجیات، معاشیات اور نفسیات تک پہنچتے ہیں۔ انھی باتوں کو دھیان میں رکھ کر پروفیسر محمد شاہد حسین نے تقریباً سات برسوں کی تلاش و جستجو اور محنت کے بعد ایک کتاب لکھی جسے ہم '' ابلاغیات '' کے نام سے جانتے ہیں۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے برسوں کی تحقیق اور اپنے تدریسی تجربات کو شامل کر کے '' ابلاغیات '' کی تخلیق کی۔ فروری 2014 میں جے این یو سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ عوامی ترسیل کی تدریس کے مسائل پر غور و فکر کرتے رہے۔ راقم السطور سے اکثر اس سلسلے میں ان کی بات ہوتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے نصاب میں شامل ماس کمیونیکیشن کی کتابوں کی طرح اچھی، تحقیقی، مفصل، معیاری اور قابل مطالعہ کتابیں اردو میں لکھی جائیں۔ انھوں نے '' ابلاغیات '' کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کچھ خاکہ بھی تیار کیا تھا۔ ماس کمیونیکیشن کی تدریس کو لے کر وہ فکرمند رہتے تھے اور اس کے مسائل کو دور کرنے کی شعوری کوشش بھی کرتے تھے۔

آج کے دور میں ماس میڈیا کی تدریس کی ضرورت اور اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بیشتر جامعات میں پہلے سے موجود شعبۂ اردو میں ماس میڈیا کے نئے کورس شامل کیے گئے۔ ہری ہر دت بنگو نے سنہ 1822 میں کلکتہ سے '' جامِ جہاں نما '' جاری کیا۔ یہیں سے اردو صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔ بعد کے زمانے میں مولانا محمد باقر کا '' دہلی اردو اخبار '' ہو یا مولانا ابوالکلام آزاد کا '' الہلال '' ہو یہ تمام اخبارات کسی مشن کے تحت نکالے گئے۔ لیکن بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا بھر میں یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ صحافت کے تاجرانہ تقاضوں کو پورا کرنا بہت ضروری ہے۔ '' اطلاعات کی بمباری '' کا تصور پیش کرتے ہوئے مغربی ماہرین ابلاغیات نے صحافت کی تدریس کو مزید سائنٹفک بنانے پر زور دیا۔ پروفیسر محمد شاہد حسین کو ابتدا سے ہی ڈراموں میں دلچسپی تھی اور ڈرامہ چونکہ عوامی ذرائع ترسیل کی ہی ایک شاخ ہے، اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو نہ صرف ڈراما نگاری اور ڈرامے کی تنقید تک محدود رکھا بلکہ عوامی ذرائع ترسیل کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرتے رہے، تحقیق کرتے رہے اور لکھتے رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور آج دنیا کے تمام ماہرین ابلاغیات اس بات پر متفق ہیں کہ عوامی ذرائع ترسیل دنیا کی سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی میں سب سے اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ پل پل بدلتی دنیا کو ماس میڈیا نے اس قدر متاثر کیا ہے کہ اس کی انتہا کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پہلے کسی ملک کی ترقی کا معیار اس کی فوجی طاقت ہوا کرتی تھی، پھر اقتصادی طاقت کو دھیان میں رکھ کر کسی ملک کی ترقی، خوشحالی کا

اندازہ لگایا جانے لگا، لیکن آج ان دونوں طاقتوں کی حیثیت ثانوی ہوگئی ہے۔ آج جس معاشرے میں ہم سانس لے رہے ہیں یہ معلوماتی معاشرہ ہے۔ آج کے دور میں وہی ملک ترقی کی بلندی پر ہوگا جس کا معلوماتی نظام ارفع واعلیٰ ہوگا۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد شاہد حسین اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''ابلاغیات'' میں لکھتے ہیں۔:

'' چالیس سال پہلے ولور شرم Wilbur Schrammi نے اپنی کتاب ماس میڈیا اینڈ نیشنل ڈیولپمنٹ میں پیشین گوئی کی تھی کہ '' عوامی ذرائع ترسیل دنیا کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔'' آج اس پیشین گوئی کی صداقت کا اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں۔ البتہ عوامی ذرائع ترسیل جس تیزی سے دنیا کا نقشہ بدل رہے ہیں اس کی انتہا کا اندازہ لگانا ضرور مشکل ہے۔ آج کا معاشرہ معلوماتی معاشرہ ہے۔'' (پیش لفظ، ابلاغیات، از: پروفیسر محمد شاہد حسین)

موجودہ دور کو اطلاعات اور ابلاغ کا دور کہا جاتا ہے۔ آج دنیا بھر میں خبروں، معلومات اور خیالات کی ترسیل میں ماس میڈیا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سوشل میڈیا نے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ایسے حالات میں ماس میڈیا کی تدریس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اور اس تدریسی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کر کے اردو میں مواد تیار کرنے میں پروفیسر محمد شاہد حسین کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ماس میڈیا کی تعلیم طلبہ کو ابلاغ کے جدید ذرائع، صحافتی اصولوں اور معلومات کی درست جانچ کے طریقوں سے آگاہ کرتی ہے۔ اس کے ذریعے نوجوان یہ سیکھتے ہیں کہ خبریں کس طرح تیار کی جاتی ہیں اور عوامی رائے کی تشکیل میں میڈیا کا کیا کردار ہوتا ہے۔ مزید برآں، میڈیا کی تعلیم لوگوں میں تنقیدی سوچ پیدا کرتی ہے، جس سے وہ جھوٹی خبروں اور گمراہ کن معلومات کی پہچان کر سکتے ہیں۔

آج میڈیا انڈسٹری روزگار کے بے شمار مواقع بھی فراہم کر رہی ہے جس میں اردو میڈیا انڈسٹری بھی شامل ہے۔ صحافت، نشریات، اشتہارات، تعلقاتِ عامہ اور ڈیجیٹل میڈیا جیسے شعبوں میں تربیت یافتہ افراد کی مسلسل ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے ماس میڈیا کی تدریس نہ صرف علمی اہمیت رکھتی ہے بلکہ پیشہ ورانہ ترقی کے لیے بھی مفید ہے۔ اس حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ موجودہ عہد میں ماس میڈیا کی تدریس ایک ناگزیر ضرورت بن چکی ہے۔ یہ افراد کو باخبر، ذمہ دار اور مؤثر ابلاغ کا اہل بناتی ہے اور معاشرے کی فکری و سماجی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ '' ابلاغیات'' کے مصنف ڈاکٹر محمد شاہد حسین جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ماس میڈیا کے طلبہ کو پڑھاتے رہے۔ اس دوران انھیں اردو ماس میڈیا کے طلبہ کی دشواریوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ''ابلاغیات'' جیسی کارآمد کتاب لکھی۔ اب ذرا تفصیل سے اس اہم کتاب کے ابواب پر غور کر لیتے ہیں۔ ''ابلاغیات'' کل چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''ترسیل اور عوامی ترسیل'' ہے جس میں ترسیل کی تعریف، اہمیت، اقسام، ترسیل اور عوامی ترسیل کا فرق، عوامی ذرائع ترسیل کے اجزائے ترکیبی اور ترسیل کا ارتقا عہد سنگ سے دور حاضر تک بڑے معروضی استدلالی ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں زبان کی ابتدا تحریر کا ارتقا اور کاغذ کی ایجاد جیسے موضوعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل اس پہلے باب میں پورے ترسیلی نظام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تقریباً ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل دوسرے باب کا عنوان صحافت ہے۔ اس میں صحافت کی ابتدا و ارتقا کے ساتھ ساتھ عہد حاضر تک اردو صحافت کا ارتقا اور خاص طور سے خبر نگاری، نامہ نگاری، اداریہ نگاری، کالم نگاری، فیچر نگاری اور اخباری انٹرویو کی ضروری تفصیلات کو بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سرکولیشن کے پورے نظام کو بہت بہتر طریقے سے سمجھایا گیا ہے۔ سنڈیکیٹ اداروں کے کام کرنے کے طریقوں کو بھی اس باب میں موضوع بنایا گیا ہے۔

تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل تیسرے باب میں ریڈیو کی تفصیلات دی گئی ہیں، جس میں ٹیلی گراف، ٹیلی فون وائرلیس ریڈیو اور ٹرانسسٹر کی ایجاد و ارتقا کو سمیٹا گیا ہے۔ اس باب کا اہم حصہ وہ ہے جس میں ریڈیو کی تمام اصناف کا تعارف اور ان کے لکھنے کے طریقہ کار سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ریڈیو ٹاک، ریڈیو ڈراما، ریڈیو فیچر، ریڈیو ڈاکیومنٹری اور فون اِن پروگرام کا بھرپور تعارف اس باب میں موجود ہے۔ اردو سروس، اردو مجلس، سینٹرل مانیٹرنگ سروس اور نیشنل چینل کے بارے میں تمام اہم جانکاریاں یہاں دے دی گئی ہیں۔ تقریباً 80 صفحات پر مشتمل چوتھے باب میں ٹیلی ویژن کا بیان ہے۔ اس میں ٹیلی ویژن کی ابتدا وارتقا عالمی اور ہندوستانی تناظر میں اور ترسیلی سیٹلائٹ کی کارکردگی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن اصناف ڈاکومنٹری، ڈراما سوپ اوپیرا، فیچر، انٹرویو اور مباحثہ پر نہ صرف بحث کی گئی ہے بلکہ انھیں لکھنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے، چنانچہ ٹیلی ویژن اسکرپٹ نگاری کی تفصیل بھی اس میں موجود ہے۔ چونکہ پروفیسر محمد شاہد حسین خود ٹیلی ویژن کے لیے اسکرپٹ لکھا کرتے تھے اس لیے اسکرپٹ نگاری کے باب میں انھوں نے اسکرپٹ سے متعلق تمام باتوں کو بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔ واضح رہے کہ بے پناہ مقبولیت کے سبب اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ بعد کے ایڈیشن میں فاضل مصنف نے فلموں کے حوالے سے ایک مکمل باب کا اضافہ کر دیا۔ چونکہ فلمیں بھی عوامی ترسیل کا ایک بڑا چینل ہیں۔ اس لیے فلم نگاری کے تمام اصولوں سے بحث کرتے ہوئے فلموں کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

کلاس روم لکچر ہو یا تحریر پروفیسر محمد شاہد حسین کا انداز بیان نہایت شستہ، رواں اور دل نشین تھا۔ معاملہ تصنیف وتالیف کا ہو یا تقریر کا وہ جدید تحقیق کے اصولوں کو پوری طرح برتنے کے قائل تھے۔ ہر بات بہترین ترتیب و دلیل کے ساتھ بیان کرتے تھے اور مکمل حوالہ دیتے تھے۔ اسی لیے ان کے کلاس روم لکچر میں طلبہ دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی تحریر یا تقریر میں الجھاؤ نہیں تھا۔ ان کی باتیں طلبہ، اساتذہ اور عام قاری کے لیے یکساں مفید تھیں۔ ان کی تحریریں عوامی ذرائع ترسیل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تو ایک نعمت کا حکم رکھتی ہیں۔ 12 فروری 1949 کو گورکھپور کے ایک علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے محمد شاہد حسین اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے سیکڑوں طالب علم ملک و بیرون ملک مختلف میڈیا ہاؤسیز میں برسرکار ہیں۔ عوامی ترسیل کی تدریس کے حوالے سے پروفیسر محمد شاہد حسین کی خدمات پر ایک مکمل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے کلاس روم لکچرز کے ذریعے طلبہ کی بڑی تعداد کی رہنمائی کی بلکہ ان کے لیے اردو زبان میں مواد بھی فراہم کیا۔ اردو میں ماس میڈیا کی تدریس کے حوالے سے پروفیسر محمد شاہد حسین کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

■

Dr. Shafi Ayyub
(Shafiuzzama Khan)
Flat No. 304 B, 367 / B-1, Munirka, Opposite JNU
Main Gate, New Delhi - 110067
Email: shafiayub75@rediffmail.com

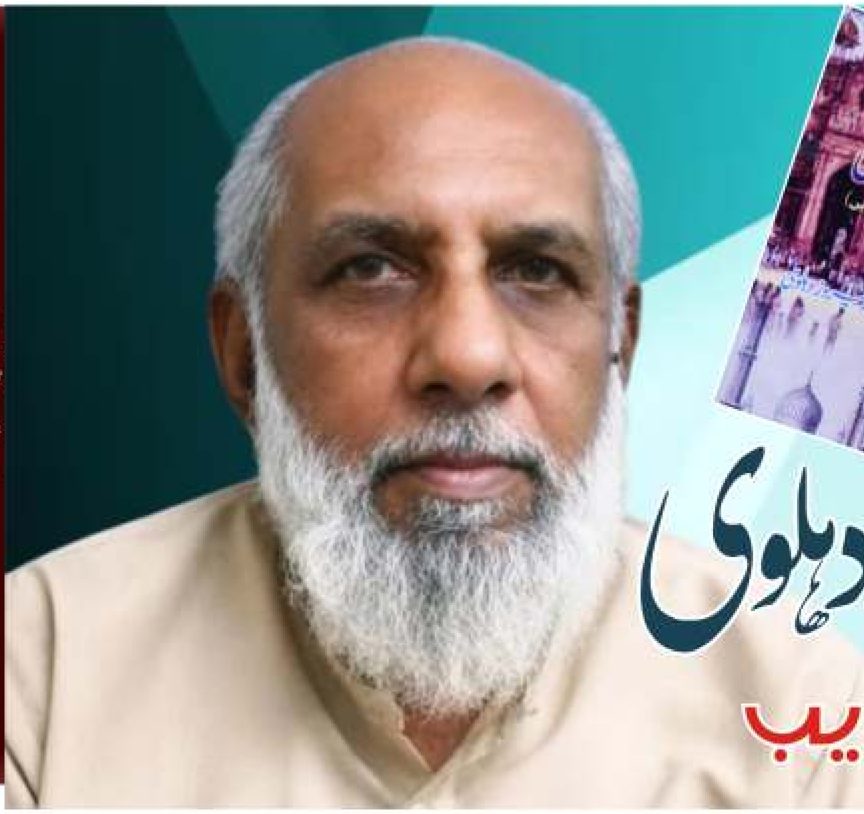

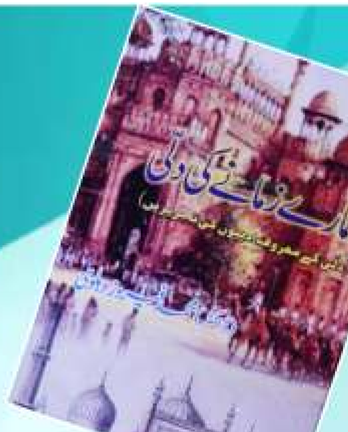

شعیب رضا فاطمی

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی

استاد اور ادیب

دہلی کو عالم میں 'انتخاب' کا جو درجہ حاصل ہے اس کی بہت ساری وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سرزمین پر ایسی ایسی باکمال شخصیات نے جنم لیا ہے جن کے اگر ہر ہر پہلو کا جائزہ لیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ فیروز دہلوی ان ہی نابغہ روزگار شخصیات میں سے ایک تھے جو اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔

یوں تو دہلی پر غم ونشاط کے بادل بار بار برستے رہے ہیں اور سوگواری بھی اس سرزمین کی تہذیب کا حصہ بن چکی ہے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی ایسا سانحہ بھی رونما ہوتا ہے جسے ذہن قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ 15 مئی 2026 کو بھی ایسا ہی ہوا جب سرِ شام یہ خبر ملی کہ فیروز دہلوی بھی پردہ فرما گئے۔

دہلی کی علمی و ادبی فضا ایک بار پھر سوگوار ہے۔ اردو دنیا کے ممتاز استاد، محقق، مترجم اور نہایت شائستہ انسان ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کے انتقال نے ایک ایسے عہد کا خاتمہ کر دیا ہے جو علم، تہذیب، شرافت اور خاموش ادبی خدمت سے عبارت تھا۔ 15 مئی 2026 کو جب ان کے انتقال کی خبر عام ہوئی تو صرف ان کے اہلِ خانہ یا شاگرد ہی غمزدہ نہیں ہوئے بلکہ دہلی کی ادبی اور تعلیمی دنیا نے ایک ایسے چراغ کے بجھ جانے کا احساس کیا جس کی روشنی کئی دہائیوں تک اردو زبان و ادب کے افق کو منور کرتی رہی۔

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی 25 نومبر 1942 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور ایک عام مسلمان نوجوان کی طرح عنفوانِ شباب میں ہی غمِ روزگار کی فکر میں لگ گئے، لیکن پرانی دہلی کی تہذیبی فضا، علمی ماحول اور اردو زبان کی مٹھاس ان کے رگ و ریشہ کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا اور حصولِ علم کی آگ کو روزگار کی سیال تھکن بجھا نہیں پائی۔ درجہ بدرجہ پروان چڑھتا ہوئے بالآخر وہ دہلی یونیورسٹی تک جا پہنچے اور وہاں انھیں قدرت کی طرف سے ایسے ایسے استاد ملے جنھوں نے ان کے اندر جل رہی طلب علم و ادب کی چنگاری کو برانگیختہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی یونیورسٹی کا شعبہ اردو اردو دنیا کا نہایت متمول شعبہ تھا۔ خواجہ احمد فاروقی، ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر فضل الحق، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، ڈاکٹر شریف، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر امیر عارفی، پروفیسر قمر رئیس۔ کس کس کا نام لیا جائے، لیکن ان میں چند ایسے استاد بھی تھے جن کی سادگی اور انسان دوستی نے فیروز دہلوی پر خاص اثر چھوڑا جن میں مغیث الدین فریدی، پروفیسر شریف اور پروفیسر امیر عارفی سے وہ از حد محبت کرتے تھے۔ یہ اساتذہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ ان سادگی پسند اساتذہ کی صحبت کا اثر ہی تھا کہ سادگی ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔ انھوں نے زندگی بھر دہلی کی اسی تہذیبی روایت کو نہ صرف اپنے اندر محفوظ رکھا بلکہ اپنی تحریروں، گفتگو اور تدریسی خدمات کے ذریعہ اسے نئی نسلوں تک منتقل بھی کیا۔ ان کا انتقال اگرچہ جسمانی طور پر ایک فرد کی جدائی ہے لیکن حقیقت میں یہ اردو تہذیب کے ایک باوقار نمائندے کی رخصتی ہے۔

ڈاکٹر فیروز دہلوی کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم دہلی میں ہوئی۔ انھوں نے دہلی کالج (ایوننگ) سے بی اے اور ایم اے کی تعلیم حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے ان میں مطالعہ، تحقیق اور لکھنے لکھانے کا شوق نمایاں

دهلی کی علمی و ادبی فضا ایک بار پھر سوگوار هے۔ اردو دنیا کے ممتاز استاد، محقق، مترجم اور نهایت شائسته انسان ڈاکٹر محمد فیروز دهلوی کے انتقال نے ایک ایسے عهد کا خاتمه کر دیا هے جو علم، تهذیب، شرافت اور خاموش ادبی خدمت سے عبارت تها۔ 15 مئی 2026 کو جب ان کے انتقال کی خبر عام هوئی تو صرف ان کے اهل خانه یا شاگرد هی غمزده نهیں هوئے بلکه دهلی کی ادبی اور تعلیمی دنیا نے ایک ایسے چراغ کے بجھ جانے کا احساس کیا جس کی روشنی کئی دهائیوں تک اردو زبان و ادب کے افق کو منور کرتی رهی۔

تھا۔ یہ وہ دور تھا جب نو جوان طلبہ سیاست یا وقتی سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے لیکن فیروز دہلوی کتابوں اور علمی مباحث کے آدمی تھے۔ دورانِ طالب علمی انھوں نے کالج کے سالنامہ 'حیات' کا 'یادرفتگاں نمبر' شائع کیا جوان کی ادبی بصیرت اور تنظیمی صلاحیت کا ابتدائی ثبوت تھا۔ اس وقت شاید کسی نے اندازہ بھی نہ کیا ہوگا کہ یہی نوجوان آگے چل کر اردو ادب کی ایک معتبر آواز بن جائے گا۔

1983 میں ان کا تقرر ذاکر حسین کالج (مارننگ) میں بطور استاد ہوا۔ یہیں سے ان کی تدریسی زندگی کا وہ سفر شروع ہوا جس نے ہزاروں طلبہ کو متاثر کیا۔ وہ صرف کتابی علم دینے والے استاد نہیں تھے بلکہ اپنے شاگردوں کی شخصیت سازی پر بھی توجہ دیتے تھے۔ ان کے شاگرد آج بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ڈاکٹر فیروز دہلوی کے لیکچر محض درسی گفتگو نہیں ہوتے تھے بلکہ تہذیب، مطالعہ، تنقیدی شعور اور انسان دوستی کا درس ہوتے تھے۔ وہ کلاس روم میں ادب کو زندہ کر دیتے تھے۔ غالب، میر، اقبال یا سرسید کا ذکر کرتے تو محسوس ہوتا جیسے وہ ان شخصیات کو صرف پڑھ نہیں رہے بلکہ جی رہے ہیں۔

دورانِ تدریس ہی انھوں نے پی ایچ ڈی کے لیے غالب کے مشہور شاگرد میر مہدی مجروح کی حیات اور تصنیفی خدمات پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ بعد میں یہی مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوا اور علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ ان کی تحقیقی صلاحیت، عرق

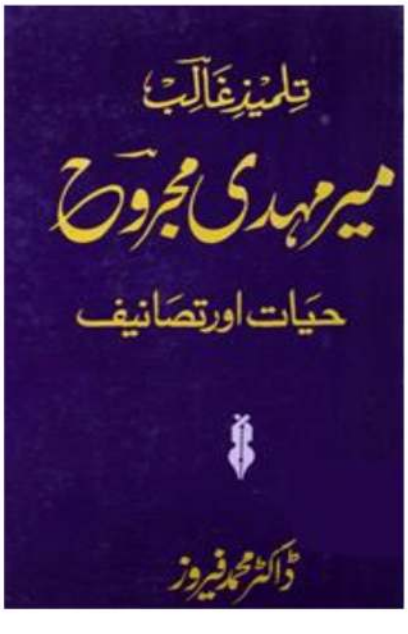

ریزی اور کلاسیکی ادب سے گہری وابستگی کا ثبوت تھا۔ ان کی تحقیق میں محض حوالوں کی فراوانی نہیں ہوتی تھی بلکہ موضوع کے ساتھ ایک قلبی تعلق بھی محسوس ہوتا تھا۔

ڈاکٹر فیروز دہلوی کی ادبی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ انھوں نے تحقیق، تنقید، تدوین، ترجمہ اور تذکرہ نگاری، ہر میدان میں اپنی موجودگی درج کرائی۔ ان کی تصانیف میں 'عہد سرسید کے ادبی و علمی نقوش'، 'اختر الایمان: مقام اور کلام'، 'لندن کی ایک رات کا تجزیاتی مطالعہ'، 'سردار جعفری کی نادر تحریریں'، 'مجروح سلطان پوری: مقام اور کلام' جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ ان کتابوں میں انھوں نے صرف ادبی شخصیات کا تعارف نہیں کرایا بلکہ ان کے فکر وفن کو نئے زاویوں سے سمجھنے کی کوشش بھی کی۔

خاص طور پر ان کا مرتب کردہ مجلّہ 'فکر نو' کا 'فرزندگان کالج نمبر' جو ذاکر حسین کالج مارننگ کا سالانہ مجلّہ تھا اور جس کی پانچ جلدیں تھیں، بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ چونکہ یہ ایک کالج کا مجلّہ تھا اس لیے اس کی تشہیر نہیں ہو سکی اور مخصوص ہاتھوں تک محدود ہو کر رہ گیا لیکن یہ مجلّہ دراصل دہلی کی ادبی و تہذیبی روح کا ایک آئینہ ہے۔

دہلی صرف ایک شہر نہیں بلکہ صدیوں کی تہذیب، زبان، ثقافت اور روایت کا نام ہے۔ ڈاکٹر فیروز دہلوی نے اس مجلّہ کے ذریعے دہلی کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی تحریروں کو یکجا کر کے اس تہذیبی روایت کو محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آج جب نئی نسل اپنی تہذیبی جڑوں سے دور ہوتی جا رہی ہے تو ایسی کتابوں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اکثریتی طبقہ کے لوگ اور دیگر اقوام بھی اپنی جڑوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اور ان کی تحقیق کے نتیجہ میں نئی نئی چیزیں سامنے بھی آ رہی ہیں۔

ڈاکٹر فیروز دہلوی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی انکساری اور شرافت تھی۔ وہ شہرت کے طلبگار نہیں تھے۔ علمی دنیا میں اکثر لوگ اپنی معمولی کامیابیوں کا شور مچاتے نظر آتے ہیں لیکن فیروز دہلوی خاموشی سے کام کرنے والے انسان تھے۔ وہ اپنے کام کو اپنی پہچان بناتے تھے۔ ان کی گفتگو میں نہ تصنع ہوتا تھا اور نہ خود نمائی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقۂ احباب میں طلبہ، اساتذہ، ادیب، شاعر اور عام لوگ سبھی شامل تھے۔ آپ

ڈاکٹر فیروز دہلوی کے لیکچر محض درسی گفتگو نہیں ہوتے تھے بلکہ تہذیب، مطالعہ، تنقیدی شعور اور انسان دوستی کا درس ہوتے تھے۔ وہ کلاس روم میں ادب کو زندہ کر دیتے تھے۔ غالب، میر، اقبال یا سرسید کا ذکر کرتے تو محسوس ہوتا جیسے وہ ان شخصیات کو صرف پڑھ نہیں رہے بلکہ جی رہے ہیں۔

اس عرصہ میں برپا کی گئی ادبی محفلوں، مجلسوں، سمینار اور سمپوزیم کی رپورٹ اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو فیروز دہلوی اس میں شاید ہی نظر آئیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وہ صرف گروہ بندی کے شکار ہو گئے بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ خود ان کی بے اعتنائی بھی تھی۔ یوں تو آخری دس سالوں میں تو وہ گھٹنوں کی تکلیف میں مبتلا ہو جانے کے سبب بھی کہیں جانے سے پرہیز کرتے تھے لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی بے اعتنائی اور تنہائی پسندی بھی تھی۔ انھیں کلاسیکی اردو ادب سے شغف ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس کے قتیل بھی تھے۔ اپنے اساتذہ کی عزت ان کا شعار تھا اور ان کے سامنے کسی بھی موضوع پر بولنے سے وہ ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔ میں خود جب پروفیسر امیر عارفی کی زیر نگرانی ایم فل کا مقالہ لکھ رہا تھا اس وقت فیروز صاحب دہلی کالج میں تھے اور اکثر عارفی صاحب کے ساتھ جامع مسجد آتے تھے۔ عارفی صاحب، شریف صاحب اور فیروز دہلوی صاحب کے ساتھ ساقی بک ڈپو کے مالک غنی صاحب کی چھوٹی سی دوکان میں بیٹھتے تھے۔ تو مجھے بھی اکثر ان کے ساتھ بیٹھنے کا موقعہ ملتا تھا۔ اس موقع پر زیادہ تر عارفی صاحب بولتے تھے اور کبھی کبھی شریف صاحب بھی لیکن فیروز صاحب ان کی گپ شپ کو بھی اتنے انہماک سے سنتے تھے جیسے کہ کوئی مرید اپنے شیخ کے فرمودات کو سن رہا

آج جب ہم ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ذریعے یہ سبق دیا کہ علم کا اصل مقصد انسان کو بہتر انسان بنانا ہے۔ ان کے یہاں علم اور اخلاق ایک دوسرے سے جدا نہیں تھے۔ وہ جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں دہلی کی قدیم تہذیب کی شائستگی، اردو ادب کی لطافت اور صوفیانہ انکسار یکجا ہو گیا تھا۔

ہے۔ کبھی زیرلب مسکرا کر اور کبھی ہاں ہوں کر کے ان کی گفتگو میں شامل تو ضرور ہوتے تھے لیکن کبھی بھی حد ادب کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ لیکن وہی فیروز دہلوی جب تنہا ملتے تھے خاص طور پر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس میں جہاں میں ملازمت کرتا تھا اور جو ان کے گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔ تو پھر وہ کھل کر گفتگو کرتے تھے اور ایسے ناصحانہ انداز میں جیسے وہ ایک ہی نشست میں اپنے جاں گسل تجربات کے تمام اثرات میرے ذہن میں منتقل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ ایک بار میں دفتر میں اپنی میز پر کسی کتاب کا مسودہ پڑھ رہا تھا کہ فیروز صاحب تشریف لائے دعا سلام کے بعد جب وہ میرے قریب بیٹھنے لگے تب خان صاحب یعنی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے مالک مجتبیٰ خان صاحب کی ان پر نظر پڑی انھوں نے نہایت عجلت میں فیروز صاحب کو اپنے پاس آکر بیٹھنے کو کہا۔ فیروز صاحب ان کے پاس چلے گئے، میں جو اپنے سامنے بکھرے صفحات سمیٹ چکا تھا اسے پھر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کیونکہ کتاب کو اسی دن فلم بنانے کے لیے بھیجنا تھا اور اس میں کچھ غلطیوں کو درست کرانے کے لیے کمپیوٹر آپریٹر کے پاس جانا تھا اس لیے میں نے فیروز صاحب پر توجہ نہیں دی اور اپنے کام میں مشغول رہا لہٰذا نہایت حساس فیروز صاحب نے اسے محسوس کر لیا اور خان صاحب کے پاس بیٹھے بیٹھے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ ''میاں شعیب خدا کا شکر ادا کیجیے کہ آپ ٹیبل پر بیٹھے ہیں، میں نے یہیں کتابوں کے بنڈل سینے کا کام کیا ہے''۔ میں سمجھ گیا اور جا کر ان کے پاس معذرت کرتے ہوئے کہا کہ معاف کیجیے گا سر دراصل میرے ہاتھ میں جو مسودہ ہے اسے آج ہی فلم بنانے کے لیے دینا ہے۔ براہ کرم اسے میری عدم توجہی پر محمول نہ کریں۔ خان صاحب نے بھی میری تائید کی اور پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ ان سے متعلق بہت سی یادیں ہیں جسے قلم بند کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ اب ایسے لوگ خال خال ہی رہ گئے ہیں جن کی گفتگو سے ذہن روشن ہوتا ہے۔

دہلی اردو اکادمی نے ڈاکٹر فیروز دہلوی کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں دتاتریہ کیفی ایوارڈ سے بھی نوازا۔ یہ اعزاز یقیناً ان کی علمی و ادبی عظمت کا اعتراف تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی اصل پہچان ان کے شاگرد، ان کی کتابیں اور ان کی شائستہ شخصیت تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان کی خدمت میں گزاری اور کبھی اس خدمت کا صلہ طلب نہیں کیا۔ آخری عمر میں فیروز دہلوی پروفیسر مظہر احمد سے بہت زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ گو کہ مظہر احمد صاحب ذاکر حسین کالج میں ان کے ساتھی تھے مگر مارننگ اور ایوننگ کا فرق تھا۔ فیروز صاحب مارننگ میں استاد تھے اور مظہر صاحب ایوننگ میں ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک شریف النفس شاگرد کی طرح مظہر صاحب مسلسل فیروز صاحب سے کسب فیض کرتے رہے۔

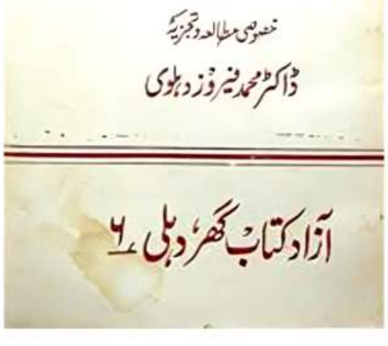

آج جب ہم ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ذریعے یہ سبق دیا کہ علم کا اصل مقصد انسان کو بہتر انسان بنانا ہے۔ ان کے یہاں علم اور اخلاق ایک دوسرے سے جدا نہیں تھے۔ وہ جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں دہلی کی قدیم تہذیب کی شائستگی، اردو ادب کی لطافت اور صوفیانہ انکسار یکجا ہو گیا تھا۔

ان کے انتقال کے بعد اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے آسانی سے پر نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب اردو زبان اور تہذیب کو سنجیدہ اور مخلص افراد کی شدید ضرورت ہے، ڈاکٹر فیروز دہلوی جیسے لوگوں کا رخصت ہونا ایک بڑا نقصان ہے۔ وہ اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے ادب کو محض ذریعہ معاش نہیں بنایا بلکہ اسے زندگی کا مقصد سمجھا۔ آج کی مادہ پرستی کے دور میں ایسی شخصیات کم ہی نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر فیروز دہلوی کی زندگی اس بات کی مثال ہے کہ خاموشی سے کیا جانے والا علمی کام کس طرح آنے والی نسلوں کے لیے سرمایہ بن جاتا ہے۔ انھوں نے نہ کوئی شور مچایا، نہ کسی ادبی گروہ بندی کا حصہ بنے، نہ خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے باوجود اردو دنیا میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ ان کے شاگرد جب بھی اردو ادب کا ذکر کریں گے تو اپنے اس استاد کو ضرور یاد کریں گے جس نے انھیں صرف کتابیں نہیں پڑھائیں بلکہ زندگی جینے کا سلیقہ بھی سکھایا۔

ان کی وفات یقیناً ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، مگر ان کی تصانیف، ان کے علمی کارنامے اور ان کی شائستہ یادیں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ وہ اپنے پیچھے ایسی ادبی میراث چھوڑ گئے ہیں جو آنے والے محققین اور طلبہ کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنتی رہے گی۔

اردو دنیا انھیں ہمیشہ ایک باوقار استاد، مخلص محقق، نفیس انسان اور تہذیبی روایت کے امین کے طور پر یاد رکھے گی۔

■

Shoaib Raza Fatmi
H.No: 705 .Gali No 2,
Gurudwara Mohalla, Mauj Pur
Delhi-110053
Mob.: 9968778671

خراجِ عقیدت

فیروز بخت احمد

فاروق سیّد اور 'گل بوٹے'

یوں تو بچوں کے رسائل کی تاریخ میں ایک سے ایک اعلیٰ مدیران رہے ہیں، مگر تین اعلیٰ ترین نام ہیں: الیاس دہلوی (ماہنامہ 'کھلونا')، حسین حسّان ندوی (ماہنامہ 'پیامِ تعلیم')، اور فاروق سیّد (ماہنامہ 'گل بوٹے') ابھی تک ہم اللہ کے دربار میں فاروق سید صاحب کی صحت کے لیے دست دعا پھیلائے ہوئے تھے، اب ان کی مغفرت اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام کے لیے دعا گو ہیں۔ ادب اطفال کا شیدائی اور صحافت کا دلدادہ اپنے حصے کے گل بوٹے اور کیاریاں سجا، کھلا کر اپنے ابدی مسکن جنتی گل بوٹوں کے درمیان جا کر اپنے مالک حقیقی کے دربار میں سجدہ ریز ہوگیا۔

سید صاحب کا انتقال اردو دنیا، بالخصوص ادبِ اطفال کے حلقے کے لیے ایک نہایت ہی اندوہ ناک اور ناقابلِ تلافی سانحہ ہے۔ ان کی رحلت سے ایک ایسی شخصیت ہم سے جدا ہوگئی جو نہ صرف اپنے فن میں یکتا تھی بلکہ اپنی ذات میں ازحد ایمانداری، وضعداری، وفاداری، اخلاص، محبت، خلوص اور علمی سنجیدگی کا حسین امتزاج رکھتی تھی۔ راقم الحروف کو ان سے متعدد بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ہر ملاقات میں ان کی ذرّہ نوازی، خندہ پیشانی، شفقت آمیز گفتگو اور خلوصِ دل کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔ وہ نہایت محبت سے ملتے، حوصلہ افزائی کرتے اور آپسی بھائی چارے، ملک میں اتحاد اردو زبان و ادب کے مستقبل کے حوالے سے اپنی فکرمندی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ جس وقت راقم مانو میں چانسلر تھا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں فاروق نے ادب اطفال پر ایک قومی مذاکرہ اپنے دوست اور ادب اطفال کے رسیا، جناب سراج عظیم نجمی صاحب کی مدد سے منعقد کیا تھا، جس میں انھوں نے راقم کو بھی مدعو کیا تھا۔ جب کھانے کا وقفہ ہوا تو سبھی میز کرسیاں بھر گئیں تو راقم نے وہیں زمین پر بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ راقم کا یہ عمل فاروق صاحب کو اتنا پسند آیا کہ ہر محفل میں وہ یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ بچّوں کے ادب کی محبت میں چانسلر صاحب نے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا! اس وقت فاروق صاحب اور سراج عظیم صاحب بھی راقم کے ساتھ فرش پر ہی بیٹھے تھے۔

فاروق صاحب نہایت ہی شریف النفس اور ولی الصفت تو تھے ہی، کثیر خوبیوں کے مالک بھی تھے۔ ادبِ اطفال کے فروغ کے لیے ان کی خدمات نہایت وسیع، ہمہ جہت اور قابلِ قدر ہیں۔ ان کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ انھوں نے بچوں کے ادب کو محض تفریح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اخلاقی تربیت، ذہنی بالیدگی اور فکری پختگی کا مؤثر ذریعہ بنایا۔

فاروق صاحب نہایت ہی شریف النفس اور ولی الصفت تو تھے ہی، کثیر خوبیوں کے مالک بھی تھے۔ ادبِ اطفال کے فروغ کے لیے ان کی خدمات نہایت وسیع، ہمہ جہت اور قابلِ قدر ہیں۔ ان کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ انھوں نے بچوں کے ادب کو محض تفریح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اخلاقی تربیت، ذہنی بالیدگی اور فکری پختگی کا مؤثر ذریعہ بنایا۔ فاروق سیّد صاحب کی تحریروں میں سادگی بھی تھی، گیرائی اور گہرائی بھی، اور مقصدیت بھی، جو قاری کے دل میں اتر کر اپنا پائندہ اثر چھوڑتی تھی۔

فاروق سیّد کے قریبی دوست، انوار مرزا، ان کے تعلّق سے بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی زبان کسی انسان کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ بلکہ زبان زینہ ہے کامیابی کی طرف بڑھنے کا۔ نئی نسل کو مشورہ دیتے ہوئے

وہ کہتے ہیں کہ ''تعلیم سے منہ نہ موڑو۔ کامیابی اور ترقّی کے لیے تعلیم اشد ضروری ہے۔ تعلیم کے بغیر ایک نوجوان میکینک تو بن سکتا ہے مگر انجینئر نہیں!'' جڑوں میں کھاد ڈالنے کی ضرورت ہے جبکہ ہم پتّوں پر پانی چھڑک کر خوش ہورہے ہیں! تعلیم کا یہ جذبہ تھا اُن میں!

سب سے اہم بات یہ ہے کہ فاروق سیّد کی کوششوں سے 'گُل بُوٹے' مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ آج سے 21 سال پہلے محض 250 کی تعداد میں شائع ہونے والے 'گُل بُوٹے' کی موجودہ تعدادِ اشاعت 25 ہزار ہے جو ہر اعتبار سے کسی اُردو میگزین کے لیے ایک کارنامے سے کم نہیں ہے۔ اور 25 ہزار کی یہ تعدادِ اشاعت محض دِکھاوے کے لیے، دوست احباب کو مُفت میں بانٹنے کے لیے یا میگزین شائع کرکے، بنڈل باندھ کر گھر یا آفس میں رکھنے کے لیے نہیں ہے۔ 'گُل بُوٹے' کے طے شدہ ماہانہ اور سالانہ خریدار ہیں اور پورے مہاراشٹر میں بُک اسٹالز کے علاوہ بہت سے اردو اسکول ہیں جہاں طلبہ کے لیے یہ میگزین ہر ماہ پابندی سے جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ 'گُل بُوٹے' کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اب دُبئی، شارجہ، سعودی عربیہ، دوحہ، قطر، بحرین، ایران اور دیگر بیرونی ممالک تک پہنچ گیا ہے۔

فاروق سیّد کی رحلت سے ایک ایسی شخصیت ہم سے جدا ہوگئی جو نہ صرف اپنے فن میں یکتا تھی بلکہ اپنی ذات میں اخلاص، محبت، خلوص اور علمی سنجیدگی کا حسین امتزاج رکھتی تھی۔ مرحوم بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ ادبِ اطفال کے فروغ کے لیے ان کی خدمات نہایت وسیع، ہمہ جہت اور قابلِ قدر ہیں۔ انھوں نے بچوں کے ادب کو محض تفریح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اخلاقی تربیت، ذہنی بالیدگی اور فکری پختگی کا مؤثر ذریعہ بنایا۔ ان کی تحریروں میں سادگی بھی تھی، گہرائی بھی، اور مقصدیت بھی جو قاری کے دل میں اتر کر اپنا اثر چھوڑتی تھی۔ ہر ملاقات میں ان کی نرمی، خندہ پیشانی، شفقت آمیز گفتگو اور خلوصِ دل کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔ وہ نہایت اپنائیت سے ملتے تھے۔ بقول جناب سراج الدین ندوی، مدیر، 'بچوں کا ساتھی'، ان کی وفات کی خبر نے دل کو گہرے صدمے سے دوچار کردیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ادبِ اطفال کا سراج گل ہوگیا، مگر ان کی خدمات، ان کی تحریریں اور ان کی محبتیں ہمیشہ اہلِ علم وادب کے دلوں میں زندہ رہیں گی۔

تمام زندگی مختلف اقسام کی قربانیاں دے کر انھوں نے 'بوٹے' کو اپنے خون پسینے سے سینچا۔ ممبئی کے روزنامہ 'اردو ٹائمز' میں بچوں کا صفحہ ترتیب دیا کرتے تھے اور وہیں سے تجربہ اور مہارت حاصل کرنے کے بعد اپنا رسالہ، 'گل بوٹے' شروع کیا۔ اس رسالہ کی بچوں کی طرح پرورش کی۔ ڈیجیٹل ترقی نے اس سورج کو بادلوں میں ڈھانپا تو اسی کو طاقت بنا کر ڈیجیٹلی 'گل بوٹے' سے بچوں سے رِشتہ برقرار رکھا۔ فاروق سید کے رخصت ہوجانے سے ان گل بوٹوں کا کیا ہوگا، یہ تو وقت بتائے گا، مگر دل سے آواز آتی ہے کہ ان کی قربانیاں رائیگاں نہ ہونے پائیں۔

فاروق سید صرف ایک رسالے کے مدیر نہیں تھے بلکہ بچوں کے ادب کے ایک مخلص سپاہی، دردمند رہنما اور ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ ان کی پوری زندگی بچوں کے لیے معیاری، اخلاقی اور تعمیری ادب کی ترویج و اشاعت میں گزری۔ وہ نہ صرف اپنے رسالے گل بوٹے کی ترقی کے لیے فکرمند رہتے تھے بلکہ ملک بھر میں شائع ہونے والے بچوں کے رسائل اور ادبِ اطفال سے

فاروق سید صرف ایک رسالے کے مدیر نہیں تھے بلکہ بچوں کے ادب کے ایک مخلص سپاهی، درد مند رهنما اور ایک همه جهت شخصیت تھے۔ ان کی پوری زندگی بچوں کے لیے معیاری، اخلاقی اور تعمیری ادب کی ترویج و اشاعت میں گزری۔ وہ نه صرف اپنے رسالے گل بوٹے کی ترقی کے لیے فکر مند رهتے تھے بلکه ملک بھر میں شائع هونے والے بچوں کے رسائل اور ادبِ اطفال سے وابسته قلمکاروں کے مسائل کو بھی اپنا مسئله سمجھتے تھے۔

وابستہ قلمکاروں کے مسائل کو بھی اپنا مسئلہ سمجھتے تھے۔

کورونا وائرس کے مشکل دور میں جب متعدد بچوں کے رسائل معاشی بحران کا شکار ہوئے اور کئی رسائل بند ہونے کے قریب پہنچ گئے، اس وقت فاروق سید نے غیر معمولی بصیرت اور اخلاص کا مظاہرہ کرتے ہوئے آل انڈیا سطح پر بچوں کے رسائل کے مدیران کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ ان کی تحریک سے بچوں کے رسائل کی تنظیم قائم ہوئی اور مختلف رسائل کے مسائل کے حل کے لیے سنجیدہ کوششیں کی گئیں۔ یہ ان کے وسیع قلب، اخلاص اور ادبِ اطفال سے سچی محبت کا روشن ثبوت ہے۔

مرحوم بچوں کے ادب کو ایک نئی تحریک دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے بچوں کے ادب کو ڈیجیٹل فارمیٹ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے علاوہ سمینارز، ادبی نشستوں اور جشنِ بچپن جیسے عالمی پروگراموں کے ذریعے بچوں کے ادب کو نئی جہت عطا کی۔ انھوں نے عالمی سطح پر بچوں کے ادیبوں اور قلم کاروں سے مضبوط روابط قائم کیے اور ادبِ اطفال کو ایک منظّم تحریک بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو فاروق جیسے دِل گُردے والا اِنسان ہی کرسکتا تھا۔

■

Mr. Firoz Bakht Ahmed
A-202, Adeeba Market &Apts
Near Rahmani Masjid, Main Road
Zakir Nagar, Okhla, Road
New Delhi - 110025
Mob.:9810933050
firozbakhtahmed08@gmail.com

تلمیذ فاطمہ نقوی

سائنسی متن کا اردو ترجمہ

مسائل و مباحث

جن اقوام میں علم کی طلب اور شعور بیدار ہوا ان کو بنیادی طور پر ترجمہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمانہ قدیم اور عہد وسطیٰ سے ہی علم کی طلب میں سیاح زندگی کا بڑا حصہ سفر میں گزار دیا کرتے تھے۔ علم کی طلب اور اخذ واکتساب کا عمل ترقی یافتہ اقوام میں نمایاں رہا ہے۔ وہ اقوام جنھوں نے روحانی یا مادی ترقی کی متعدد منازل طے کیں انھوں نے دوسروں کے علوم وفنون کو جاننے کی کوششوں کو ہمیشہ اپنی ترجیحات میں رکھا ہے۔

ایک زمانے میں تراجم کے طفیل تہذیبوں میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ یونانی سے انگریزی کے تراجم نے معاشرہ کو تبدیلی کی طرف گامزن کیا اور یونانی زبان سے عربی میں ہونے والے تراجم عربی نشاۃ الثانیہ کی ایک وجہ بنے۔ جب بھی ترقی یافتہ قوم سے علم کی شمع کو کسی اور قوم نے لیا تو اس میں پہلا مرحلہ کتب کے ترجمہ کا یعنی علم کو اپنی زبان میں ڈھالنے کا تھا۔ یونانی علم کو عرب سائنس دانوں نے اپنی زبان کے قالب میں ڈھال کر سائنس کے علوم کو عروج تک پہنچایا۔ اسی طرح اہل یورپ نے مسلمان سائنسدانوں کے کام سے استفادہ کیا، پہلے علم کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور پھر ترقی کی راہیں کھلتی گئیں۔ جدید علوم وفنون، نئی تکنالوجی اور سائنس کے نئے منکشف ہوتے ہوئے گوشے جدید دنیا کی ترقی کے لیے ناگزیر حقیقت بن گئے ہیں اور یہ علوم قوم کی ترقی کی راہیں ہموار کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان شعبوں میں ہونے والی ترقی نے ان مضامین کے ترجمہ کی طلب میں بھی اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ کیا ان علوم سے ترجمہ کے بغیر کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ہمارے جیسے ممالک جو کہ غلامی کے ایک طویل دور سے گزرے ہیں جس کے نتیجے میں تہذیبی یلغار کے سبب ہماری زبانیں مقام ووقار کسی حد تک کھو چکی تھیں۔ ترجمہ ان زبانوں کو اپنے منصب پر واپس لانے اور جدید علوم کو عام کرنے میں ایک آلہ کا کام کرتا ہے۔

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انگریزی کی ایک عالمگیر زبان کے طور پر پوری دنیا میں پہچان ہے اور سائنس سے متعلق نئے علوم وتحقیق انگریزی میں ہی دستیاب ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جدید علوم پر انگریزی زبان کی بالادستی ہے۔ ان کا اردو میں ترجمہ کرنے میں بہت سے امور سے نبردآزما ہونا پڑتا ہے۔ ان میں اردو وانگریزی کے درمیان ساختی تغیرات، الفاظ ونحو، مترجمین کا دونوں زبانوں پر عبور، وغیرہ شامل ہیں۔

بلاشبہ زبان کی ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ ترجمہ نگاری محض لفظیات کو ایک زبان (S.L) سے دوسری زبان (T.L) میں منتقل کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ متن (Text) کے قریب تر معنی کا ابلاغ، ترجمہ نگاری کی مشکلات کے ضمن میں، زبان کے لسانی، ثقافتی تخلیقی پیرایۂ اظہار کے ساتھ منسلک ہے۔ لسانی سطح پر ہر لفظ جو کہ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اس لفظ کا، ابلاغ، اظہار، معنی مطالب اور ادبی، لسانی، ثقافتی حوالوں سے کئی روشن، مبہم اور خوابیدہ پہلو رکھتا ہے اس لیے ترجمہ کے لیے ان لفظیات کا دونوں زبانوں میں ایک جیسے معنی مہیا کرنا مشکل تخلیقی جہت ہے۔

سائنسی اور تکنیکی متن کو اردو میں پیش کرنے میں متعدد لسانی مسائل سے روبرو ہونا پڑتا ہے۔ سینی (Seiney,1985) کے مطابق تکنیکی تراجم میں تقریباً 40 سے 60 فیصد غلطیاں اصطلاحات پر مبنی ہوتی ہیں اور مترجم کا بیشتر وقت متبادل اصطلاحات تلاش کرنے میں سرف ہوتا ہے۔ اسی لیے سائنسی ترجمہ کو حقیقی عقلی چیلنجز (real intellectual challenge) سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تراجم کے سلسلہ میں ایک بڑا مسئلہ اصطلاحات کے معیار کا ہے۔ فی الحال صورت حال یہ ہے کہ ایک ہی اصطلاح کا ترجمہ نہ صرف مختلف اداروں میں ایک ہی درجہ کے اسباق میں مختلف ملتا ہے۔ مثلاً ایک بچہ سائنس میں چھٹی درجہ میں جو اصطلاح پڑھ کر آرہا ہے ساتویں درجہ میں اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ استعمال ہوتا ہے کیونکہ ترجمہ کرنے والے افراد مختلف ہوتے ہیں اور وہ اپنی عقل وسمجھ کے مطابق ترجمہ کر دیتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک معیاری سائنسی اردو اصطلاحات کی لغت تیار کی جائے جو قومی سطح پر منظور شدہ ہو۔ نئی یا غیر معروف اصطلاحات کے ترجمہ کے ساتھ وضاحت بھی شامل کی جائے تاکہ قاری کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ایک قومی سطح کی ایجنسی کے ذریعہ شائع کردہ کتب میں اس طرح کی

مثالیں دیکھنے کوملیں۔آٹھویں درجہ کی سائنس کی کتاب میں Bird Humming کا ترجمہ گنگنانے والی چڑیا کیا گیا جب کہ اردو میں اس کے لیے شیر خور اصطلاح مروج ہے۔ساتویں درجہ کی سائنس کی کتاب میں انگریزی میں موجود Batter Idli کا ترجمہ مترجم نے اڈلی مکھن کیا۔ غالباً مترجم مشرقی ہندوستان سے تعلق رکھتا ہوگا اور اڈلی میں استعمال ہونے والے آمیزہ سے ناواقف رہا ہوگا اسی لیے Batter اور Butter میں تفریق نہیں کر پایا۔اسی طرح ریاضی کی درجہ دسویں کی کتاب میں سال کے شروع ہونے کے لیے ہندی میں 'ورشارمبھ' درج تھا جس کا ترجمہ 'بارش کا آغاز' یعنی 'ورش' اور 'ورشا' میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے تصور کو ہی غلط۔ملط کر دیا گیا۔تھیوریز (2002) کے مطابق سائنسی مترجمین کا بنیادی مقصد معلومات کو واضح، جامع، اور درست طریقہ سے پیش کرنا ہوتا ہے۔مترجمین کا کام آسان نہیں ہے ان کو اصل متن کی صحیح سمجھ بھی ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ تحقیق بھی ضروری ہے تاکہ وہ نہ صرف متن کو بلکہ موضوع کو بھی سمجھ سکیں۔

یاویل اور لیٹن سویس (Yowell & Latanswish, 2000) نے تکنیکی اصطلاحات کی دو اقسام میں درجہ بندی کی ہیں۔ بین الثقافتی تسلیم شدہ اصطلاحات اور ثقافتی مخصوص اصطلاحات۔ بین الثقافتی اصطلاحات دراصل آفاقی یا عالمگیر اصطلاحات ہیں یعنی وہ جن کا کسی خاص ثقافت سے تعلق نہیں ہے۔موخرالذکر اصطلاحات وہ ہیں جو مخصوص ہیں اور صرف ایک زبان سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ ہی اصطلاحات ترجمہ میں مسئلہ بنتی ہیں۔

ترجمہ نے متبادل یا مترادف کے نظریہ کے ظہور کے لیے ایک نئی بحث چھیڑ دی۔ جب ترجمہ کرنے والی زبان میں وہ مخصوص اصطلاح نہیں ملتی ہے تو ہم اس کے مترادف کوئی لفظ استعمال کر لیتے ہیں۔ یہ کہاوتوں، محاوروں، صنعتی فقروں کا ترجمہ کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ایک قومی سطح کی ایجنسی کے ذریعہ شائع کردہ کتاب دسویں درجہ کی سماجی علوم کی کتاب میں انگریزی میں ایک جگہ Haves and Have nots کا ترجمہ ہے اور نہیں ہے، کیا گیا اور یہ وہ کتاب ہے جس کا ہر سال review کیا جاتا ہے۔

ترجمہ کرتے وقت مقامی تاثر (Colloquial expression) ثقافتی ماحول کی تلاش بہت مشکل مرحلہ ہے تاہم سماجی و معاشرتی مطالعہ اس سلسلے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔مگر اس کے باوجود بہت سے الفاظ جو مخصوص ثقافتی عمل کی پیدوار ہوتے ہیں ان کا نعم البدل کسی دوسری زبان(T.L) میں ممکن نہیں ہوسکتا۔ترجمہ کے میدان کے ماہرین لینارڈو(Leonardo,2000) اور ڈاربیلنیڈس (Darbelneds,1958) کا ماننا ہے کہ ترجمے کے عمل میں مترجم کا کردار فیصلہ ساز کا ہوتا ہے۔ جب مترجم محسوس کرتا ہے کہ لسانی نقطہ نظر سے ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے وہ یا تو دوسری زبان سے الفاظ

سائنس کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے بعض اصطلاحات اتنی عام فہم ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کو ڈھالا جا سکتا ہے۔مگر بعض کا ترجمہ کرنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ کچھ مکتب فکر ہر لفظ کا ترجمہ چاہتے ہیں جو کبھی کبھی زبان کو بہت ثقیل بنا دیتے ہیں۔

مستعار لیتا ہے یا ایک نیا لفظ ایجاد کرتا ہے۔کامیاب ترجمہ کے حصول کے لیے تین بنیادی تقاضے ؛فطری اظہار، قاری کونظر میں رکھتے ہوئے مترادفات، اور اصل متن کے روح ومصنف کے انداز کی ترسیل کرنا، ضروری ہیں۔ترجمہ نگاری میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت ہم پلہ الفاظ تلاش کیے جائیں جس کے لیے لغت کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن ناکامی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ لفظوں کے باہمی تال میل کو مدنظر رکھا جائے اور الفاظ کی ترتیب عمدہ ہو۔

پروفیسر جیلانی کامران ''اردو زبان میں ترجمے کے مسائل'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کوئی ترجمہ سو فیصد اصل متن کے مطابق نہیں ہوتا اور دوسری بات یہ نظر آتی ہے کہ خواہ گفتگو ہی کے جملوں کو دو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے جہاں زبانیں ایک ہی لسانی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں وہاں جملے کی ساخت قریباً یکساں ہوگی لیکن جہاں ایسے لسانی گھرانے موجود نہیں وہاں جملے کی ساخت میں ردوبدل کرنا ضروری ہوتا ہے ان دونوں باتوں کو ترجمے کے عمل کی بنیادی دشواری قرار دیا جاسکتا ہے''۔

اگر ترجمہ ایک ہی لسانی خاندان کی دو زبانوں کے مابین ہو تو بہرحال ترجمے کے عمل میں آسانی میسر آجاتی ہے لیکن ترجمے کی اصل مشکل S.L اور T.L کا ایک لسانی گروہ سے نہ ہونا ہے۔ اس مشکل پر قابو پانا، اگرچہ اذیت ناک تخلیقی عمل ہے جس کے لیے مترجم کو صرف لفظی ترجمے سے گریز کرنا ہوتا ہے اور اسے اپنی دیگر صلاحیتوں کو آزمانا پڑتا ہے کیونکہ زبان میکانکی عمل نہیں ہے۔مترجم کو چاہیے کہ وہ اپنی تخلیقی حسیّات کو بروئے کار لائے۔جس سے کہ ''زبان کے معنوی اور اظہاری جہتوں میں اضافہ ہوگا تو اس میں تنوع کے ساتھ اجنبیت بھی آئے گی اور اسی طرح زبان کا چٹخارہ لینے والوں کو اس میں کچھ نہ کچھ کھردرا پن بھی محسوس ہوگا اس لیے بعض لوگ تخلیقی ترجمے سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ترجمہ شدہ تحریر ''ترجمہ نہ معلوم ہو''۔

سائنس کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے بعض اصطلاحات اتنی عام فہم ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کو ڈھالا جا سکتا ہے۔مگر بعض کا ترجمہ کرنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ کچھ مکتب فکر ہر لفظ کا ترجمہ چاہتے ہیں جو کبھی کبھی زبان کو بہت ثقیل بنا دیتے ہیں۔ ہر سائنسی اصطلاح کو اپنی زبان میں ڈھالنا مناسب نہیں۔ کچھ ایسے مروج الفاظ واصطلاحات ہوتی ہیں کہ ان کو بچہ بچہ جانتا ہے۔مثال کے طور پر لفظ ایسڈ ترشہ سے زیادہ مروج ہے۔ترجمہ کرتے وقت اکثر مترجمین کا جھکاؤ عربی اور فارسی کے الفاظ کی طرف زیادہ ہوتا ہے بالمقابل ہندی اور انگریزی جس کے نتیجے میں عام فہم اور زبان پر رواں الفاظ کے بجائے ثقیل الفاظ استعمال کر لیے جاتے ہیں۔ یہاں اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ ہر انگریزی اصطلاح بین الاقوامی اصطلاح نہیں ہے۔دوسری قابل ذکر زبانوں میں ان کے لیے جو الفاظ مستعمل ہیں وہ املا اور صوتی اعتبار سے مختلف ہیں۔ سائنسی اصطلاحات میں ادب والوں اور ادبی ذوق رکھنے والے لوگوں کا زیادہ عمل دخل نہیں ہونا چاہیے بلکہ

ان اصطلاحات کو وضع کرتے وقت سائنس سے متعلق ماہرین سے رائے مشورہ لینا ضروری ہے۔ اردو والوں کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ اردو ان کی مادری زبان ہے اور انگریزی وہ جانتے ہیں تو وہ کسی بھی علمی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر سکتے ہیں۔ سائنسی علوم کے ترجمہ سے پہلے اپنی زبان پر عبور اور انگریزی کے الفاظ، محاوروں اور اسالیب بیان کو سمجھنے اور اس کے لیے مناسب و موزوں الفاظ کا ذخیرہ موجود ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ سائنس کا علم بھی ایک لازمی شرط ہے۔ ساتویں جماعت 'دی ایبز'، دیا گیا ہے 'زمین سورج کی توانائی کے 2,000,000,000 حصوں میں سے صرف 1 حاصل کرتی ہے'۔ تاہم، اردو ترجمہ میں 'صرف 1' حصہ غائب ہے۔ موثر طریقے سے یہ بتانا کہ زمین سورج کی توانائی کے 2,000,000,000 حصے حاصل کرتی ہے۔ ترجمے میں صرف دو الفاظ کی عدم موجودگی نے حقیقت کو مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ یعنی ترجمہ کے لیے محض دونوں زبانوں پر عبور ہی کافی نہیں بلکہ سائنس کی بھرپور جانکاری بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ علمی اصطلاحات کے لیے فرہنگ، قاموس، اور لغات سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ منشی ذکاء اللہ خاں اور عبدالحق کے کچھ ترجمے بھی موجود ہیں جن سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔

ہمارے ملک میں سائنسی علوم کو اردو میں ڈھالنے کا کوئی مربوط پروگرام نہیں ہے۔ انفرادی سطح پر کام ہوتے ہیں۔ اس کے لیے قومی سطح پر کام ہونا چاہیے۔

S.L کے اصل متن سے ہم آہنگ ترجمہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مترجم اصل متن کا بار بار مطالعہ کرے اور جمالیاتی سطح پر ترجمہ کے معنی و مفہوم کو اس طور سے باہم کر دے کہ قاری کو اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ ترجمہ نگاری میں S.L اور T.L کے مابین ثقافتی عنصر بہت اہم جہت ہے اور مشکل ترین مرحلہ بھی۔ کیونکہ دونوں زبانوں کا تہذیبی ثقافتی میلان مختلف ہوتا ہے ایسے میں دو مختلف زبانوں کے درمیان ثقافتی ہم آہنگی تلاش کرنا بہت ہی نازک پہلوؤں کی طرف عرق ریزی کا مطالبہ کرتی ہے۔ کیونکہ ترجمہ کرتے وقت مترجم کو دوسری زبان کے مفہوم اور تہذیبی ثقافتی فضا کو بھی برقرار رکھنا پڑتا ہے۔

ترجمے کا اصل مدعا اور مقصد خیال اور مفہوم کی شفاف ترسیل ہے۔ اس مقصد کے لیے زبان اور بیان پر گرفت بہت ضروری ہے۔

> **ترجمہ کی حکمت عملی میں اضافہ کر دینا، حذف کرنا، اور متبادل پیش کرنا (Addition, Omission, and Substitution) عام حکمت ہائے عملی ہیں جن کو مترجم لغوی یا عملی مسائل کو حل کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ نیو مارک (Newmark, 1988) نے بتایا ہے کہ مترجم کچھ ثقافتی، تکنیکی، اور لسانی عناصر کو واضح کرنے کے لیے اضافی معلومات شامل کرنے کا رجحان رکھتے ہیں یا غیر ضروری معلومات کو چھوڑنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اس طرح، ایسی تکنیکوں کے استعمال کی مترجم کو چھوٹ ہونا چاہیے۔**

اسی طرح قواعد اور جملہ سازی کی رُو Source Language-(S.L.) انگریزی میں (Subject, Object, Verb) جس سے فقرہ سازی کی جاتی ہے اس مماثلت کا (Translated Language-(T.L.) اردو میں جملہ کی ساخت کا انداز جدا ہوتا ہے۔

'اردو میں سب سے پہلی مشکل تو جملوں کی ہے۔ اردو دراصل چھوٹے چھوٹے جملوں کی زبان ہے اور بڑے جملوں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ انگریزی میں طویل جملے ہوتے ہیں۔ طویل جملے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا قاری کے ذہن میں جو تصویر بٹھانا چاہتا ہے اس کو وہ ٹکڑوں کی بجائے سالم کا سالم پیش کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اردو میں جب آپ ترجمہ کرتے ہیں تو طویل جملوں کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں منقسم کرنا پڑتا ہے جس سے تحریر کا مجموعی تاثر و منطقی تسلسل قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے فن ترجمہ نگاری میں زبان کے مزاج کو دریافت کرنا از حد ضروری ہے کیونکہ زبان کا ایک آلہ (Tool) کے طور پر استعمال ہونا، بہت سادہ عمل نہیں ہے۔

ترجمہ کی حکمت عملی میں اضافہ کر دینا، حذف کرنا، اور متبادل پیش کرنا،(Addition, Omission, and Substitution) عام حکمت ہائے عملی ہیں جن کو مترجم لغوی یا عملی مسائل کو حل کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ نیو مارک (Newmark, 1988) نے بتایا ہے کہ مترجم کچھ ثقافتی، تکنیکی، اور لسانی عناصر کو واضح کرنے کے لیے اضافی معلومات شامل کرنے کا رجحان رکھتے ہیں یا غیر ضروری معلومات کو چھوڑنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اس طرح، ایسی تکنیکوں کے استعمال کی مترجم کو چھوٹ ہونا چاہیے۔

سائنسی اور تکنیکی متن کا اردو میں ترجمہ مشکل ہے، خاص طور پر اس وقت جب اصطلاحات کا مناسب مترادف نہ ملے۔ ترجمے میں بنیادی مشکلات لسانی ساخت، ثقافتی ہم آہنگی، اور اصطلاحات کے معیاری ترجمے سے متعلق ہیں۔ مترجمین کو دونوں زبانوں پر مکمل عبور کے ساتھ، موضوع کی گہری سمجھ اور تحقیقی مہارت بھی درکار ہوتی ہے۔ سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کے ترجمے میں ماہرین کی مدد ضروری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ، ایک معیاری لغت تیار کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ یکسانیت برقرار رہے۔ مترجم کا کام تخلیقی ہے، اور اس میں زبان کے مزاج کو سمجھنا لازمی ہے۔

ماخذ و مصادر

- جیلانی کامران، پروفیسر، مقالہ، شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات، مشمولہ روداد سیمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان: اشاعت 1986
- سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، مقالہ، افسانوی ادب کے تراجم، مشمولہ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان، اشاعت 1986
- شاہد حمید، مترجم، فن شخصیت، انٹرویو، روزنامہ ایکسپریس، اشاعت 19 نومبر 2008
- جمیل جالبی، ترجمہ کے مسائل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتب، ڈاکٹر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ: اشاعت 2004
- حامد بیگ مرزا، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول 1988

Talmeez Fatma Naqvi
Associate Professor CTE, MANUU
College of Teacher Education Bhopal
MANUU Shantinagar, Near Prakash Vidyalaya
Airport Road Bhopal-462001 (MP)
Email: naqvitalmeez@gmail.com

ریاض توحیدی

اظہار خضر کی تنقید نگاری

ادبی تنقید ایک فن کی حیثیت رکھتی ہے جو صرف تبصراتی نوعیت کی گفتگو کرنے کے دوران خوبی خامی کی نشاندہی کرنے کا عمل نہیں ہے بلکہ کسی بھی معیاری متن کو ادبی وفنی اور تخلیقی ڈسکورس بنانے کا فن ہے۔ اس مناسبت سے دیکھا جائے تو اظہار خضر (پیدائش 1955۔ وفات 14 مارچ 2026 پٹنہ بہار) کا شمار عصر حاضر کے ان ناقدین میں ہوتا تھا جو واقعی تخلیق اور تنقید کے مابین تجزیاتی ڈسکورس قائم کرنے کی علمی بصیرت اور تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ یہ خوبیاں ان کی تصانیف ''زبان کی جمالیات'' ''تجزیے۔۔۔اردو فکشن سے مصافحہ'' اور ''کھرے کھوٹے تبصرے'' کے مطالعہ سے واضح طور پر عیاں ہوجاتی ہیں۔ان تصانیف میں شعرو فکشن اور تخلیقی نثر کو دانشورانہ انداز سے موضوع بنایا گیا ہے۔

عام مشاہدہ ہے کہ بیشتر لوگ افسانے کا تجزیہ کرنے کے بجائے اس کی کہانی کو مضمون میں دہراتے ہیں یا کسی ایک بات کو ذہن میں رکھ کر اکتا دینے والی غیر ضروری تشریح کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اظہار خضر چند اہم ناقدین کی طرح تخلیق سے تنقیدی مصافحہ کرتے ہوئے تجزیاتی تنقید کے عمدہ نمونے پیش کرتے ہیں۔ تخلیقی مزاج کا حامل انسان اگر تنقیدی بصیرت بھی رکھتا ہو تو اس کی تنقید بھی تخلیقی نوعیت کی ہوتی ہے اور راقم کا تجربہ ہے کہ ایسا نقاد کسی بھی تخلیق کی روح تک پہنچ کر مثالی تجزیہ پیش کرسکتا ہے۔ کتاب ''تجزیے...اردو فکشن سے مصافحہ'' کا انتساب ایسے ہی تخلیق آشنا نقادوں کے نام دیکھ کر دل شاد ہوتا ہے:

''ان تخلیقیت آشنا نقادوں کے نام جو تخلیق کے باطن کے سیاح ہیں۔'' (انتساب)

مسئلہ بھی یہی ہے کہ جب کسی کی سمجھ میں تخلیق میں پوشیدہ تخلیقیت (Creativity) کی خوبی آجائے تو وہ اس تخلیق کے باطن میں چھپے معنوی جوہر کو باہر نکال سکتا ہے اور خود بھی کتاب کی ابتدا میں مصنف تنقیدی منصب کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ ''نقاد تخلیقی فن پاروں میں پنہاں فکر وقدر کی بساط بھر نشاندہی کرتا ہے۔'' (ص: VII) اس طرح سے کتاب میں شامل اٹھارہ افسانوں، پانچ ناولوں اور چار متفرق مضامین میں تخلیقی تنقید کا دلچسپ تجزیاتی منظرنامہ سامنے آتا ہے۔ان تجزیوں کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں کسی بھی افسانے کے تجزیے کے دوران پہلا ارتکاز اس کے تخلیقی رچاؤ پر کیا گیا ہے اور پھر دوران بحث موضوعاتی اور فنی سطح پر ادبی، سماجی اور تخلیقی توضیح کا کینوس پھیلایا گیا ہے، جس کی وجہ سے افسانے یا ناول کے موضوع یا کہانی کی فنی اور معنوی جہات پر مدلل گفتگو نظر آتی ہے۔ غلام عباس کے مشہور زمانہ افسانہ ''آنندی'' کا موضوع اگرچہ نشاط انگیز رومانی کیفیت کا حامل ہے تاہم اس کا تجزیہ کرنے کے دوران رومانی احساس اور پھر اس افسانے کے فکر وفن اور سماجی کج رویوں کے پہلوؤں کو ناقدانہ فکر سے یوں اجاگر کیا گیا ہے:

''رومان پسندی تو فرد، زندگی اور سماج کی جملہ سرگرمیوں سے تعلق رکھتی ہے جس میں فکر وسوچ کی نشاطیہ طرب انگیزیاں اور الم انگیزیاں دونوں ہی صورتیں فنکار کے پیش نظر رہتی ہیں اور جن کی انسانی اور سماجی معنویت ان کے تخلیقی ذہن کو مہمیز کرتی رہتی ہے۔اس نکتے کے پیش نظر عرض یہ کرنا ہے کہ غلام عباس نے افسانہ ''آنندی'' میں زندگی کرنے کے دوہرے معیار اور ایک مفاد پرست انسانی ذہن پر ہی نشانہ سادھا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ''آنندی'' فکروفن کی سطح پر انسانی اور سماجی کج رویوں کا ایک المیہ نامہ ہے۔ ساتھ ہی اس میں جن لمحاتی نشاطیہ طرب انگیزیوں کا بیان ہوا ہے وہ ہماری سماجی اور انسانی زندگی کے لئے ایک تازیانہ کا درجہ رکھتی ہیں۔'' (ص: 5-4)

یہی ایک ناقد کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ تجزیہ کرنے کے دوران معمولی قسم کے چند جملے لکھنے یا صرف کہانی کو دہراتا نہیں ہے بلکہ وہ معیاری تخلیق کے ہر پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے معیار ومقصد کو بھی سامنے لاتا ہے اور اظہار خضر کی طرح افسانہ ''آنندی'' کے فکری وفنی، تخلیقی و جمالیاتی اور سماجی آنند کا تنقیدی منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

شامل کتاب جتنے بھی افسانے یا ناول تجزیاتی عوامل سے گزارے گئے ہیں اس میں خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ تخلیق کے فکری وفنی عناصر، تکنیکی واسلوبیاتی خصائص اور موضوعاتی پیش کش کا حسب مناسب تجزیہ کیا گیا ہے، جس سے اس افسانے یا ناول کا فکری وفنی

یہی ایک ناقد کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ تجزیہ کرنے کے دوران معمولی قسم کے چند جملے لکھنے یا صرف کہانی کو دہراتا نہیں ہے بلکہ وہ معیاری تخلیق کے ہر پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے معیار و مقصد کو بھی سامنے لاتا ہے اور اظہار خضر کی طرح افسانہ ''آنندی'' کے فکری و فنی، تخلیقی و جمالیاتی اور سماجی آنند کا تنقیدی منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

اور تخلیقی معیار بھی واضح طور پر سامنے آتا ہے۔جیسے افسانہ'' گرہن'' کی کہانی کے پس منظر میں موجود راجندر سنگھ بیدی کی سماجی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کے امتزاجی ملاپ کو یوں اجاگر کیا گیا:

''اس افسانے میں بیدی کے فکروفن کا مرکز ومحور فرد اور سماج کی جبریہ خواہش ہے اور یہی اس افسانے کا تخلیقی اختصاص بھی ہے جہاں بے جا آرزؤں اور تمناؤں کے صنم کدے میں سجے سجائے بتوں کی پرستش لازمی ہے! اب دیکھئے کہ ہولی پہلے ہی سے تلے اوپر چار بچوں کو جنم دے چکی تھی۔ کیڑوں کی طرح یہ بچے ابھی رینگ ہی رہے تھے کہ پانچویں کی متوقع آمد سسرال والوں کے لئے مژدہ جانفزا سے کم نہ تھا۔بھلے ہی نحیف ونزار ہولی کی جان چلی جائے۔''(ص:12)

افسانہ ''گرہن'' سیکڑوں قارئین و ناقدین کی نظروں سے گزر چکا ہے اور ہر قاری اپنے طور پر اسے سمجھ بھی جاتا ہے اور ناقدین بھی اپنی فہم وفراست کے مطابق اس کا تبصرہ یا تجزیہ کرتے رہتے ہیں جو کہ اس افسانے کی معیار پسندی کا عمدہ ثبوت ہے ۔اظہار خضر نے بھی حسب مناسب ان پہلوؤں پر گفتگو کی ہے جس پر پہلے ہی کئی ناقدین کر چکے ہیں، تاہم ایک ماہر سماجی نفسیات کی طرح انھوں نے افسانے میں پوشیدہ سماجی نفسیات کے اس پہلو کو دلیل کے ساتھ اجاگر کیا ہے جو کہ افسانے کا پیامی تھیم ہے اور جو افسانہ نگار کے افسانہ لکھنے کا مقصد بھی رہا ہے۔ اب تجزیہ کار اگر کہانی دہرانے تک ہی خود کو محدود رکھتا تو تبصرہ یا تجزیہ کرنے کی کیا ضرورت تھی، کہانی تو قاری کی سمجھ میں آ ہی جاتی ہے لیکن یہاں پر افسانے کے فنی وفکری اور موضوعاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے سماج کی' جبریہ خواہش' کے نکتے کو ابھار کر ایک تجزیہ نگار کی تفہیمی بصیرت بھی سامنے آتی ہے اور یہی ایک ماہر تجزیہ کار کا اختصاص ہوتا ہے کہ وہ فن پارے کی خارجی اور داخلی ادبی معنویت کو ظاہر کرے۔اس طرح سے اظہار خضر نے بیدی کو ادبی سماجیات کے ایک باکمال تخلیقی فن کار کے روپ میں سامنے لایا ہے۔

فکشن نگار مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر جب کسی بھی موضوع کو فن کے قالب میں ڈھالتا ہے تو کبھی وہ افسانے اور کبھی ناول کی صورت میں ایک فن پارے کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔اس میں فنی صنعت گری کا کمال دکھانا پڑتا ہے اور فنی صنعت گری کا یہی کمال کسی بھی باشعور ناقد کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں اہم رول ادا کرتا ہے، نہیں تو آج تک سیکڑوں افسانے اور ناول سامنے آئے ہیں لیکن ان میں ایک محدود تعداد ہی ایسی ہے جن پر لکھا گیا ہے یا لکھا جارہا

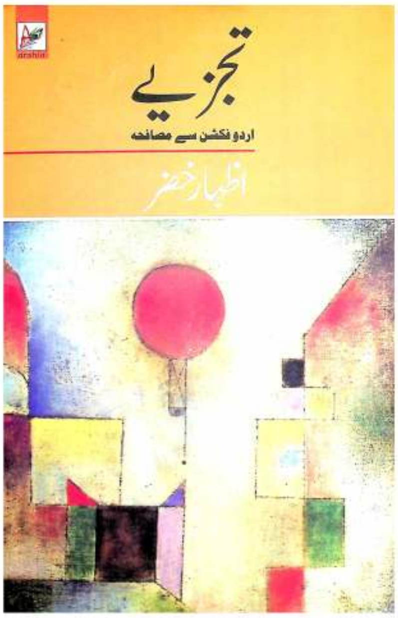

ہے۔پیش نظر کتاب میں چند اہم ناولوں کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے اور یہاں پر بھی مصنف نے تجزیاتی کارگزاری کے دوران انفرادی نوعیت کے مضامین لکھے ہیں۔ ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' کا جائزہ لیتے ہوئے پہلے تخلیقی اظہار کی اہمیت اور ناول یا تخلیقی متون میں سیاسی وسماجی اور تہذیبی موضوعات ومسائل کی تخلیقی پیش کش کے فنی طریقہ کار کے امتیازی مضمرات پر گفتگو کی گئی ہے اور ایک معیاری تخلیق کے اسلوب کے تعلق سے ایک خوبصورت جملہ کہا گیا ہے کہ'' یہ سارا عمل اسی وقت ممکن ہے جب فن کار، فن تمجید نگاری (Art of sublime writing) کا ادا شناس ہو۔'' (ص: 144)۔اس کے بعد ناول پر گفتگو کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ'' قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کی عقبی زمین جس قسم کی فکریاتی سرگرمیوں سے زرخیز ہوتی رہی ہے، اس میں تاریخ، تہذیب اور سیاست کے موضوعات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔''(ص:146)۔اس ناول کا جائزہ لیتے ہوئے قرۃ العین کے شاہکار ناول'' آگ کا دریا'' اور ان کی ناول نگاری کی مجموعی فن کارانہ خوبیوں کا بھی جستہ جستہ احوال پیش ہوا ہے جو کہ مضمون کی افادیت قائم رکھنے میں سود مند نظر آتا ہے نہ کہ اکتا دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ کتاب'' تجزیے...اردو فکشن سے مصافحہ'' تنقیدی نوعیت کی ایک ایسی تصنیف ہے جس میں فکشن شعریات کے دائرے میں افسانوں اور

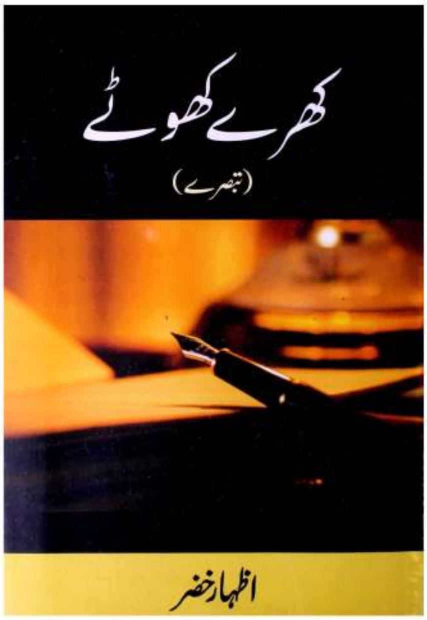

ناولوں کا ماہرانہ تجزیہ پیش ہوا ہے اور ان تجزیوں کے مطالعہ کے دوران اظہار خضر کے تخلیقی مزاج، جمالیاتی احساس اور تجزیاتی اپروچ کا ایک ایسا اختصاص ابھر کر سامنے آتا ہے جو کہ ان کی تنقید نگاری کا شناخت نامہ بن جاتا ہے۔ اس کتاب کی قرات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی بھی تخلیق کو سمجھنے، اس پر غور وفکر کرنے اور جائزہ لینے کے ادبی تقاضے کیا ہیں اور کس طرح ایک ناقد کسی بھی معیاری متن کو ڈسکورس بنا کر ترسیلی تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اظہار خضر کی تنقیدی بصیرت کے تعلق سے ماہر جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن فرماتے ہیں:

''اظہار خضر کی تنقید، شعور میں کشادگی پیدا کرتی ہے۔ نقاد کا ذہن اشعار کی معنوی تہہ داریوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو لگتا ہے کہ تجربے اور الفاظ کی ہم آہنگی کی چمک دمک کو جاننے اور پہچاننے کی نظر مل گئی ہے۔'' (ص:245)

اظہار خضر جہاں ایک طرف فکشن تنقید میں یدطولی رکھتے تھے، وہیں دوسری جانب شعری تنقید میں بھی اپنی مہارت کا لوہا منواتے رہے۔ جس کا ثبوت ان کی تصانیف ''زبان کی جمالیات'' اور ''کھرے کھوٹے تبصرے'' میں شامل شاعری پر لکھے گئے مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ زبان اور ادب کے تخلیقی منصب سے متعلق ان کے جو مضامین ان کتب میں شامل ہیں وہ فکری و ادبی اور تنقیدی مباحثہ کے حامل بصیرت افروز پیغام کے حامل ہیں۔ تخلیق میں تخلیقیت ہی اسے تخلیقی جوہر عطا کرتی ہے۔ لیکن اس کا احساس وادراک بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتا ہے۔ تخلیقی عمل میں تخلیقی شناخت کے تعلق سے اظہار خضر نے چند عمدہ مضامین لکھے ہیں۔ ایک تخلیق میں تخلیق کار کا جذبہ واحساس اور فکر وتخیل تخلیقی روپ میں ہی نکھر کر سامنے آتا ہے۔ زبان کے تخلیقی نظام کی توضیح کرتے ہوئے اظہار خضر لکھتے ہیں:

''زبان کے تخلیقی نظام سے میری مراد ہی جدلیاتی نظام ہے۔ جس میں الفاظ اپنے لغومعنی سے ہٹ کر اظہار کی سطح پر ترسیل وابلاغ کے ایک نئے معنیاتی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فنکار کا یہ عمل بالکل شعوری اور ارادی ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ غیر شعوری، غیر ارادی اور فطری ...اس کا جذب واحساس اور تخلیقی شعور ہوتا ہے۔ یعنی فن کی ذکی الحسی اور حس لطیف وہ ضروری تہہ زمین ہے جہاں سے اس کا فکر وشعور ایک آمد کی صورت میں، اس کی تخلیقی حس میں موجزن ہوتا رہتا ہے۔ لیکن فکر وشعور کو لفظوں کا پیراہن عطا کرنے میں اس کے شعور اور ارادے کا فطری طور پر دخل ہوتا ہے یعنی زبان کی اسلوبی ہیئت فنکار کی صناعانہ ہنر مندی (Craftmanship) کی مرہون منت ہوتی ہے۔''

(زبان کی جمالیات:ص40)

مضمون میں زبان کے تخلیقی نظام کی بحث کے دوران انھوں نے کئی شعرا کے کلام اور فکشن نگاروں کی نثری نگارشات مثلاً مرزا دبیر، حیدر علی آتش، فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، سلام بن رزاق وغیرہ کو بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ ادب اور جمالیات کا ذکر پروفیسر شکیل الرحمٰن کے بغیر نامکمل سا نظر آتا ہے، اسی وجہ سے انھیں ''ہندوستانی جمالیات کا تنقیدی استعارہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اظہار خضر نے کئی کتابوں پر مضامین لکھے ہیں، جن میں ماہر جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن کی ایک اہم کتاب ''مولانا رومی کی جمالیات'' بھی شامل ہے۔ کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی بصیرت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ شکیل الرحمٰن کی رومی شناسی کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

اظہار خضر کی تنقیدی نگاری کا احاطہ کریں تو ان کے مضامین میں ناقدانہ بصیرت کا علمی وفکری مباحثہ جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے تخلیق کا فنی وفکری اور معنوی وتکنیکی کینوس دلچسپ انداز سے زیر بحث رہتا ہے اور مضمون معنی خیز تاثر کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔

''پروفیسر شکیل الرحمٰن کی ذہنی وفکری تربیت میں جمالیاتی قدروں کا زبردست دخل ہے، لہٰذا ان قدروں کی تفسیر وتعبیر میں ان کا قلم فنون لطیفہ کی نہ جانے کتنی سرد وگرم لہروں سے ٹکراتا رہا ہے۔ مثنوی مولانا روم میں جمالیات کے حوالے سے اقدار کی سطح پر جس قسم کے اعلیٰ ترین نظام حیات کی مصوری کی گئی ہے اس کی بازیافت میں شکیل الرحمٰن کے قلم نے جو جادو جگایا ہے اس سے ان کی تحریریں نثر کی تخلیقی فنکاری کے ایک عمدہ نمونے کی صورت میں نظر آتی ہیں۔'' (زبان کی جمالیات۔ص198)

اسی طرح شعری تنقید کے تعلق سے انھوں نے کئی اہم مضامین لکھے ہیں۔ جن میں 'مولانا رومی کی جمالیات'، 'جمیل مظہری کا شعری کردار'، 'اختر پیامی کی نظمیں'، 'بشارت...شکیب ایاز'، 'بے کرانیاں...پروین شیر'، 'غبار آشنا...راشد طراز'، 'محاذ پر میں...سردار آصف'، 'شہر افسوس...ارمان نجمی'، 'جہاں گرد....خورشید طلب'، 'نہایت...خالد عبادی'، 'موسم خلاف تھا...احمد نثار وغیرہ شامل ہیں۔

ان مضامین میں انھوں نے ہر شاعر کے کلام کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ اردو نظم نگاری میں پروین شیر ایک مستند نظم گو شاعرہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کی تخلیقی ذہانت میں شاعری و مصوری ایک سکے کے دورخ نظر آتے ہیں۔ اظہار خضر نے ان کے شعری مجموعے ''بے کرانیاں'' میں شامل نظموں کی فکری و فنی تخلیقی صورت گری اور اقداری وموضوعاتی جہات کا مفصل و مدلل جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں کے المیاتی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجموعہ کی بیشتر نظمیں ٹریجڈی کی جمالیات کے بہترین نمونے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظمیں فرد، زندگی اور سماج کی ٹوٹتی، بکھری قدروں کی نوحہ کرتی نظر آتی ہیں۔'' (کھرے کھوٹے:ص۔22)

مجموعی طور پر اظہار خضر کی تنقیدی نگاری کا احاطہ کریں تو ان کے مضامین میں ناقدانہ بصیرت کا علمی وفکری مباحثہ جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے تخلیق کا فنی وفکری اور معنوی وتکنیکی کینوس دلچسپ انداز سے زیر بحث رہتا ہے اور مضمون معنی خیز تاثر کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اظہار خضر ایک بصیرت مند نقاد (An insightful critic) تھے۔ یعنی وہ تخلیق کے تخلیقی جوہر کو ناقدانہ ڈسکورس بناتے تھے نہ کہ سطحی قسم کی تبصرہ نگاری سے کام چلاتے تھے اور موجودہ دور میں ایسے قابل نقاد بہت کم نظر آتے ہیں۔

■

Reyaz Ahmad
Wadipora Handwara Kashmir-193221
Mob. 9906834877
Email: drreyaztawheedi777@yahoo.com

قاضی عبدالستار کے افسانوں میں تہذیبی قدریں

عبدالرزاق زیادی

اردو فکشن کے باب میں قاضی عبدالستار کا نام محض اس لیے اہم اور غیر معمولی نہیں کہ انھوں نے شکست کی آواز، شب گزیدہ، مجو بھیا، صلاح الدین ایوبی، بادل، غبارشب، داراشکوہ، غالب، حضرت جان، خالد بن ولید جیسے گرانقدر ناول اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں اور اردو ناول نگاری کی تاریخ میں بیش بہا اضافے کیے ہیں بلکہ اس لیے بھی ان سے صرف نظرنہیں کیا جا سکتا کیونکہ انھوں نے اپنے فن سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ بغور دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ بیسوی صدی کے نصف آخر میں جن فنکاروں نے اپنی تخلیقات کی بدولت اپنی ایک منفرد بلکہ بالکل جداگانہ روش پر چل کر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ان میں قاضی عبدالستار کا نام سرفہرست تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی نگارشات سے جہاں ایک طرف اردو فکشن کے سرمایے میں قابل قدر اضافے کیے وہیں اپنے منفرد بیانیہ اور انداز واسلوب سے قارئین کو چونکایا بھی۔ اردو فکشن نگاری میں قاضی عبدالستار کی شناخت ایک افسانہ نگار سے کہیں زیادہ ایک ناول نگار کے طور پر زیادہ مضبوط و مستحکم ہے اور ان کے متعدد ناولوں کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے صرف ناول نگاری تک ہی اپنا دائرہ محدود کرلیا بلکہ برخلاف اس کے ان کے افسانوں کی دنیا بھی کافی وسیع ہے اور ان میں وہ سارے اوصاف موجود ہیں جو انھیں اردو افسانہ نگاری کے باب میں ایک عظیم مقام پر فائز کرتے ہیں۔

بہت سے دیگر تخلیق کاروں کی طرح قاضی عبد الستار نے بھی اپنے ادبی سفر کا آغاز فکرسخن سے ہی کیا تھا مگر جلد ہی ان کا رجحان نثر کی طرف ہوگیا اور پھر تاحیات وہ اسی کے ہو کر رہ گئے۔ درجن کے قریب ناول اورمتعدد افسانوں کے علاوہ بڑی تعداد میں ان کے مضامین ومقالات نثری اورتخلیقی وتنقیدی شکل میں موجود ہیں۔ قاضی عبدالستار کو بچپن سے ہی شاعری کے ساتھ ساتھ کہانیاں بھی پڑھنے کا شوق تھا۔ لیکن جلد ہی ان کا میلان کہانیاں لکھنے کی طرف ہوگیا اوران کی پہلی کہانی ''اندھا'' کے عنوان سے محض چودہ سال کی عمر میں 1946 میں شائع ہوئی جبکہ وہ ابھی ثانوی درجات کے طالب علم تھے۔ ان کا یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ سے نکلنے والے رسالہ ''جواب'' میں اس کے مدیر شارب لکھنوی کے آدھے صفحے کے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ مگر باوجود اس کے قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری کا آغاز 1964 سے ان کی کہانی ''پیتل کا گھنٹہ'' سے تسلیم کیا جاتا ہے جو کہ 1964 میں ماہنامہ کتاب (لکھنؤ) میں چھپی تھی۔ اس کہانی کی اشاعت کے بعد قاضی عبدالستار بہت سے ناولوں کے ساتھ ساتھ ایک سے بڑھ کر ایک افسانے بھی لکھتے چلے گئے۔

قاضی عبدالستار کے ناولوں اور افسانو ں میں موضوعات کا بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ تاریخی، تہذیبی، سماجی، نفسیاتی، شخصیتی، جنسی اور رومانی ہر قسم کے موضوعات کو بنیاد بنا کرانھوں نے اپنی کہانیاں اور ناول لکھے ہیں۔ مگر ان کے افسانوں کی انفرادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے سماج کے صرف انھیں مسائل وموضوعات کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے، جن کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا سمجھا بلکہ ان کے ساتھ جیا اور وہ ان کے افکار وخیالات اور مشاہدات وتجرات میں رچ بس چکے تھے۔ اگر عمومی طور پر قاضی عبدالستار کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے پریم چند کے بعد سب سے زیادہ ہندوستان کے گاؤں دیہات کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ان مسائل کو پیش کرنے کا ہرگز مقصد وہ نہیں تھا جو پریم چند یا ان کے متبعین کی کہانیوں میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں بلکہ اس کے ذریعے انھوں نے دراصل اودھ یا پھر پورے ہندوستان کے اس زمیندارانہ نظام اور تہذیبی وثقافتی زندگی کے خاتمے کا ماتم پیش کیا ہے جو ان کے سامنے کی باتیں تھیں۔ نیز ان کے ذریعہ انھوں نے ہندوستان کی اس تہذیب و معاشرت پر اظہار تاسف بھی کیا ہے جو نہ صرف زوال آمادہ ہیں بلکہ ان کی جگہ نئی تہذیبیں اور اقدار وروایات لے رہی ہیں۔ قاضی عبدالستار کے افسانوی مجموعے'' آئینہ ایام'' کے مقدمے میں محمد غیاث الدین لکھتے ہیں:

'' قاضی عبدالستار کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی اس کی Authenticity ہے۔ ان کی ہر کہانی کسی نہ کسی سچے واقعات پر مبنی ہوتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسی پر افسانہ لکھا ہے۔ ان کا تعلق سیتاپور کے زمیندار گھرانے سے رہا ہے اس لیے زمینداروں کی زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ انھوں نے بہت قریب سے کیا ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں زمینداروں اور تعلقداروں کا کردار ہی بنیادی ہوتا ہے۔''[1]

لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اردو افسانوں میں پریم چند اور ان کے متقدمین ومتاخرین کے یہاں دیہات اور زمینداروں کو پیش کرنے کا جو تصور تھا وہ اس طور پر عامیانہ تھا کہ اس میں سماج کے خلاف ان کے ایک رخ یعنی ظلم وجبر کو ہی موضوع بنایا

گیا تھا لیکن برخلاف اس کے قاضی عبدالستار نے اپنے افسانوں میں ان کے دوسرے رخ یعنی ان کی مظلومیت کو بھی بڑی فن کاری اور چابکدستی سے سامنے لایا ہے۔ قاضی عبدالستار کا عندیہ ہے کہ یہ ذی حیثیت زمین دار بھی ہمدرد، منصف، رحم دل اور انسان دوست ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زمین داروں کی گذشتہ آن بان اور شان کی جگہ صرف ان کا نام ونشان رہ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں گاؤں اور دیہات کی زندگی کو پیش کیا ہے اور قاضی عبدالستار نے بھی۔ لیکن دونوں کی پیش کش میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کے دیہات میں کل کا زمین دار اور چودھری آج خود ذلیل وخوار نظر آتا ہے۔ وہ نہ صرف روزی روٹی، لباس وپوشاک اور گھر بار کا محتاج ہیں بلکہ ان کا حال کل کے مفلس، غریب، مزدور اور نوکر سے کچھ زیادہ بہتر نہیں اور اس کے برخلاف کل کے وہی کمزور و مظلوم لوگ آج سرپنچ، لالہ، سرمایہ دار، منصف، کھیا، پردھان، بی ڈی او، آئی اے ایس، ایم ایل اے، ایم پی اور وزیر بن گئے ہیں۔

موضوعاتی سطح پر قاضی عبدالستار کے اس نوع کی فکر وعمل سے اردو افسانے کے موضوعات میں ایک خاص وسعت و گہرائی پیدا ہوئی اور سماج کے اس پہلو کو سامنے لایا گیا جس کو بالکلیہ نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ پیتل کا گھنٹہ، میراث، ممواں لالہ، کھا کھا، رضو باجی، ٹھاکر دوارہ، سایہ، گرلہو میں غلطاں، مجری وغیرہ اس حوالے سے قاضی عبدالستار کی خاص کہانیاں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان افسانوں میں گاؤں دیہات اور زمیندارانہ ماحول اور اس کے احوال وکوائف کو جہاں موضوع بنایا گیا ہے وہیں ان میں ان تہذیبی وثقافتی اقدار وروایات کو بھی جگہ دی گئی ہے جن کے ٹوٹ پھوٹ جانے کا افسوس اس نسل کے بیشتر لوگوں کو تھا اور اب بھی ہے۔ افسانہ ''پیتل کا گھنٹہ'' سے لیا گیا ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''یو۔۔۔یو بھسول ہے۔''

بھسول کا نام سنتے ہی مجھے اپنی شادی یاد آ گئی۔ وہ کلاسکی کاٹ کی بانات کی اچکن اور پورے پائچے کا پاجامہ اور فر کی ٹوپی دیے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر ان کی سفید پوری مونچھیں اور حکومت سے سینچی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے خدمت گاروں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بدھیا لے لیں اور مجھے پہنانے لگے۔ میں نے بل کھا کر اپنی بنارسی کی پوت کی جھلملاتی ہوئی شیروانی کی طرف اشارہ کر کے تلخی سے کہا۔ ''کیا یہ کافی نہیں تھی؟'' ۔۔۔وہ میری بات پی گئے۔ بدھیا برابر کیں۔ پھر میرے ننگے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا۔۔۔''اب تشریف لے جائیں۔'' میں نے ڈیوڑھی پر کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے۔ بتایا گیا کہ یہ بھسول کے قاضی انعام حسین ہیں۔ بھسول کے قاضی انعام حسین، جن کی حکومت اور دولت کے افسانے میں اپنے گھر میں سن چکا تھا۔ میرے بزرگوں سے ان کے

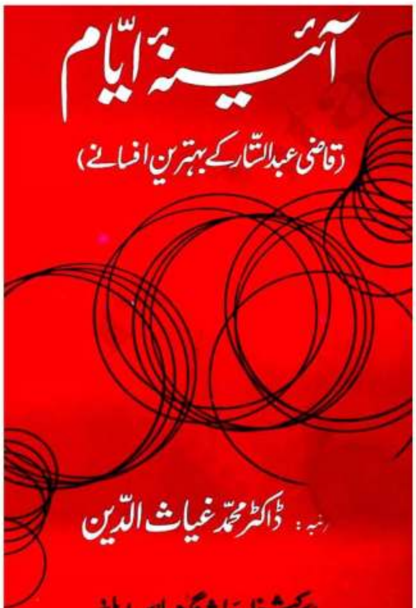

جو مراسم تھے مجھے معلوم تھے۔ جب میں چلنے لگا تو انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، مجھے بھسول آنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس رشتے سے پہلے بھی تم میرے بہت کچھ تھے لیکن اب تو داماد ہو گئے ہو۔ اس قسم کے رسمی جملے سبھی کہتے ہیں لیکن اس وقت ان کے لہجے میں خلوص کی ایسی گرمی تھی کہ کسی نے یہ جملے میرے دل پر لکھ دیے۔''''2

یہ افسانہ درحقیقت قاضی انعام حسین کے برے وقت کی کہانی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں نظام حکومت تھا اور اس کے پاس ہر طرح کی عیش و عشرت، آن بان اور شان تھی۔ مگر اب اس کی زندگی ایک ایسے پڑاؤ پر ہے کہ جہاں امیدوں کے چراغ کب کے بجھ چکے ہیں اور زندگی کے ہر سو میں اندھیرا ہی اندھیرا چھا چکا ہے اور بقول رتن سنگھ تبھی تو ایک کھردرے ہاتھ والا دیہاتی بڑی بے تکلفی سے اپنی بیڑی سلگانے کے لیے مصنف کے ہاتھ سے آدھی جلی ہوئی تیلی چھین لیتا ہے۔ یہ بھی دراصل قاضی انعام حسین کی زندگی میں آئی خستہ حالی کی ہی کہانی کہتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوا کیونکہ جس مصنف نے اچھے دنوں میں قاضی انعام حسین کی حکومت سے سینچی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں وہ کیا دیکھتے ہیں کہ۔۔۔'ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے۔۔۔ڈوریے کی قمیض، میلا پاجامہ ۔۔۔ٹائر کے تلووں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے۔'

اس کہانی میں قاضی عبدالستار نے قاضی انعام حسین کی اس زندگی کو بھی پیش کیا ہے جو اس نے اپنی زمین دارانہ دور حکومت میں گزاری تھی اور بڑی فن کاری اور خوبصورتی سے اس باقی زندگی کی بھی عکاسی کی ہے جس میں اسے ہر چیز سے حرماں نصیبی کا سامنا ہے اور اس کی زندگی میں کوئی بھی امید کی کرن نہیں بچی ہے۔

اسی طرح ان کے دیگر افسانے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ عام طور پر قاضی عبدالستار کے افسانوں کو تین خانوں میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پہلی قسم وہ افسانے آتے ہیں جن میں دیہات، اس کی زندگی اور مسائل ومعاملات کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے خانے میں شہری زندگی اور اس کی سرگرمیوں سے متعلق افسانے ہیں اور تیسرے میں وہ افسانے آتے ہیں جن کا تعلق تاریخ وتہذیب سے ہے۔ دیہات پر لکھے گئے افسانوں میں روپا، سینگ، سایہ، نومی، دھندلے آئینے، گرم لہو میں غلطاں، وراثت، کھا کھا، دیوالی، ٹھاکر دوارہ، قد آدم مشعل، مجری، میراث، گھسو، پیتل کا گھنٹہ، مالکن، رضو باجی، دوگانواں، واپسی، گھسو، ایک کہانی، سالی، ممواں لالہ، نازو، پرچھائیاں وغیرہ اہم ہیں۔ سوچ، ماڈل ٹاؤن، تحریک، داغ، کتابیں، ایک دن، جنگل، مشین، آڑے ترچھے آئینے، پہلی موت وغیرہ ایسے افسانے ہیں جنھیں ہم شہری زندگی کے زمرے میں رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ان کی کچھ کہانیاں مثلاً نیا قانون، سات سلام، غادرہ، آنکھیں، بھولے بسرے وغیرہ وہ ہیں جن کو افسانہ نگار نے تاریخ کو اپنا موضوع بنا کر تخلیق کیا ہے۔

مذکرہ بالا افسانوں کے علاوہ ان کی دیگر تخلیقات کو بھی ہم اگر اس طرح دیکھیں تو قاضی عبدالستار کے فکرو

فن کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔خواہ دیہات کے موضوع پر ان کے افسانے ہوں یا شہری زندگی کے مسائل پر یا پھر تاریخ پر مبنی ہر ایک میں ان کے بیان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔حالات وظروف کے اعتبار سے نہ صرف قاضی عبدالستار الفاظ اور جملوں کا انتخاب کرتے ہیں بلکہ ان کا اسلوب بھی تخلیقات کے پس منظر اور ماحول کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔کسی بھی فنکار کے لیے یہ تبھی ممکن ہوسکتا ہے جب اس کے فنی کمالات اپنے عروج پر پہنچ چکے ہوں۔قاضی عبدالستار اردو کے ایک منجھے ہوئے اور صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں ان کے یہاں یہ کمال بدرجہ اتم موجود ہے۔دیہات کی زندگی ہو یا شہر کی یا پھر تاریخی موضوعات ہر ایک کو پیش کرنے میں قاضی عبدالستار کو بڑا کمال حاصل ہے۔محمد غیاث الدین لکھتے ہیں

''قاضی صاحب نے اودھ کے دیہات اور جاگیر دارانہ تہذیب کے علاوہ شہری مسائل پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ایسے افسانوں کی تعداد کم ہے۔ان افسانوں میں ان کا وہ رنگ نظر نہیں آتا جو دیہات اور تاریخ پر مبنی افسانوں میں ملتا ہے۔چہ جائیکہ ان کے شہری افسانے دیہات کے افسانوں کے مقابلے میں دوئم درجے کے ہیں تاہم ان کی بھی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔یہاں نئے تجربے ملتے ہیں۔سوچ، ماڈل ٹاؤن، جنگل، ایک دن، کتابیں، تحریک، بلاعنوان، پہلی موت، آڑے ترچھے آئینے، مشین اور داغ میں شہروں کی بدلتی ہوئی قدروں، جذبوں، رشتوں اور روایتوں کی بڑی حقیقی عکاسی کی گئی ہے۔''3

قاضی عبدالستار کے افسانوں میں نہ صرف موضوعات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ ان کے یہاں نئے نئے تجربے بھی ملتے ہیں۔بادل، سوچ، جنگل، داغ، دھندلے آئینے، زنجیریں وغیرہ جیسے افسانوں میں قاضی عبدالستار کے یہاں شعور کی رو کا خوبصورت استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔اس کے علاوہ قاضی عبدالستار کے افسانوں کا ایک بڑا امتیاز ان کی زبان و بیان ہے۔ان کی زبان کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ جہاں تخلیقات کی آرائش و زیبائش میں بڑی مستعدی سے اپنے فرائض انجام دیتی ہے وہیں وہ اپنے قارئین کے لیے اس حد تک رہنما بھی ثابت ہوتی ہے کہ مصنف نے اس کو جس مقصد و معنی کے لیے استعمال کیا ہے اس تک قاری بڑی آسانی سے پہنچ جاتا ہے اور اس پر اس کے معنی و مفاہیم بڑی آسانی سے واضح ہوجاتے ہیں۔موقع و محل کے اعتبار سے ایجاز و اختصار کے علاوہ تشبیہات واستعارات اور پیراڈاکس جیسے فنی حربوں کے استعمال نے ان کی زبان میں ایک نمایاں وصف پیدا کر دیا ہے۔قاضی عبدالستار کی زبان و بیان کے اس وصف پر روشنی ڈالتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالستار Paradoxes کے بادشاہ ہیں۔ان کا فن ایڈگر ایلن پو کی یاد دلاتا ہے۔ان کے قلم میں گذشتہ عظمتوں اور کھوئے ہوئے ماحول کو دوبارہ زندہ کرنے کی حیرت انگیز قوت ہے۔ان کی سب سے بڑی قوت ان کی حاضراتی صلاحیت ہے جو دو جملوں میں کسی مکمل صورت حال کو زندہ کردیتی ہے۔ایڈگر ایلن پو کی طرح اس سے انتہائی مختلف سیاق و سباق میں وہ نفسیات کو اجاگر کرنے کے بادشاہ ہیں۔''4

آگے مزید ان کے فکر وفن پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید محمد اشرف لکھتے ہیں کہ:

''قاضی عبدالستار نے اپنے فکشن میں جاگیر دارانہ نظام کے خاتمے کا ماتم نہیں کیا ہے۔ان کا دکھ در اصل یہ ہے کہ اُس نظام کے زوال کے بعد وہ اقدار اُبھر کر سامنے نہیں آسکیں جن کی توقع معاشرے نے کی تھی۔اُس نظام کے زوال کا ماتم دار'شب گزیدہ'، 'غبار شب' اور'بادل' جیسے ناولوں کا انجام نہیں لکھ سکتا تھا۔صناع مطلق نے انھیں اسلوب کے ضمن میں یک رنگ نہیں ہفت رنگ خلعتیں عطا فرمائی ہیں۔وہ اردو کے واحد فکشن نگار ہیں جن کا قلم اپنے موضوع کی مناسبت سے اسلوب تلاش کر لیتا ہے، تراش لیتا ہے۔''خالد بن ولید'' کا اسلوب ''صلاح الدین ایوبی'' اور ''دارا شکوہ'' سے مختلف ہے اور ''غالب'' کا اسلوب ان دونوں اسالیب سے الگ ہے۔''تاجم سلطان'' ایک علیحدہ پیرائے میں لکھا گیا ہے جب کہ ''شب گزیدہ''، ''پہلا اور آخری خط'' اور ''غبار شب'' اودھ کے قصبات اور دیہات کی تہذیب سے اپنا اسلوب وضع کرتے ہیں۔''5

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات اگر ایک طرف قاضی عبدالستار کے فکر وفن کی گواہی دیتے ہیں تو وہیں یہ ان کی فکشن نگاری کے ان اوصاف کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جن کی بدولت انھیں اردو کے افسانوی ادب میں ایک خاص امتیاز و افتخار حاصل ہے۔قاضی عبدالستار صرف مختلف اسالیب کے ہی خالق نہیں بلکہ انھیں اپنی زبان و بیان پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔اگر وہ اپنی بات کو بڑے پر اثر انداز میں بیان کرنے پر قادر تھے تو انھیں انسانی نفسیات کی پیش کش پر بھی مہارت تھی۔کرداروں کے انتخاب وتخلیق اور ان کی نفسیات میں اتر کر سوچنے کا جو ملکہ انھیں حاصل تھا وہ شاید ہی کسی اور کے یہاں موجود ہو، نیز وہ ان کرداروں کے ذریعے ہی وہ ساری باتیں بیان کردیتے ہیں جن کے متقاضی وقت اور حالات ہوا کرتے ہیں۔

مختصراً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آزادی کے بعد جن تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو فکشن کو مالا مال کیا اور اس میں فکری وفنی ہر دو سطحوں پر اپنے اثرات مرتب کرنے میں کامیاب رہے ان میں قاضی عبدالستار کی حیثیت ایک روشن مینار کی ہے۔انھوں نے جہاں اپنے ناولوں میں موضوعات کی سطح پر ایک منفرد دنیا کا انتخاب کیا وہیں انھوں نے اپنے افسانوں میں بھی ایسے ایسے مسائل و معاملات کو جگہ دی جن کی طرف اس سے قبل بہت کم تخلیق کاروں کی نظریں گئی تھیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ قاری کو ان کی کہانیوں میں حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور ان میں بیان کردہ واقعات وحادثات اور مسائل و معاملات خود اس کے یا اس کے سماج کے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی آپ بیتی میں بھی اسے ایک جگ بیتی کا احساس ہوتا ہے۔

حواشی

1۔ مقدمہ، محمد غیاث الدین، آئینہ ایام (قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1995، ص 12

2۔ کہانی پیتل کا گھنٹہ، آئینہ ایام (قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1995، ص 51

3۔ مقدمہ، محمد غیاث الدین، آئینہ ایام (قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1995، ص 13

4۔ بحوالہ جدید اردو افسانہ: اردو-ہندی، طارق چھتاری، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2019، ص 66

5۔ فلیپ، قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری (تنقیدی محاکمہ) مہناز عبید، رابطہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2018

Dr. Abdur Razzaque Ziyadi
D-14(2nd Floor) Lane No.07,
Johari Farm Noor Nagar Extn. Jamia Nagar
Okhla, New Delhi-110025
Mob. +91 9911589715
E-mail: arziyadi@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔قدیم رسائل و مجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہارِ خیال کرنا چاہیے۔رسالے میں اردو زبان و ادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

فرہنگِ اصطلاحات (انگریزی-اردو) معاشیات

صفحات: 369، قیمت: 205 روپے، تیسرا ایڈیشن: 2026

ناشر: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: حرا قمر

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی

معاشیات جدید دور کے اہم ترین علوم میں شمار ہوتی ہے۔ انسانی ضروریات، وسائل کی تقسیم، پیداوار، منڈی، تجارت، مالیات اور ترقی جیسے موضوعات کا مطالعہ معاشیات کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔ چونکہ اس علم کی بیشتر اصطلاحات انگریزی زبان میں رائج ہیں، اس لیے اردو زبان میں معاشیات کا مطالعہ کرنے والے طلبہ، اساتذہ اور محققین کو اکثر اصطلاحاتی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں اصطلاحاتی فرہنگیں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ 'معاشیات: فرہنگِ اصطلاحات (انگریزی-اردو)' اسی ضرورت کے پیشِ نظر مرتب کی گئی ایک اہم کتاب ہے، جو قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کی علمی خدمات کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔

یہ کتاب بنیادی طور پر معاشیات کی انگریزی اصطلاحات کے اردو متبادلات فراہم کرتی ہے، لیکن اس کی افادیت محض ایک لغت یا ڈکشنری تک محدود نہیں۔ اس کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتبین نے معاشیات کے وسیع اصطلاحاتی ذخیرے کو نہایت منظم انداز میں یکجا کیا ہے۔ کتاب کی ترتیب انگریزی حروفِ تہجی کے مطابق ہے، جس سے مطلوبہ اصطلاح تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ یہی خصوصیت اسے ایک موثر حوالہ جاتی کتاب بناتی ہے۔ کتاب کی خوبی اس کی جامعیت ہے۔ عام طور پر اصطلاحاتی لغات میں صرف بنیادی لفظ اور اس کا متبادل درج کیا جاتا ہے، لیکن اس فرہنگ میں ایک بنیادی اصطلاح کے ساتھ اس سے وابستہ متعدد ذیلی اور مرکب اصطلاحات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "Ability" کے تحت صرف 'صلاحیت' کا ترجمہ نہیں دیا گیا بلکہ اس سے متعلق دیگر اصطلاحات بھی شامل کی گئی ہیں جیسے rent Ability, Ability to invest وغیرہ اس اندازِ ترتیب سے قاری کو کسی ایک اصطلاح کے مختلف معاشی استعمالات اور سیاق و سباق کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یوں کتاب صرف الفاظ کے معانی پیش نہیں کرتی بلکہ اصطلاحات کے باہمی تعلق کو بھی واضح کرتی ہے۔ یہ خصوصیت کتاب کو محض لغت کے درجے سے بلند کر کے ایک علمی اور تحقیقی ماخذ بنا دیتی ہے۔

صفحہ نمبر 91 پر "Demand" سے متعلق اصطلاحات کا اندراج اس کتاب کی وسعت اور ترتیب کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ طلب معاشیات کا ایک بنیادی تصور ہے اور اس سے متعلق متعدد اصطلاحات کتاب میں شامل کی گئی ہیں، مثلاً Constant ،Alternative Demand ،Abnormal Demand Decreasing اور Deferred Demand ،Demand Demand وغیرہ۔ ان اصطلاحات کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ مرتبین نے صرف مرکزی اصطلاحات کو جمع نہیں کیا بلکہ ان سے وابستہ مختلف پہلوؤں اور ذیلی تصورات کو بھی شامل کیا ہے۔

اسی طرح کتاب میں صرف معاشی اصطلاحات ہی نہیں بلکہ معاشیات کے فکری اور نظریاتی پہلوؤں کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ صفحہ 299 پر مختلف معاشی مکاتبِ فکر (Schools of Thought) کا ذکر اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ Austrian ،Banking School ،Classical School ،School Monetary اور Orthodox School ،Manchester School School جیسی اصطلاحات کی شمولیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مصنف کی نظر صرف اصطلاحات کے لغوی پہلو تک محدود نہیں رہی بلکہ انھوں نے معاشیات کی فکری روایتوں کو بھی جگہ دی ہے۔

کتاب کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں معاشیات کے بنیادی تصورات کے مختلف ذیلی مباحث کو بھی یکجا کیا گیا ہے۔ صفحہ 326 پر "Supply" سے متعلق اصطلاحات اس کی مثال ہیں۔ Aggregate Supply ،Assured Supply، Joint Supply ،Inelastic Supply ،Elasticity of Supply، Composite Supply اور Competitive Supply جیسی اصطلاحات کا اندراج اس بات کی دلیل ہے کہ کتاب میں کسی بھی تصور کو محدود انداز میں پیش نہیں

کیا گیا بلکہ اس کے مختلف پہلوؤں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

کتاب کی زبان سادہ، واضح اور علمی ہے۔ اردو متبادلات کے انتخاب میں احتیاط کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اصطلاحات کا ترجمہ مفہوم کے قریب ترین ہو۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اردو زبان میں معاشیات کی معیاری اصطلاحات کا مسئلہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ مختلف مصنفین ایک ہی اصطلاح کے لیے مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں، جس سے طلبہ کو الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس فرہنگ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ اصطلاحات کے نسبتاً مستند اردو متبادلات فراہم کرتی ہے اور اصطلاحی یکسانیت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔

تحقیقی اعتبار سے بھی کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔ اردو میں معاشیات پر تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کو اکثر مناسب اصطلاحات کے انتخاب میں دشواری پیش آتی ہے۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر مقالہ نویسی کے دوران درست اصطلاحات کا استعمال انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اور محققین کو ایک قابلِ اعتماد حوالہ فراہم کرتی ہے۔ کتاب مترجمین کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ معاشیات کے انگریزی متون کا اردو میں ترجمہ کرتے وقت اصطلاحات کا درست انتخاب ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ چونکہ اس فرہنگ میں انگریزی اصطلاحات کے اردو متبادلات منظم انداز میں موجود ہیں، اس لیے مترجمین اس سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اساتذہ بھی تدریسی عمل کے دوران اس کتاب کو بطور معاون ماخذ استعمال کر سکتے ہیں۔

اگر چہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک اہم علمی کاوش ہے، لیکن بعض پہلو مزید توجہ کے متقاضی ہیں۔ مثال کے طور پر چند اہم اصطلاحات کے ساتھ مختصر توضیح یا مثال شامل کر دی جاتی تو قاری کے لیے ان کا عملی مفہوم سمجھنا مزید آسان ہو جاتا۔ اسی طرح جدید معاشی مباحث، ڈیجیٹل معیشت، عالمی مالیاتی نظام اور نئی اقتصادی اصطلاحات کے حوالے سے مزید اضافے کی گنجائش موجود ہے۔ تاہم یہ کمی اس حقیقت کو متاثر نہیں کرتی کہ کتاب اپنے بنیادی مقصد میں کامیاب ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو 'فرہنگِ اصطلاحات (انگریزی۔اردو) معاشیات' اردو زبان میں معاشیات کے اصطلاحی ذخیرے کو منظم کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ کتاب صرف اصطلاحات کا مجموعہ نہیں بلکہ معاشیات کے مختلف تصورات، ذیلی مباحث اور فکری روایتوں کی جھلک بھی پیش کرتی ہے۔ طلب، رسد، معاشی مکاتبِ فکر، سرمایہ کاری، مالیات، تجارت اور دیگر معاشی موضوعات سے متعلق اصطلاحات کی جامع موجودگی اس کی علمی اہمیت کو مزید بڑھا دیتی ہے۔

مختصر یہ کتاب معاشیات کے طلبہ، اساتذہ، مترجمین اور محققین کے لیے ایک اہم حوالہ جاتی ماخذ ہے۔ اس کی منظم ترتیب، جامعیت، اصطلاحی وسعت اور علمی افادیت اسے اردو زبان میں معاشیات کی نمایاں کتابوں میں شامل کرتی ہے۔ اردو میں معاشی علوم کے فروغ اور معیاری اصطلاحات کی ترویج کے حوالے سے یہ کتاب ایک قابلِ قدر خدمت انجام دیتی ہے اور بجا طور پر معاشیات کے ہر سنجیدہ طالب علم کے مطالعے کا حصہ ہونی چاہیے۔

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............................ بتاریخ............................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

تحقیق و تنقید

مضامینِ نو: تحقیقی و تنقیدی شعور کا آئینہ

مصنف: ڈاکٹر سہیم الدین صدیقی

صفحات: 206، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: جی این کے پبلی کیشنز نئی دہلی و جموں کشمیر

مبصر: نازنین سلطانہ آصف احمد قادری

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، چشتیہ کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس خلد آباد، مہاراشٹر

اردو ادب میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے مجموعے ہمیشہ علمی و ادبی سرمایہ تصور کیے جاتے ہیں کیونکہ یہ تصانیف ادب کے مختلف گوشوں، شخصیات، اصناف اور فکری رجحانات کو ایک منظّم اور مربوط شکل میں پیش کرتی ہیں۔ ڈاکٹر سہیم الدین صدیقی کی تصنیف 'مضامینِ نو' اسی سلسلے کی ایک اہم اور قابلِ قدر کڑی ہے۔ جو اپنے موضوعاتی تنوع، تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کے باعث اردو ادب میں نمایاں مقام کی حامل ہے۔ اس کتاب کا سرورق نہایت دلکش اور پرکشش ہے۔ جو مصنف کی علمی و ادبی سنجیدگی کی عکاسی کرتا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے کتاب کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے اپنے معاونین اور اہلِ علم کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ اقراء کے عنوان سے انھوں نے اس کتاب کے تعلق سے قارئین کے سامنے اپنی بات رکھی ہے وہ کہتے ہے کہ:

''کتاب 'مضامینِ نو' نہ صرف نئے قلمکاروں کو نئی روشنی، نئی راہ ہموار کرتی ہے بلکہ ہر عمر و ہر زمرے کے قارئین کے لیے ایسے پلِ صراط کا کام بھی انجام دیتی ہے کہ قارئین قدیم لسانی ادب سے لے کر جدید شاعری و جدید نثر سے بھی اپنا رابطہ قائم کرنے کی تحریک حاصل کر سکے۔'' (مضامین نو: ڈاکٹر سہیم الدین: ص 8 تا 9)

کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر قریشی عتیق احمد نے ''دکن را خوش تر و دلکش تر می بیتم کے عنوان سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے دکن خصوصاً اورنگ آباد کی علمی و ادبی روایت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق ڈاکٹر سہیم الدین صدیقی کی یہ تصنیف ان کی تحقیقی ریاضت، فکری جستجو اور ادبی شعور کا حسین مرقع ہے جس میں اردو ادب کے متنوع موضوعات کو نہایت سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر محمد غیاث الدین نے 'ایک نظر' کے عنوان سے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے دکن کی علمی روایت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیم الدین صدیقی کو نئی نسل کے ان محققین میں شمار کیا ہے جو تحقیق و تنقید کے میدان میں سنجیدہ اور مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک 'مضامینِ نو' مصنف کی فکری پختگی، علمی بصیرت اور تحقیقی استعداد کا روشن ثبوت ہے۔ اس ناچیز نے بھی مصنف اور کتاب کے تعلق سے اپنی بات رکھی ہے 'وارثِ دکن ڈاکٹر سہیم الدین' اس عنوان کے تحت ادب محض الفاظ کی بازی گری یا اظہارِ خیال کا نام نہیں بلکہ انسانی شعور، تہذیبی اقدار، فکری رویّوں اور اجتماعی تجربات کی ترجمانی کا ایک موثر وسیلہ ہے۔ ہر ادبی صنف اپنے مخصوص اصول وضوابط کی حامل ہوتی ہے۔ تاہم فن کی وسعت اور اس کی داخلی و خارجی قدروں کا باہمی امتزاج اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ اس کی کوئی جامع اور حتمی تعریف متعین کرنا آسان نہیں۔

کتاب میں شامل مضامین اپنے موضوعاتی تنوع کے باعث خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک جانب امام احمد رضا خان بریلوی کی صوفیانہ فکر، عشقِ رسولؐ اور علمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے تو دوسری جانب سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، عزیز احمد، بشر نواز، فاطمہ رفیق زکریا، نورالحسنین، فہیم احمد صدیقی اور محمد غیاث الدین جیسی اہم شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصنف نے صرف شخصیات تک اپنی گفتگو محدود نہیں رکھی بلکہ اردو ادب کی مختلف اصناف اور فکری مباحث کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مراٹھواڑہ میں اردو غزل، اردو ناولٹ میں اقدار کی تبدیلی، مثنوی کی فنی جہات، اردو تنقید کے ارتقا میں مشرق و مغرب کا کردار، اردو زبان پر عربی و فارسی کے اثرات، تہذیبی و معاشرتی رجحانات اور عصرِ حاضر میں مذہبی آزادی جیسے اہم موضوعات پر مدلل اور تحقیقی انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

مصنف کا اسلوبِ نگارش سادہ، رواں، علمی اور شائستہ ہے۔ انھوں نے پیچیدہ علمی مباحث کو بھی سہل اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کے باعث یہ کتاب صرف طلبہ اور محققین ہی کے لیے نہیں بلکہ عام ادب دوست قارئین کے لیے بھی مفید بن گئی ہے۔ حوالہ جاتی استناد، تحقیقی، تنقیدی توازن اور معروضیت اس کتاب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ دکن خصوصاً اورنگ آباد کی ادبی روایت کے تناظر میں 'مضامینِ نو' کو محض مضامین کا مجموعہ قرار دینا کافی نہیں ہوگا، بلکہ یہ کتاب اردو ادب کی تحقیقی و تنقیدی روایت کا ایک معتبر اظہار ہے۔ یہ تصنیف قاری کو اردو ادب کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتی ہے اور تحقیق و تنقید کے نئے زاویے عطا کرتی ہے۔

آخر میں کتاب میں پروفیسر ڈاکٹر محمد غیاث الدین کا انگریزی مضمون "The Glance" بھی شامل ہے، جس میں مصنف کی علمی و ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مزید برآں مصنف نے اپنا مختصر تعارف، تعلیمی قابلیت، ملازمت، تصانیف اور زیرِ طبع کتب کا ذکر بھی شامل کیا ہے جس سے ان کی علمی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔

بلاشبہ 'مضامینِ نو' ڈاکٹر سہیم الدین خلیل صدیقی کی علمی، تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا قابلِ قدر ثمر ہے۔ یہ کتاب اردو ادب کے طلبہ، اساتذہ، محققین اور سنجیدہ قارئین کے لیے یکساں طور پر مفید ہے اور مستقبل میں اردو تحقیق و تنقید کے میدان میں ایک اہم ماخذ کی حیثیت اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ امید ہے کہ یہ تصنیف علمی و ادبی حلقوں میں بھرپور پذیرائی حاصل کرے گی اور اردو ادب کے تحقیقی سرمائے میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

ترتیب

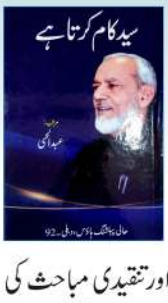

سید کام کرتا ہے

مرتب: ڈاکٹر عبدالحی

صفحات: 222، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2026

زیر اہتمام: حالی پبلشنگ ہاؤس، لکشمی نگر، دہلی

مبصر: نہال رباب، شاہین باغ، نئی دہلی

اردو زبان کی تاریخ محض ادبی تخلیقات، شعری سرمایہ اور تنقیدی مباحث کی تاریخ نہیں بلکہ ان بے شمار افراد کی تاریخ بھی ہے جنھوں نے خاموشی سے اس زبان کی آبیاری کی، اس کی شمع کو فروزاں رکھا اور اپنے عمل سے اس کی بقا و ارتقا کی راہیں ہموار کیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت حکیم سید احمد خان کی ہے جن کی خدمات کو

خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر عبدالحی نے 'سید کام کرتا ہے' مرتب کی ہے۔ یہ کتاب کسی رسمی تہنیتی مجموعے یا روایتی شخصیت نامے سے کہیں آگے بڑھ کر ایک ایسے انسان کی زندگی اور جدوجہد کا آئینہ بن جاتی ہے جس نے طب، سماجی خدمات اور اردو زبان کے فروغ کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ کتاب کے آغاز میں مرتب ڈاکٹر عبدالحی کا پیش لفظ قاری کو اس فکری اور تہذیبی پس منظر سے روشناس کراتا ہے جس میں حکیم سید احمد خان کی خدمات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ اردو کو محض ایک زبان نہیں بلکہ مشترکہ تہذیبی و ثقافتی اور اجتماعی شعور کی علامت قرار دیتے ہیں۔ حکیم سید احمد خان ان معدودے چند افراد میں شامل ہیں جنھوں نے اس روایت کو زندہ رکھنے کے لیے مسلسل عملی کوششیں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کا عنوان 'سید کام کرتا ہے' اپنے اندر ایک علامتی معنویت رکھتا ہے۔ یہ عنوان کسی شخصیت کی تعریف نہیں بلکہ اس کے کردار کا خلاصہ بھی ہے۔ پیش لفظ کے بعد معروف نقاد حقانی القاسمی کی تقدیم 'ترے بیمار کی بھی کچھ دوا ہے' شامل ہے، جو کتاب کی معنوی فضا کو مزید گہرائی عطا کرتی ہے۔ حقانی القاسمی نے اپنی گفتگو میں اس شعر کو نقل کیا ہے۔

علاج درد دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا
تم اچھا کر نہیں سکتے، میں اچھا ہو نہیں سکتا

یہ شعر دراصل اس تہذیبی اور لسانی کرب کی علامت بن کر سامنے آتا ہے جو اردو کے سنجیدہ وابستگان کے دلوں میں موجود ہے۔ حقانی القاسمی کی تقدیم سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک زندہ تہذیبی روایت ہے جس کی بقا کے لیے مسلسل جدوجہد درکار ہے۔ اسی تناظر میں حکیم سید احمد خان کی شخصیت ایک ایسے فرد کے طور پر سامنے آتی ہے جس نے زبان وتہذیب کی خدمت کے لیے مسلسل کام کیا۔ یوں پیش لفظ اور تقدیم دونوں مل کر قاری کو اس فکری فضا میں داخل کرتے ہیں جس کے مرکز میں اردو سے محبت، تہذیبی شعور اور عملی وابستگی کے وہ تصورات موجود ہیں جن کی نمائندگی حکیم سید احمد خان کی پوری زندگی کرتی ہے۔

کتاب میں شامل مضامین مختلف زاویوں سے حکیم سید احمد خان کی شخصیت کو روشن کرتے ہیں اور ان کی ہمہ جہت خدمات کا ایک جامع نقشہ سامنے لاتے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع اپنے مضمون 'ایک شخصی تاثر' میں انھیں ایک متحرک، فعال اور اپنے عہد کی نبض پر ہاتھ رکھنے والی شخصیت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سید احمد خان کی زندگی حرکت، جستجو اور انسان دوستی سے عبارت ہے۔ پروفیسر عبدالحق کے مضمون 'حکیم سید احمد' میں ان کی شخصیت کا جو خاکہ سامنے آتا ہے، وہ محض ایک اردو دوست فرد کا نہیں بلکہ عزم، استقلال اور عملی جدوجہد کی ایسی علامت کا ہے جس نے اپنی پوری زندگی اردو کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ پروفیسر عبدالحق کے نزدیک سید احمد خان ان لوگوں میں شامل ہیں جو شہرت یا صلے کی تمنا کے بغیر خاموشی سے اپنے مشن پر کاربند رہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''حکیم سید احمد کے کردار و گفتار کے تین اہم زاویے ہیں علامہ اقبال، اردو اور طب۔ ان کی دنیائے فکر اور دائرہ کار ان تین نسبتوں سے زیادہ نمایاں ہیں۔''

ان کے نزدیک 'یوم اردو' کا قیام، اہل علم و ادب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور اردو کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہنا ان کی شخصیت کے وہ پہلو ہیں جو انھیں معاصر اردو منظرنامے میں منفرد مقام عطا کرتے ہیں۔ اسی تناظر میں پروفیسر عبدالحق نے میر تقی میر کا مشہور مصرع 'ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو' نقل کیا ہے، جو حکیم سید احمد کی ہمہ جہت خدمات، اردو سے غیر معمولی وابستگی اور ان کے دیرپا اثرات کا نہایت بامعنی اور جامع استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ یہ مصرع اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ حکیم سید احمد نے اپنی عملی جدوجہد اور علمی و ادبی خدمات کے ذریعے اردو دنیا میں ایسے یادگار نقوش چھوڑے ہیں جو مدتوں اہل علم وادب کے حافظے میں زندہ رہیں گے۔ اسی طرح حکیم رشاد الاسلام نے 'ڈاکٹر سید احمد خان: ایک جادوگر شخصیت' میں ان کے خلوص، محبت اور غیر معمولی کشش کو موضوع بنایا ہے۔ یہ کشش کسی ظاہری وجاہت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس اخلاقی سرمائے کی دین ہے جو انھوں نے زندگی بھر محبتیں بانٹ کر حاصل کی۔ ڈاکٹر شفیع ایوب کا مضمون بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ سید احمد خان کو یونانی طب کے ماہر، باوقار منتظم، فعال سماجی کارکن اور اردو کے سچے عاشق کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سید احمد خان کی انفرادیت اس بات میں مضمر ہے کہ انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ کامیابیوں کو کبھی اپنی تہذیبی اور ادبی وابستگیوں پر غالب نہیں آنے دیا۔ وہ طب، ادب اور سماج کے درمیان ایک ایسے پل کی حیثیت رکھتے ہیں جو مختلف دائروں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ کتاب میں شامل دیگر مضامین، مثلاً 'اردو، یونانی پیتھی اور سماجی خدمات' اور 'ڈاکٹر سید احمد خان: اردو زبان اور پیشۂ طب' بھی اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک ہی فکری اور انسانی نصب العین سے جڑے ہوئے ہیں۔

کتاب کا سب سے اہم اور نمایاں وصف اردو زبان کے فروغ کے لیے حکیم سید احمد خان کی خدمات ہیں، خصوصاً 'یوم اردو' کے قیام اور اس کی ترویج میں ان کا کردار۔ مختلف مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زبان کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کیے اور اسے ایک سماجی تحریک کی صورت دی۔ 1997 میں شروع ہونے والا 'یوم اردو' آج اردو دنیا میں ایک مستحکم روایت بن چکا ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں ڈاکٹر عبدالحی کا لیا ہوا انٹرویو 'حکیم سید احمد خان سے مکالمہ' شامل ہے جو اس مجموعے کو مزید اہم بنا دیتا ہے۔ یہاں قاری کو دوسروں کی آرا کے بجائے سید احمد خان کے اپنے خیالات سے براہ راست آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اردو کو محبت، رواداری اور مشترکہ تہذیبی ورثے کی زبان قرار دیتے ہوئے نئی نسل کے دلوں میں اس کے چراغ روشن کرنے اور انھیں اس سے وابستہ رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ یہی سوچ ان کی پوری زندگی اور خدمات میں جھلکتی ہے۔ کتاب میں شامل منظوم خراج تحسین بھی اسی حقیقت کی گواہی دیتا ہے کہ اہل علم و ادب کے درمیان انھیں غیر معمولی احترام حاصل ہے۔ اگرچہ بعض مضامین میں عقیدت کا رنگ نمایاں ہے، تاہم مجموعی طور پر 'سید کام کرتا ہے' ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے عنوان کی طرح عمل، خدمت اور وابستگی کی داستان بیان کرتی ہے۔ یہ کتاب اس حقیقت کی یاد دہانی کراتی ہے کہ زبانیں صرف لغات، قواعد اور ادبی متون کے ذریعے زندہ نہیں رہتیں بلکہ ان لوگوں کے دم سے زندہ رہتی ہیں جو انھیں اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ حکیم سید احمد خان انہی لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے اردو سے محبت کو محض جذبہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک مسلسل عمل اور تحریک میں تبدیل کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالحی نے مختلف اہل قلم کی تحریروں کو یکجا کر کے نہ صرف ایک

شخصیت کا تعارف پیش کیا ہے بلکہ اردو دوستی، خدمت خلق اور تہذیبی شعور کی ایک ایسی روایت کو محفوظ کیا ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ یہی اس کتاب کی اصل کامیابی اور اہمیت ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے ہر دور میں ایسے افراد کی ضرورت رہی ہے جو چراغ اردو کو روشن رکھنے کے لیے عملی اقدامات کریں اور سید احمد خان اسی قافلے کے ایک نمایاں فرد ہیں۔

فکشن

دام تزویر

مصنف: ڈاکٹر محفوظ جاوید ندوی

صفحات: 199، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت 2025

پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: شاداب شمیم، شاہین باغ جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

ڈاکٹر محفوظ جاوید کا افسانوی مجموعہ 'دامِ تزویر' اردو افسانہ نگاری میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ کتاب علامتی، تمثیلی اور تجریدی افسانوں پر مشتمل ہے، جو قاری کو معاشرتی جبر، انسانی نفسیات، اخلاقی تکلم، حرص و ہوس، رشتوں کی بے قدری اور وجودی کرب جیسے گہرے موضوعات سے روشناس کراتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ (شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) کی تحریر کردہ تقریظ میں اس مجموعے کو ڈاکٹر محفوظ جاوید کی تخلیقی صلاحیتوں کا شاہکار قرار دیا گیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "محفوظ جاوید نے کرداروں کے مقابلے میں واقعہ سازی کو زیادہ توجہ سے پیش کیا ہے، اس لیے ان کے افسانوں میں روایتی پن کا احساس نہیں ہوتا۔ انھوں نے افسانوی تکنیک کو بہت ہنرمندی سے استعمال کیا ہے۔ امیجز اور دیو مالائی تمثال بھی ان کی کہانیوں کو نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بعض کردار بے نام و بے چہرہ ہیں لیکن ان کی موجودگی اور ان کے اعمال نے افسانے کی زندگی کو نئی جست دینے میں بڑی معاونت کی ہے۔"

ڈاکٹر محفوظ جاوید لکھنؤ کے علمی و ادبی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے ندوۃ العلما سے اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کی، پھر برطانیہ میں یونیورسٹی آف ویسٹ آف اسکاٹ لینڈ سے ایم اے اور یونیورسٹی آف گلاسگو سے اسلامی معاشیات میں پی ایچ ڈی کیا۔ ان کا تعلق مالیاتی اور بینکنگ کے شعبے سے بھی رہا ہے۔ تاہم ادب سے ان کی گہری دلچسپی نے انھیں تمثیلی اور علامتی افسانہ نگاری کی طرف راغب کیا۔ برطانیہ میں مستقل قیام کے باوجود اپنے وطن سے ان کا تعلق بہت گہرا ہے۔ ان کی تحریروں میں مغربی مصنفین جیسے ایڈگر ایلن پو، فرانز کافکا، گابریل گارسیا مارکیز اور البرٹ کاموکی بازگشت سنائی دیتی ہے، مگر یہ سب اردو کے مقامی تناظر میں ڈھل کر ایک منفرد رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ 'دامِ تزویر' ان کے تخلیقی سفر کا اہم سنگ میل ہے۔ اس میں کل نو افسانے شامل ہیں جو معاشرے کے باطن کو علامتوں کے پردے میں کھولتے ہیں۔

اس مجموعے کا مرکزی موضوع انسانی فطرت اور معاشرتی جبر ہے۔ پہلا افسانہ 'بلا وا' معاشرتی جبر، ایثار، میاں بیوی کے رشتے اور خاندانی بے حسی پر روشنی ڈالتا ہے۔ مرکزی کردار راشل کا نفسیاتی اتار چڑھاؤ، اس کا کمزور احتجاج، شوہر کی سرد مہری، والدین کی خاموشی اور معاشرے کی بے حسی کو افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ جبر کے سامنے فرد کی آواز کیوں دب جاتی ہے۔

دوسرا افسانہ 'بوجھ' حق و باطل کی کشمکش، احساسِ گناہ اور حرص و ہوس کی وجہ سے بھائی کے قتل جیسے سنگین جرائم کو علامتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ 'شگون' حرص و ہوس کے انجام پر ایک تمثیلی کہانی ہے۔ شمطیر جیسا کردار اور دیگر ساتھیوں کے ذریعے افسانہ نگار نے دکھایا ہے کہ مادی دولت اور مکر و فریب سے حاصل کردہ طاقت انسان کی شخصیت کو کس طرح مسخ کر دیتی ہے۔ 'جزیرہ' جبر، اقتدار اور انسانی کرب کا شاندار علامتی بیان ہے۔ کاؤس کا کردار ایک ایسے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے جہاں طاقت کا نشہ سب کچھ کھا جاتا ہے۔

'کایا کلپ' طاقت کے نشے اور کردار کی تبدیلی پر ہے۔ دارش جیسا کردار جب اقتدار حاصل کرتا ہے تو اخلاقیات اور تہذیب کے دائروں کو توڑ دیتا ہے۔ یہ افسانہ معاشرے کے ظالم کرداروں (زمیرا، غلیم، طلموش وغیرہ) کو بے نقاب کرتا ہے۔ دیگر افسانے جیسے 'نوشتہ دیوار' (پشیمانی اور افسوس)، 'سودا' (وقت کے تصور، ماضی کی اسیری اور لا حاصل تلافی)، 'پارسا' (اخلاقی زوال اور جبری تقدیر) اور 'آبگینہ' (رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور شیشے کے محل کی تباہی) بھی نفسیاتی گہرائی اور علامتی Richness سے بھرپور ہیں۔ ان تمام افسانوں میں مشترکہ عنصر انسانی نفسیات کی کھوج، ظاہر و باطن کی جنگ، سماجی بے حسی اور اخلاقی گراوٹ ہے۔ محفوظ جاوید نے یہ سب کچھ روزمرہ کے واقعات سے ہٹ کر ایک ماورائی، پراسرار فضا میں پیش کیا ہے، جو قاری کو حقیقت سے دور نہیں بلکہ اس کے قریب تر لاتا ہے۔

محفوظ جاوید کا سب سے بڑا کمال علامتوں کا استعمال ہے۔ ان کے یہاں علامت محض سجاوٹ نہیں بلکہ 'ایک جہت ساز عنصر' ہے جو بیانیے کو تہہ دار بناتی ہے۔ نظم، قربان گاہ، فال گھر، شیشے کا محل، جزیرہ، بوجھ، شکلوں وغیرہ جیسی علامتیں معاشرتی حقیقت کو نئی جہت دیتی ہیں۔ ان کا اسلوب تجریدی اور علامتی ہے مگر ابہام سے پاک ہے، زبان سلیس اور رواں ہے، مگر جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں گہرے فلسفیانہ جملوں سے قاری کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ کردار اکثر نامانوس اور ماورائی لگتے ہیں، مگر ان کے اعمال ہمارے معاشرے کے آئینے ہیں۔ فضا سازی داستان کی سی ہے، پراسرار، حیرت انگیز اور استعجاب پیدا کرنے والی۔

اس کتاب کے تخلیق کار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مغربی روایت (کافکا کی اجنبیت، مارکیز کی جادوئی حقیقت پسندی، پو کی نفسیاتی گہرائی) کو اردو میں ڈھالنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کے افسانے کو پڑھتے ہوئے اکثر جگہ انتظار حسین کی تخلیقی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مصنف نے انتظار حسین کی روایت کو نئی جہت دینے کے ساتھ ساتھ اسے بڑی خوب صورتی سے آگے بڑھایا ہے۔

'دامِ تزویر' جدید اردو افسانے کی روایت میں اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ مجموعہ قاری کو محض تفریح نہیں بلکہ خود احتسابی اور معاشرتی شعور کی دعوت دیتا ہے۔ اس مجموعے کا سب سے مضبوط پہلو موضوعاتی تنوع اور گہرائی، علامتی استعمال کی مہارت، نفسیاتی کردار نگاری اور زبان کی خوبصورتی اور سلاست وغیرہ ہے جو قاری کو پڑھنے پر اکساتی ہے اور اسے باندھے رکھتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اردو ادب کے طلبہ، ناقدین اور سنجیدہ قارئین کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔

طب

یونانی طب میں تاریخ قرابادین نویسی

مصنف: حکیم فخر عالم

صفحات: 288، قیمت: 600 روپے، سن اشاعت: 2026

ناشر: آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس

مبصر: حکیم مصباح الدین اظہر

ریسرچ آفیسر سائنٹسٹ 4 (یونانی)، علاقائی تحقیقاتی ادارہ برائے طب یونانی، علی گڑھ

حکیم فخر عالم عہد حاضر کے ان اہلِ علم میں شمار ہوتے ہیں، جن کی شخصیت میں طب یونانی، تحقیق، ادب اور تہذیبی شعور ایک حسین امتزاج کی صورت میں جلوہ گر ہیں۔ وہ صرف ایک معالج نہیں بلکہ ایک صاحبِ فکر محقق، صاحبِ طرز قلمکار اور علم و حکمت کی روایت کے امین بھی ہیں۔ ان کی علمی زندگی مسلسل جستجو، مطالعہ اور تحقیق سے عبارت ہے۔ طبِ یونانی کے دقیق مباحث ہوں یا جدید طبّی تحقیقات کے تقاضے، حکیم فخر عالم نے ہمیشہ دونوں کے درمیان ایک متوازن اور بصیرت افروز ربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی طبی اخلاقیات، رموز دواسازی، یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد، اردو طبی مترجمین، ہندوستان کی طبی درسگاہیں، رازی ہند: حکیم پروفیسر محمد طیب، حکیم ظل الرحمٰن: ایک مطالعہ جیسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

زیر نظر تصنیف 'یونانی طب میں تاریخِ قرابادین نویسی' یونانی طب کے علمی و ادویاتی ورثے پر نہایت اہم، تحقیقی اور مستند کاوش ہے۔ یہ کتاب محض تاریخی معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ فن قرابادین نویسی کے ارتقا، اصول وضوابط، اور مختلف ادوار میں موضوع کی علمی خدمات کا ایک جامع مطالعہ پیش کرتی ہے۔

مصنف نے اس تصنیف میں قدیم یونانی اطبا سے لے کر عرب وعجم اور برصغیر کے معالجین تک قرابادین نویسی کی روایت کو نہایت مربوط اور تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے فنِ قرابادین کی تاریخی جڑوں کی محض نشاندہی نہیں کی بلکہ اس موضوع کے مختلف ادوار، خطوں اور علمی روایتوں کو باہم مربوط کر کے ایک جامع تاریخی تسلسل بھی قائم کیا ہے۔ قدیم یونان سے شروع ہو کر وسطِ ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور برصغیر تک پھیلے ہوئے علمی و ادبی ذخیرے کو یکجا کرنا ایک دشوار کام تھا، جسے مصنف نے بڑی کامیابی سے انجام دیا ہے۔

ان کی زیر نظر تصنیف نہ صرف یونانی دواسازی بلکہ طب کے عام شائقین، تاریخ اور ثقافتی مطالعات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے ایک مستند حوالہ بن جاتی ہے۔ اس تالیف میں قرابادینوں سے موسوم مجموعوں کے علاوہ دیگر ذخائر جیسے کناش، فارماکوپیا اور مرکبات کے نام سے تحریر کردہ کتابوں کو یکجا کر ان کی باہمی ربط وفرق کو بھی واضح کیا ہے، اس لیے یہ تصنیف قرابادین نویسی کا زیادہ وسیع منظر پیش کرتی ہے جو صرف قرابادین نویسی کے رسمی معنی تک محدود نہیں بلکہ اس کے ارتقا کو وسیع تر سماجی، ثقافتی اور علمی جہتوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس میں عربی، فارسی اور اردو میں لکھی جانے والی نہ صرف سبھی کناش، قرابادین، فارماکوپیا کو شامل کیا ہے، بلکہ ان اسما کے تدریجی ارتقا کو بھی بیان کیا ہے۔ جس سے وقت کے ساتھ قرابادین کے مفہوم میں پیدا ہونے والی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف نے قرابادینوں کی تاریخ کو مقدم رکھنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کے مؤلف، مدون، مترجم کی تفصیل پیش کر مضمون کو سمجھنے میں سہولت فراہم کی ہے۔ صاحب کتاب نے جن مصنفین کے حالات زندگی، علمی رجحانات دیگر تصانیف میں موجود ہیں، ان کو اختصار کے ساتھ اور جن کے بارے میں معلومات کم دستیاب ہیں ان کو تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے ہر دور کے اطبا کی مساعی کا عکس بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح یہ کتاب یونانی دواسازی کی تاریخ کے ساتھ طب کے شائقین اور تاریخ ثقافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک بیش قیمت کتاب ہے۔

مصنف نے قرابادین نویسی جیسے خشک مضمون کو علمی زبان دینے کے باوجود اسے رواں اور سلیس رکھا ہے اور مشکل طبّی اصطلاحات کو سہل انداز میں بیان کر کے قابل فہم بنانے کی کوشش کی ہے، جس سے قاری کو بیانیہ کا تسلسل سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ خاص طور پر طلبا اور تحقیق سے وابستہ افراد کے لیے یہ کتاب ایک مفید ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تنقیدی اعتبار سے دیکھا جائے تو کتاب کو حروف تہجی کے اعتبار سے پیش نہ کر کے ادوار کے اعتبار سے لکھا جاتا تو قارئین کو علم دواسازی، قرابادین نویسی، تاریخ حکما اور طب یونانی کی ترقی کے منازل کو سمجھنا زیادہ آسان ہو جاتا۔ مصنف نے اس تالیف میں تقریباً 300 کتابوں کو یکجا کر کے وہ کارہائے نمایاں پیش کیا ہے جس کو اس مضمون پر انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ حوالہ جات اور تاریخی شواہد کی فراوانی کتاب کی استنادی حیثیت کو مضبوط بناتی ہے۔ حوالہ جات کی فہرست کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حکما کے سوانحی حالات کو جاننے کے کیا کیا ذرائع ہو سکتے ہیں؟ مصنف نے موضوع کی افادیت کے لیے تذکرے اور تاریخ کی کتابوں کے علاوہ علم وادب کے دیگر چشموں سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے، یہ مصنف کی علمی گہرائی، جستجو، تحقیق پر عمیق نگاہ کا ایک بہترین ثبوت ہے۔

اس تصنیف میں قرابادین نویسی کی تاریخی تسلسل کے ساتھ علمی تجزیہ بھی موجود ہے، جس سے قاری کو صرف معلومات ہی نہیں ملتیں بلکہ فن دواسازی کے فکری پس منظر کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ حکیم فخر عالم نے اس تصنیف میں مختلف قرابادینوں کا تعارف، ان کے مصنفین کے سوانحی حالات، ترتیب وتدوین کے اسالیب کو نہایت سادہ مگر تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ کتاب میں جہاں قدیم مخطوطات اور مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے، وہیں جدید تحقیقی اسلوب کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس تصنیف کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے علم دواسازی کے اب تک کے علمی سرمایہ کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مصنف نے کتاب کا آغاز خود کلامی سے کیا ہے، ان میں نیاز جیراجپوری صاحب کی تحریر کردہ ایک نظم بعنوان 'فخر عالم: نظرے خوش گزرے' بھی شامل ہے۔

مجموعی طور پر 'یونانی طب میں تاریخِ قرابادین نویسی' یونانی طب کے علمی ذخیرے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب نہ صرف فنِ قرابادین نویسی کی تاریخ کو محفوظ کرتی ہے بلکہ نئی نسل کے محققین کو اس میدان میں مزید تحقیق کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ یقین ہے حکیم فخر عالم کی یہ کاوش علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

’داراشکوہ اور ہندوستان کی مشترکہ قدریں‘ کے عنوان سے پینل ڈسکشن کا انعقاد

نئی دھلی: انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں 23 مئی 2026 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ’داراشکوہ اور ہندوستان کی مشترکہ قدریں‘ کے عنوان سے ایک پینل ڈسکشن کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں بحیثیت مہمان خصوصی شری رام بہادر رائے (صدر، اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار دی آرٹس، نئی دہلی) اور بحیثیت مہمان اعزازی پروفیسر ایس کے اشتیاق احمد (رجسٹرار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد) نے شرکت کی۔ جبکہ پینلسٹ کے طور پر پروفیسر علیم اشرف خان (صدر شعبہ فارسی، فیکلٹی آف آرٹس، دہلی یونیورسٹی دہلی) اور پروفیسر فرحت نسرین (شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ) شریک ہوئیں۔ ان تمام مہمانوں کا کونسل کی جانب سے شال پوشی کے ذریعہ استقبال کیا گیا۔

تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ یہ پینل ڈسکشن ایک اہم شخصیت کے کارناموں پر گفتگو کا موقع ہے۔ انھوں نے کہا کہ داراشکوہ نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، علم و حکمت اور رواداری کا چراغ روشن کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی نابغہ روزگار شخصیت نے حکومت و سلطنت کے بجائے علم و حکمت اور تعصب کے بجائے محبت کو اختیار کیا۔ ان کے اندر حقیقت کی تلاش کا جذبہ موجود تھا۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے سنسکرت زبان سیکھ کر اپنشد، وید اور دیگر ہندوستانی علوم و فلسفہ کو عام کیا۔ مجمع البحرین ان کی فکری وسعت اور دو تہذیبی دھاروں کے سنگم کی علامت ہے۔ داراشکوہ نے صدیوں پہلے اختلاف میں اتحاد کی عملی صورت پیش کی۔ ان کی زندگی کا ایک اہم پیغام اپنے افکار و نظریات پر قائم رہتے ہوئے بھی صحت مند مکالمہ قائم کرنا ہے۔

مہمان خصوصی شری رام بہادر رائے نے اس پینل ڈسکشن کو بیحد اہم قرار دیتے ہوئے داراشکوہ سے متعلق کئی کتابوں کا ذکر کیا اور ان کے فکر و فلسفے کو واضح کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کے ہندوستان نے داراشکوہ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ دارا شکوہ اکبر کی رواداری کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ موجودہ ہندوستانی معاشرے میں داراشکوہ کے فکر و فن کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ ان کی کئی ایسی تصانیف ہیں جن کا ترجمہ

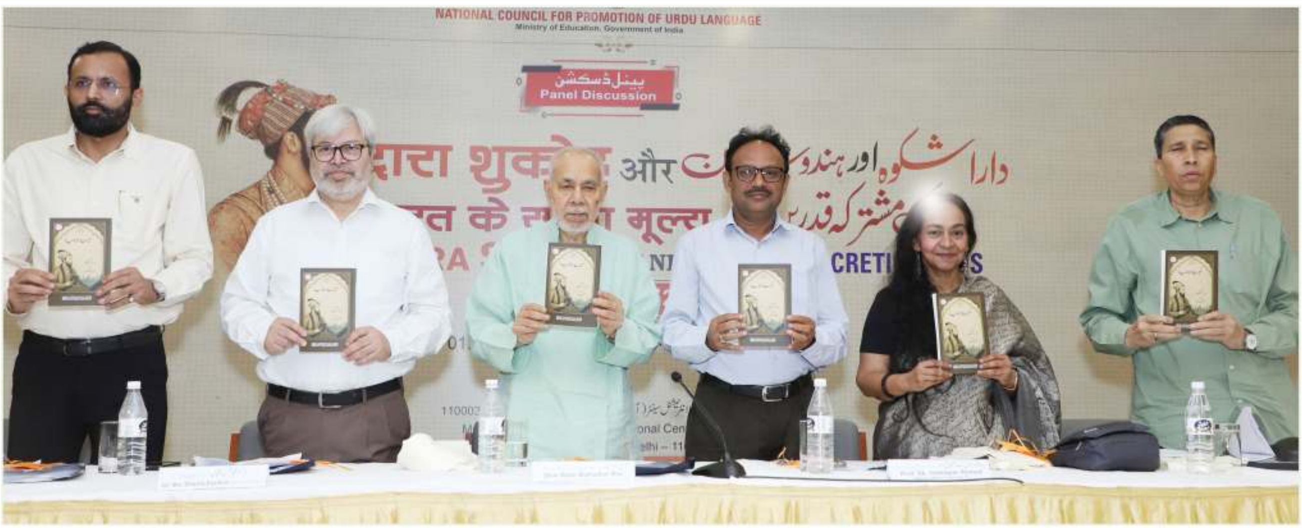

مختلف زبانوں میں کیا جانا چاہیے۔قومی کونسل نے 'سکینۃ الاولیاء' کے اردو ترجمے کی اشاعت کے ذریعہ ایک اہم پیش رفت کی ہے۔

مہمان اعزازی پروفیسر ایس کے اشتیاق احمد نے کہا کہ داراشکوہ ایک وسیع المطالعہ شہزادہ تھا۔ ہندوستانی فلسفے کا موازنہ انھوں نے اسلامی فلسفے سے کیا۔انھوں نے اپنی پوری زندگی علم وفن اور فکر وفلسفے کی تبلیغ میں گزاری۔ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کسی ایک مذہب سے نہیں بلکہ مشترکہ تہذیب سے ہے۔ہمیں داراشکوہ کی تصانیف سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی فکر کو سمجھنے اور عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

پینلسٹ پروفیسر علیم اشرف خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ داراشکوہ کی فکر اور ان کا فلسفہ بہت وسیع ہے۔ان کے یہاں مذہبی اختلافات کی کوئی اہمیت نہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جو داراشکوہ کے نام سے موسوم کر دی گئی ہیں مثلاً یوگ وسشٹ وغیرہ۔اپنشدوں سے متعلق ان کے تراجم کی بدولت ہی یورپ میں لوگ داراشکوہ کو جان سکے۔ ان کی شاعری اور دیگر خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔

دوسری پینلسٹ پروفیسر فرحت نسرین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ داراشکوہ کو عوامی مقبولیت حاصل تھی۔ وہ دہلی کے عوام میں بہت ہی محبت و احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے،انھوں نے نفسیات کی روشنی میں بھی داراشکوہ کی شخصیت اور کردار کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہونے والی داراشکوہ کی تصنیف 'سکینۃ الاولیاء' کے اردو ترجمہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ یہ ترجمہ پروفیسر علیم اشرف خان نے کیا ہے۔اس پینل کی نظامت ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (کنوینر، خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی) نے بحسن وخوبی انجام دی۔ ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر، این سی پی یو ایل) نے کلمات تشکر ادا کیے۔اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے اراکین کے علاوہ پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر رحمان مصور، پروفیسر پرویز اعظمی، ڈاکٹر عمران چودھری، جناب فیروز بخت احمد، جناب جسیم محمد، جناب جمشید عادل، جناب خالد رضا خان، جناب اشرف علی بستوی، جناب ساحل آغا، جمشید اقبال، ڈاکٹر جاوید رحمانی کے علاوہ شائقین علم وادب کی بڑی تعداد موجود رہی۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 23 جون 2026

پروفیسر محمد شاہد حسین اور جناب فاروق سید کے انتقال پر تعزیتی نشست

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں آج ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی، جس میں معروف ناقد وقلمکار پروفیسر محمد شاہد حسین (جے این یو) اور بچوں کے رسالہ 'گل بوٹے' کے بانی مدیر وصحافی جناب فاروق سید کے انتقال پر اظہار تعزیت کیا گیا۔

ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے گہرے رنج وافسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دونوں شخصیات کا قومی اردو کونسل سے گہرا رشتہ تھا اور ان کا رخصت ہونا اردو دنیا کے لیے باعث تکلیف ہے۔ انھوں نے اپنے رشتوں کے حوالے سے مزید کہا کہ پروفیسر محمد شاہد حسین جے این یو میں میرے آخری استاد تھے۔ ادب اطفال سے متعلق کونسل کی سرگرمیوں میں فاروق سید کا ہمیشہ مثبت تعاون حاصل رہا۔ انھیں مرحوم کہتے ہوئے شدید تکلیف کا احساس ہو رہا ہے۔ ڈرامے کی تنقید اور ابلاغیات کے حوالے سے پروفیسر محمد شاہد حسین کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، اسی طرح ادب اطفال کی نشرواشاعت اور 'گل بوٹے' کے حوالے سے جناب فاروق سید ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ اس موقع پر قومی کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر، افسران اور دیگر عملے نے بھی رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی۔ غم کے اس موقع پر ادارہ لواحقین کے ساتھ ہے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 20 مئی 2026

معروف جدید شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کے انتقال پر تعزیتی نشست کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں آج معروف جدید شاعر و ناقد ڈاکٹر بشیر بدر کے انتقال پر تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر بشیر بدر ایک مایہ ناز شاعر تھے۔ ان کی شاعری جدید معاشرے کی خوبصورت ترجمانی کرتی ہے۔ انسانوں سے ہمدردی، محبت اور زندگی کے گہرے مسائل ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہیں۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر طویل علالت کے بعد 28 مئی 2026 کو بھوپال میں انتقال کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر 91 برس تھی۔ بشیر بدر نے زندگی کا ایک طویل حصہ شعر وادب کی خدمت میں وقف کیا۔ مشاعروں میں ان کی شرکت کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔ ان کے متعدد اشعار ایسے ہیں جو ہر خاص و عام کی زبان پر محاورہ کی طرح ازبر ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں اکائی، آس، امید، امیج وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ 'بیسویں صدی میں اردو غزل' اور 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' جیسی کتابیں ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ہندوستان کے اہم شہری اعزاز پدم شری سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور دیگر کئی اعزازات سے بھی انھیں سرفراز کیا گیا ہے۔ ایسے مقبول شاعر کا رخصت ہونا یقیناً قابل افسوس ہے۔ امید ہے نئی نسل بشیر بدر کی کاوشوں سے مستفید ہوتی رہے گی۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 5 جون 2026

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبر نامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی و ثقافتی سرگرمیوں، تنوع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی و ثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درجہ ذیل ای میل editor@ncpul.in | urdudunyancpul@yahoo.co.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

دھلی

یگانہ: شخصیت اور شاعری

نئی دھلی: غالب کی عظمت کے منکر ہونے کے باوجود یگانہ نے اپنی کائنات شعر میں ہر قدم پر غالب سے

استفادہ کیا ہے۔ ان کی شاعری کا بغور مطالعہ بتاتا ہے کہ نہ صرف غالب کی پیچیدہ بیانی سے متاثر تھے بلکہ انھوں نے غالب کی شاعری کی مابعد الطبیعیات جہت کو بھی اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کے معاملے میں ان کے یہاں رد و قبول کی ایک ناقابل فہم کشمکش نظر آتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں جتنا غالب کو مسترد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اتنا ہی ان کے یہاں غالب کو قدم قدم پر قبول کرنے کا رویہ موجود ہے۔ ان کے یہاں اگرچہ غالب کی سی ذکاوت، ان کی درّاکی اور غالب کے سے استعمال الفاظ کا شعور موجود نہیں تھا تاہم ان کے یہاں غالب کا سا بہت کچھ موجود ہے۔ ان خیالات کا اظہار 8 مئی کو پروفیسر انیس اشفاق نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سمینار 'یگانہ: شخصیت، شاعری اور تنقید' کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ سمینار کا افتتاح فارسی کے نامور محقق پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کیا۔ افتتاحی تقریر میں انھوں نے کہا کہ یگانہ کی شاعری اردو میں ایک مختلف اسلوب کو پیش کرتی ہے۔ ان کا فردیت پر اعتماد اور ذاتی تجربے پر بھروسا ایک مثبت رویہ ہے۔ انھیں نئی حسیت، نئے انداز بیان اور نئے اسالیب بیان کی ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ یگانہ کو جن تلخ تجربات کا تجربہ ہوا ان میں محصور رہنے کے بجائے نئے مباحث کی روشنی میں ان کی شاعری کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا یگانہ کی شاعری میں فرد کی آزادی اور خودداری کا ایسا لہجہ ملتا ہے جو اردو غزل کو نئی فکر عطا کرتا ہے۔ وہ روایتی شاعری کو بعض اوقات چیلنج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری تکلفات کم اور راست خطاب سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ تعارفی کلمات پروفیسر سرورالہدیٰ نے پیش کیے، انھوں نے کہا کہ یگانہ اردو کا اہم ترین شاعر ہے اور تمام لوگوں کو ان کی اہمیت کا اندازہ بھی ہے لیکن ان کے تعلق سے کوئی قابل ذکر سمینار اب تک منعقد نہیں ہوا۔ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اس طرف توجہ دی اور اہم لوگوں کو مقالہ خوانی کی دعوت دی۔

سمینار کے دوسرے روز چار تکنیکی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت سابق صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر سید حسن عباس نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس اجلاس کے مقالے تکرار سے محفوظ رہے۔ یگانہ سے متعلق جلسہ ہوا اور اس میں تکرار مضامین ہو تو یہ بجائے خود یگانہ کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے یگانہ کی غالب شکنی، پروفیسر نصرت فاطمہ نے 'یگانہ اور غالب' اور ڈاکٹر امیر حمزہ نے 'یگانہ کی رباعی گوئی' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ یگانہ کوئی مظلوم شخصیت نہیں ہے۔ ان کی مخالفت میں ان کے مزاج کو بھی دخل تھا۔ یگانہ کا فن اتنا توانا تھا کہ ان کے زمانے میں اور ان کے بعد بھی ان کے مداح ہمیشہ موجود رہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے 'کلیاتِ یگانہ مرتبہ مشفق خواجہ ایک حقیقی جائزہ'، پروفیسر اخلاق احمد آہن نے 'یگانہ کی غالب شکنی'، ڈاکٹر سبط حسن نقوی نے 'یگانہ کی پہلی کتاب' اور فیض الرحمٰن نے 'یگانہ اور احساس تنہائی' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابوبکر عباد نے کی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ یگانہ فہمی کی روایت ہمارے یہاں بھی سست اور کبھی چست رہی ہے۔ یہ ان کے فن کا کمال ہے ورنہ شخصی حوالوں سے کوئی فنکار زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس اجلاس میں پروفیسر سید حسن عباس نے 'یگانہ کے خطوط دوارکا داس شعلہ کے نام'، 'پروفیسر کوثر مظہری نے 'باقر مہدی کی یگانہ شناسی' کے موضوع پر مقالات پیش کیے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا یگانہ کی شاعری کو جب ان کے عہد میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آواز اپنے عہد میں سب سے مختلف تھی۔ نئی شاعری کی بحث میں یگانہ کا نام

اس لحاظ سے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے نئی غزل کی راہ متعین کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ اس اجلاس میں پروفیسر ابوبکر عباد نے 'یگانہ پر غالب کا اثر'، ڈاکٹر قمر عالم نے 'یگانہ کی فارسی شاعری'، ڈاکٹر محسن رضا ضیائی نے 'یگانہ کی شاعری میں تصورِ عشق' اور ڈاکٹر عبدالسمیع نے 'یگانہ کے خطوط ایک جائزہ' اور ڈاکٹر فیضان الحق نے 'یگانہ اور منموہن تلخ' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ اجلاس کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ہمارا سماج، دہلی، 9 اور 10 مئی 2026

میک اٹ میٹر: کمیونی کیشن ان دی ڈیولپمنٹ سیکٹر

نئی دهلی: جامعہ ملیہ کے سروجنی نائیڈو سینٹر فار وومینس اسٹڈیز (ایس ایس سی ڈبلیو ایس) کے زیر اہتمام یونیورسٹی صنعت رابطہ کے سلسلے میں ورکشاپ بعنوان 'میک اٹ میٹر: کمیونی کیشن ان دی ڈیولپمنٹ سیکٹر' منعقد کیا گیا جس میں طلبہ اور فیکلٹی اراکین ایک پلیٹ فارم پہ جمع ہوئے اور علمی تحقیق، زمینی حقائق اور اسٹریٹجک کمیونی کیشن کے درمیان حد فاصل کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا گیا۔ اسٹریٹا کوم کمیونی کیشن کی بانی ڈائرکٹر روشنی سبھاش جنھیں ڈیولپمنٹ کمیونی کیشن کا خاص تجربہ ہے۔ انھوں نے ورکشاپ کا انعقاد کیا اور شرکا سے بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح ترسیلی و ابلاغی قوت سماجی اثر کو جہت دیتی ہے۔ ڈاکٹر ترنم صدیقی نے اجلاس کی رابطہ کاری کا اہم فریضہ انجام دیا اور ڈاکٹر ثریا تبسم نے تمہیدی گفتگو کی۔ پروفیسر مہر فاطمہ حسین نے اجلاس کی صدارت کی۔ اپنی گفتگو کی ابتدا میں سبھاش نے شرکا سے کہا کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں خاص طور پر سوشل میڈیا کے حوالے سے ترسیل و ابلاغ کے مزاج و کردار کو سمجھیں۔ انھوں نے کہا کہ مختصر فارم والے مواد پر مبنی ریل، ہوکس اور اسکرین پر تیزی سے آتے جاتے ویژوئل توجہ کو متاثر کرتے ہیں اور اس بات سے آگاہ کیا کہ زندگی کی یہ تبدیلی علمی تحریر اور ترقی کے عمل دونوں ہی پر یکساں انداز میں زبردست اثرات مرتب کر رہی ہے۔ انھوں نے طلبہ سے ڈیجیٹل عادات کے سلسلے میں محتاط رہنے کی اپیل کی کیونکہ یہ ان کی تحقیق کو جہت دینے کے ساتھ ساتھ ان طور طریقوں کو بھی متاثر کرتی ہیں جن میں ترقی کے پیغامات عوام تک پہنچتے ہیں۔ اجلاس میں نظری بحث کے ساتھ ساتھ عملی پہلو پر بھی بات چیت ہوئی اور صوبہ مدھیہ پردیش میں واقع ایک ضلع کا کیس اسٹڈی پیش کیا گیا جہاں خواتین کو صنف اساس تشدد کا سامنا تھا، شرکا کو تین گروپ میں تقسیم کر دیا گیا اور انھیں کمیونی کیشن حکمت کی تیاری اور اس تناظر میں سرگرم عمل سیلف ہیلپ گروپ کے لیے امداد کی تجویز تیار کرنے کے لیے بیش منٹ دیے گئے۔ اس مشق میں حقیقی دنیا کے تقاضوں کو ایسے حقائق میں تبدیل کرنے کا سامان کیا گیا جو عطیہ دہندگان اور پالیسی سازوں کے لیے انتہائی اہم، جواب دہ بیانیے ترتیب دینے میں معاون ہوں۔ طلبہ کے مختلف گروپوں نے اپنی تجاویز پیش کیں جن کے بعد پرجوش تبصروں اور ردعمل اور تاثر کا تبادلہ ہوا۔ رضا کار طالبہ انکا کے شکریہ پر پروگرام کا اختتام ہوا۔ طلبہ رضا کاروں میں میناکشی، دیویہ، وبھو اور آدیتی نے ورکشاپ کے بہتر انداز میں انعقاد میں اپنی اہم خدمات انجام دیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 اپریل 2026

فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہر سال منعقد ہونے والا باوقار فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ

اس سال 30 مئی کو ایوان غالب میں منعقد ہوا۔ اپنے خطبے بعنوان 'ہماری تہذیب کے مشترک پہلو' میں سہیل ہاشمی نے کہا کہ دنیا کی کوئی تہذیب خالص اور یک رنگ نہیں ہوتی، بالخصوص ہندوستان کی تہذیب مختلف ثقافتوں اور روایات کے امتزاج سے تشکیل پائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے لباس، رہن، سہن، زبان، خوراک اور طرز تعمیر میں مختلف تہذیبوں کے اثرات اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ ان کی جداگانہ شناخت آسانی سے محسوس نہیں ہوتی۔ انھوں نے ہندوستانی فن تعمیر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہاں کی عوامی، شخصی اور مذہبی عمارتوں میں مختلف اقوام کی فکری اور تہذیبی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ تقریب کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین اور جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس بدر دریز احمد نے کی۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ ہمیشہ اپنے اعلیٰ علمی معیار کے لیے جانا جاتا رہا ہے اور سہیل ہاشمی کی فکرانگیز گفتگو نے اس روایت کو مزید مستحکم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انسانی تہذیب اور ایجادات کسی ایک قوم یا خطے کی میراث نہیں ہوتیں بلکہ پوری انسانیت کے اجتماعی تجربات اور کاوشوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ انھوں نے مصنوعی ذہانت (اے آئی) کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جدید دور کی یہ اہم ایجاد بھی مختلف اقوام کی مشترکہ علمی کوششوں کا ثمر ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اس میں محض ادبی موضوعات نہیں بلکہ سماجی، تہذیبی اور فکری مباحث کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسی مقصد کے تحت ہر سال ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے، جو اپنے علم اور تجربے سے اس روایت کو برقرار رکھ سکے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ یادگاری خطبہ ادارے کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کا اہم حصہ بن چکا ہے اور اہل علم و دانش کو ہر سال اس کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فخرالدین علی احمد کی ہمہ جہت شخصیت کی مناسبت سے اس خطبے میں ایسے موضوعات کو شامل کیا جاتا ہے جو فکری اور سماجی سطح پر نئی بحثوں کو جنم دیں۔ تقریب میں علم و ادب، صحافت اور سماجی حلقوں سے وابستہ بڑی تعداد میں معزز شخصیات نے شرکت کی اور خطبے کو بے حد سراہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مئی 2026

مادری زبان کوفروغ دینے کے لیے بچوں کو'اردو' ضرور پڑھائیں

نئی دھلی: جامعہ نگر کے اسکولوں میں نئے تعلیمی سال کے آغاز کے ساتھ ہی مختلف جماعتوں میں داخلے کا عمل جاری ہے۔ اس دوران چھٹی جماعت میں داخلے کے وقت سہ لسانی فارمولہ کے تحت مادری زبان میں ایک اختیاری مضمون کا انتخاب خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے جامعہ نگر میں سرگرم ملی تنظیموں، غیر سرکاری سماجی تنظیموں اور سماجی خدمت گاروں نے لوگوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کا چھٹی جماعت میں داخلہ کراتے وقت اختیاری مضمون کے طور پر اردو کا انتخاب کریں تاکہ اپنی مادری اور خالص ہندوستانی زبان اردو کو فروغ ملے اور گنگا جمنی تہذیب مضبوط ہو۔ ماہرین تعلیم اور دہلی سرکار کے مختلف اسکولوں میں ٹی جی ٹی کے طور پر خدمات انجام دینے والے ریٹائرڈ انگریزی استاد خورشید احمد صدیقی کے مطابق اردو نہ صرف ایک ہندوستانی زبان ہے بلکہ اس نے جنگ آزادی میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور ہمارا مذہبی وتہذیبی سرمایہ اسی زبان میں محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب حکومت کی جانب سے اختیاری مضمون کے طور پر موقع دیا جارہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ غفار منزل سماجی کارکن شاداب عالم نے بھی لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو بطور اختیاری مضمون اردو دلوائیں، کیونکہ اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب کی امین ہے۔ نور نگر کے درس وتدریس سے وابستہ محمد جاوید خان نے بھی سرپرستوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو تہذیب وتمدن سے آراستہ اردو زبان ضرور پڑھائیں۔ اسی طرح جامعہ نگر کے سماجی کارکن اور جنوب مشرقی دہلی بی جے پی کے کنوینز آشو چودھری نے کہا کہ حکومت ہر ہندوستانی زبان کے فروغ کے لیے کام کررہی ہے، اس لیے ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کو اردو جیسی بہترین زبان سے روشناس کرائیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اپریل 2026

اردو کو عام لوگوں کی زبان بنایا جانا وقت کی اہم ضرورت

نئی دھلی: اردو کے بزرگ ومعروف صحافی مودود صدیقی نے کہا ہے کہ اردو محض پروفیسرز لیکچررز اور اسکالرز تک محدود ہوتی جارہی ہے جب کہ اس کی آبیاری کے لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کو عام لوگوں کے لکھنے اور پڑھنے کی زبان بنایا جانا چاہیے تھا۔ وہ آج یہاں اپنی زندگی کے 88 سال مکمل ہونے پر 'انقلاب' سے خصوصی گفتگو کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے طلوع اور غروب دونوں طرح کا وقت دیکھ لیا، اردو نے مجھے جو کچھ دیا اور جس طرح کے اچھے لوگ دیے، میں اس سے مطمئن ہوں۔ واضح رہے کہ مودود صدیقی امروہہ سے محض 16 سال کی عمر میں دہلی آئے تھے اور اس کے بعد سے ہی اردو کی خدمت کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا۔ انھوں نے ابتدائی طور پر ایک اخبار کے دفتر میں خدمت گار کے طور پر کام شروع کیا، اور اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ اس طرح وہ اردو صحافت اور اخباری دنیا میں آگئے۔ انھوں نے اردو ادب وصحافت کے بڑے مشاہیر کے ساتھ کام کیا جن میں ناز انصاری اور مہدی نقوی وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اردو کے بڑے اداروں میں منیجر کے طور پر خدمات بھی انجام دیں۔ مودود صدیقی نے بتایا کہ انھیں دو بار سرکاری نوکری کے مواقع ملے، لیکن انھوں نے اس سے انکار کردیا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اردو کی خدمت جاری رکھیں گے۔ بزرگ صحافی نے کہا کہ جس وقت وہ دہلی آئے تھے اس وقت اردو ادب اور صحافت کی دنیا میں بے شمار ذہین لوگ تھے جنھوں نے ان کی تربیت کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان سے انھیں بہت کچھ ملا جس کے لیے وہ ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 جون 2026

اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ 'صحافیوں کی ایک شام: شاعری کے نام' کی ایک تصویر

صحافیوں کی ایک شام: شاعری کے نام

نئی دھلی: مشاعرہ اردو تہذیب وثقافت کی ایک اہم اور زندہ روایت ہے جو صدیوں سے زبان وادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرتی آرہی ہے۔ یہ محض شعری کلام سنانے کی محفل نہیں بلکہ ادب، فکر، تخلیق اور اظہارِ احساسات کا ایک خوبصورت سنگم ہے۔ مشاعرے کے ذریعے شعرا اپنے خیالات، جذبات اور مشاہدات کو سامعین تک پہنچاتے ہیں، جب کہ سامعین کو مختلف ادبی وفکری جہات سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اردو اکادمی، دہلی اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے وقتاً فوقتاً مختلف النوع ادبی وثقافتی پروگراموں کا انعقاد کرتی رہتی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک منفرد اور خوش آئند پیش رفت کے طور پر اردو اکادمی، دہلی اس بار ایک بالکل نئے اور اچھوتے موضوع 'صحافیوں کی ایک شام: شاعری کے نام' کا انتخاب' کیا۔ دہلی حکومت کے محکمہ فن، ثقافت و السنہ کے تحت اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی یہ خصوصی ادبی وشعری نشست قمر رئیس سلور جبلی آڈیٹوریم، اردو اکادمی، دہلی میں منعقد ہوئی، جس میں صحافیوں، ادیبوں، شاعروں، طلبا اور اردو زبان وادب کے شائقین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس مشاعرے کی صدارت روزنامہ 'انقلاب' کے سابق مدیر اور ممتاز صحافی جناب شکیل حسن شمسی نے فرمائی، جب کہ نظامت کے فرائض جناب معین شاداب نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 جون 2026

غالب اکیڈمی میں نثری نشست

نئی دھلی: غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں 25 مئی کو

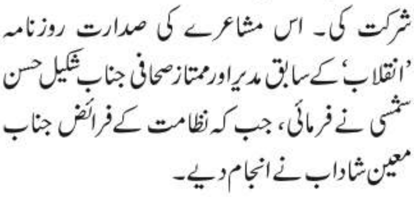

ماہانہ نثری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس نشست میں وگیان پریشد پریاگ کا خصوصی شمارہ 'محمد خلیل' نمبر کا اجرا پروفیسر اختر الواسع نے کیا اور نشست کی صدارت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ وگیان پریشد کا خصوصی

شمارہ شائع ہونا بڑی بات ہے، اس شمارے میں محمد خلیل کا مکمل تعارف کرایا گیا۔ اردو والوں کے مضامین کو ہندی قارئین تک پہنچایا۔ اردو ہندی ادب کی تاریخ نے سائنس کی ترقی میں بڑا کام کیا ہے۔ خلیل نے سائنسی موضوعات پر لکھا، انھیں انعامات و اعزازات بھی ملے۔ اس موقعے پر ہندی اردو ادیبوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت امیر خسرو ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے جنک ہیں۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہندی دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اور اردو کا رسم الخط الگ ہے۔ دونوں زبانوں کے میل ملاپ سے لوگ قریب آتے ہیں۔ حشمت بھاردواج کے شعری مجموعے 'درد جیتا ہوں' کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جب تک حشمت بھاردواج صاحب ہیں، اردو پہ آنچ نہیں آسکتی۔ غالب اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر جی آر کنول نے اپنے تحریری پیغام میں خلیل صاحب کی سالہا سال سے کی گئی اردو خدمات اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں سائنسی علم سے متعلق خدمات کو سراہا اور ان کی صحت اور طویل عمر کی دعا کی۔ اس موقعے پر چشمہ فاروقی نے 'امیر خسرو'، ڈاکٹر شہلا احمد نے 'اسرار الحق مجاز' پر مضمون پیش کیا۔ ٹی این بھارتی نے 'میرا پہلا روزہ' کے عنوان سے انشائیہ پیش کیا۔ شارق اعجاز عباسی نے ایک افسانچہ پیش کیا۔ ایکتا سنگھ چوہان، سیما کوشک، سمن ناگر سرل نے کہانیاں پیش کیں۔ گولڈی غضب اور پروین ویاس نے حشمت بھاردواج کی شاعری پر گفتگو کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 26 مئی 2026

کرشن لال ثاقب بریلوی واکشے کمار کے نام ایک شام

نئی دھلی: حلقہ تشنگان ادب کی 586 ویں شعری نشست 25 مئی کو بہ یاد آنجہانی کرشن لال ثاقب بریلوی

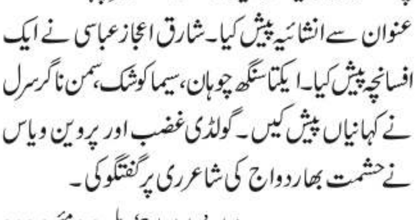

واکشے کمار، این ڈی ایم سی کمیونٹی سینٹر 5 بابر روڈ، نزدیک منڈی ہاؤس نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ دونوں اردو زبان کے بہترین شاعر گزرے ہیں۔ صدارت پروفیسر کے کے رشی نے فرمائی اور آشیش سنہا نے نظامت انجام دی۔ نشست کے میزبان اہل خانہ آنجہانی اکشے کمار تھے۔ ڈائس پر حلقہ تشنگان ادب کے جنرل سکریٹری سیماب سلطان پوری، ڈاکٹر خرم نور اور ڈاکٹر آدیش تیاگی تشریف فرما تھے۔ پریس سکریٹری حلقہ تشنگان ادب ڈاکٹر حبیب سیفی نے کہا شریواستو اور سکسینہ خاندان کے افراد اردو زبان و تہذیب اور ثقافت کے محافظ ہیں۔ اردو چونکہ محبت کی زبان ہے اس کے فروغ کی اس گھرانے کی کوششوں کو سراہا جانا ضروری ہے، جب تک ایسے لوگ اردو کی خدمت کرتے رہیں گے اردو کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔ ان کے خلوص کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ ایسی شدید گرمی کے باوجود آنجہانی کرشن لال ثاقب اور اکشے کمار کی یاد میں منعقد نشست میں اتنی بڑی تعداد میں شعرا و شاعرات کوی وکویتر یاں شریک ہوئیں۔ پروفیسر کے کے رشی نے آنجہانی کرشن لال ثاقب بریلوی کی رباعیات اور قطعات پیش کیے۔ ثاقب بریلوی کی چوتھی پیڑھی میں اردو زبان سیکھنے کا جذبہ دیکھتے ہوئے شرکا نے ریتک، آدتیہ سکسینہ، کارتک سکسینہ کی نظموں کی دل کھول کر ستائش کی۔ اس موقع پر سابق سکریٹری محکمہ فن وثقافت و السنہ حکومت دہلی منیشا سکسینہ، میزبان امت کمار، دیویا شری واستو دیگر شامل رہے۔ نشست میں کم وبیش 42 شعرا و شاعرات نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں امت کمار نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، حبیب سیفی، حوض رانی، دہلی، 26 مئی 2026

اتر پردیش

مولانا حسرت موہانی: شخصیت اور فن

میرٹھ: سید فضل الحسن یعنی مولانا حسرت موہانی پر بہت کم کام ہوا ہے۔ جیسے ان کے کارنامے ہیں ان پر ایسی تحقیق نہیں ہوئی ہے۔ آپ ایک تعلیم یافتہ خاندان کے فرد تھے۔ مولانا حسرت موہانی کی شاعری میں زبان کی چاشنی، شاعری کا تیکھا پن اور شوخیانہ انداز خوب ملتا ہے۔ یہ الفاظ تھے بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) کے جو شعبۂ اردو اور بین الاقوامی اردو اسکالرز انجمن (ایوسا) کے زیر اہتمام منعقد آن لائن پروگرام بعنوان 'مولانا حسرت موہانی: شخصیت اور فن' میں خصوصی مقرر کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا حسرت موہانی

کے رسالہ 'اردوئے معلیٰ' میں ادب بھی ہے، اور سماج بھی ہے۔ حسرت حسن و عشق کا شاعر ہے۔ ان کی شاعری میں صوفیانہ پن بھی ہے۔ ان کی شاعری کا یہ حسن قارئین بالخصوص نوجوانوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ادیب و ناقد اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد اور سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ خصوصی مقرر کے بطور کناڈا سے معروف محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی نے شرکت فرمائی۔ پروگرام میں ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین (لکھنؤ) بھی موجود رہیں۔ استقبالیہ کلمات شعبۂ اردو کی ریسرچ اسکالر سید مریم الٰہی اور پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر پروگرام کا تعارف اور اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ حسرت موہانی کی شاعری میں حب الوطنی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں حقیقت ہے۔ انھوں نے اعلیٰ درجے کی شاعری کی۔ بعد میں غزل کے حوالے سے بھی انھیں شاعری میں خوب مقبولیت ملی۔ پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ حسرت شناسی کے دو ماہرین نے پروگرام کو مزید پروقار بنا دیا۔ آج کی گفتگو واقعی مدتوں تک ذہن نشیں رہے گی۔ مولانا بچپن سے ہی میرے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ حسرت موہانی پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنی شاعری میں ہر موضوع کو برتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 23 مئی 2026

فیض احمد فیض: حیات و خدمات

رائے بریلي: فیض احمد فیض کی شاعری قاری کے دل میں امید کی شمع روشن کرتی ہے اور اسے بہتر معاشرے

کی جدوجہد کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام آج بھی اتنا ہی مقبول اور معنویت سے بھرپور ہے جتنا اپنے عہد میں تھا۔ فیض نے اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی، جس میں محبت اور انقلاب ایک دوسرے کے ہم سفر نظر آتے ہیں، اور یہی ان کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد اوصاف (ہیومینیٹرین گروپ آف اسکولز) نے ایان ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام و فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے منعقد سمینار 'فیض احمد حیات و خدمات' الحمد پبلک ہائی اسکول رائے بریلی میں پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ مہمان خصوصی محمد معوذ (پرنسپل الحمد پبلک اسکول) نے سمینار میں کہا کہ فیض کی شاعری میں رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ محبوب سے گفتگو کرتے ہوئے بھی دراصل سماج کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ مہمانِ ذی وقار اور سماجی کارکن سید عقیل احمد نے کہا کہ بلاشبہ فیض اردو ادب کا ایک عظیم نام ہے۔ فیض نے اپنی شاعری کی ابتدا رومانی فضا میں کی لیکن اس کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور انقلابی سوچ کے زیر اثر یوں ہوا کہ رومانویت اور انقلابی منڈیروں پر ان کی شاعری کا دیا کبھی مدھم تو کبھی تیز روشنی کے ساتھ جلتا رہا۔ مہمانِ اعزازی اور سینئر صحافی ہمایوں چودھری نے کہا کہ فیض کی شاعری اردو ادب کا ایک درخشاں باب ہے، جس میں محبت، انسانیت اور امید کے رنگ نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔ مقالہ نگاران ڈاکٹر سید محمد صبیح، ڈاکٹر سیما صدیقی، ضیاء اللہ صدیقی ندوی، نکہت زہرا اور ڈاکٹر ارشاد احمد خان بیاروی وغیرہ نے کہا کہ فیض کی شاعری جوان جذبوں کی شاعری ہے۔ یہ جذبہ خواہ وہ انقلاب سے تعلق رکھتا ہو یا محبت سے۔ فیض کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے انقلابی آہنگ پر جمالیاتی احساس کو، جمالیاتی احساس پر انقلابی آہنگ کو قربان نہیں کیا۔ بلکہ ان دونوں کی آمیزش سے ایک نیا شعری رچاؤ پیدا کیا، ان کی شاعری میں دلآویزی، دل آسانی، نرمی اور قوت شفا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 اپریل 2026

ادب اطفال کے فروغ میں خواتین کا حصہ

میرٹھ: جب ادب بھی نہیں تھا تب سے خواتین نے بچوں کے ادب پر سوچا، لکھا اور پڑھا ابھی منیو جان ہی نہیں سکتے تھے کہ اگر وہ اپنی ماں سے یہ نہ سنتے کہ چکرویو کیسے ٹوٹے گا۔ جو بچوں کے لیے لکھ رہے ہیں یا بچوں کے لیے ادارے کھلے ہوئے ہیں، انھیں ان کا حق نہیں مل رہا ہے۔ یہ الفاظ تھے سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر صغیر افراہیم کے جو شعبۂ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد 'ادب اطفال کے فروغ میں خواتین کا حصہ' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمارے مدارس، اسکول، کالجز اور یونیورسٹیز کو چاہیے کہ بچوں کے ادب پر کام کریں۔ ہمیں اپنی فکر، سوچ، زاویہ اور لب ولہجہ بدلنا ہوگا کیونکہ ماحول میں ذرا سی تلخی بچوں کے دل پر اثر کرتی ہے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور معروف فکشن نگار قمر جمالی، حیدرآباد اور مہمان اعزازی کے بطور دہلی سے معروف فکشن نگار نعیمہ جعفری پاشا نے شرکت فرمائی اور مقالہ نگار کے بطور معروف جرنلسٹ شاہ تاج خان، پونا اور نزہت اختر، میرٹھ نے شرکت کی۔ مقرر کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی، نظامت ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی رسم فرحت اختر نے ادا کی۔ پروگرام کا تعارف پروفیسر اسلم جمشید پوری نے پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' 15 مئی 2026

ہندوستانی علمی روایت میں مخطوطات کی اہمیت اور نئی نسل کے لیے اس کی افادیت

لکھنؤ: اترپردیش کے سرکاری محکمۂ آرکائیوز کی جانب سے اپنے 77 ویں یوم تاسیس کے موقعے پر 'ہندوستانی

علمی روایت میں مخطوطات کی اہمیت اور نئی نسل کے لیے اس کی افادیت' کے عنوان سے ایک روزہ قومی سمپوزیم اور دستاویزی نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ یہ سمپوزیم وزیر ثقافت و سیاحت حکومت اترپردیش جے ویر سنگھ کی رہنمائی میں انعقاد کیا گیا۔ اس سمپوزیم کے مہمان خصوصی لینگویج یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ مخطوطات کسی بھی قوم کی تہذیبی شناخت، فکری روایت اور علمی سرمایہ کے امین ہوتے ہیں۔ یہ صرف قدیم دستاویزات نہیں بلکہ ہماری تاریخ، فلسفہ، ادب، مذہب، سائنس اور سماجی اقدار کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی علمی روایت دنیا کی قدیم ترین روایات میں شمار ہوتی ہے اور یہاں مخطوطات کی تاریخ تقریباً چھ ہزار سال پر محیط ہے جن میں ہمارے اسلاف کی دانش، تجربات اور فکری بصیرت محفوظ ہے۔ پروفیسر اجے تنیجا نے کہا کہ موجودہ دور میں جب نئی نسل تیزی سے ڈیجیٹل دنیا کی طرف مائل ہو رہی ہے، ایسے میں مخطوطات کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ ہماری تہذیبی جڑوں سے وابستگی کا احساس دلاتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ نوجوانوں کو اپنی علمی و ثقافتی وراثت سے روشناس کرانا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی تاریخ اور تہذیب کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ سمپوزیم کے پہلے اجلاس میں پروفیسر سمن مشرا نے کہا کہ آرکائیوز قوم کی یادداشت کے مراکز ہوتے ہیں لہٰذا ان کا تحفظ معاشرے کی اخلاقی ذمہ داری ہے اور نئی نسل کو اس جانب آگے آنا چاہیے۔ ڈاکٹر سشیل کمار پانڈے نے کہا کہ قدیم مخطوطات ہندوستانی فکر و دانش کی نمائندگی کرتے ہیں اور ہمیں اپنی علمی روایت سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ پروفیسر ارون کمار یادو نے اپنے خطاب میں کہا کہ مخطوطات ہمیں قدیم دانشوروں، رشیوں اور منیوں کی علمی روایت سے جوڑتے ہیں۔ دوسرے اجلاس میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ سنسکرت کے ڈاکٹر ستیہ کیتو نے کہا کہ

مخطوطات علم و دانش کے اہم دستاویزات ہیں اور اگر ہم قدیم علمی روایت کا تحفظ وفروغ چاہتے ہیں تو اجتماعی کوششیں ناگزیر ہیں۔ ڈاکٹر دیپتی جیسوال نے کہا کہ قرون وسطیٰ سے مخطوطات کے واضح شواہد ملتے ہیں اور مغلیہ دور کے اہم مخطوطات سے اس عہد کی تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پروفیسر انل کمار اور ڈاکٹر سوربھ مشرا نے حکومت ہند کے 'گیان بھارت مشن' کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس منصوبے کے ذریعے ملک بھر کے مخطوطات کو ڈیجیٹل پورٹل پر عام لوگوں کے لیے دستیاب کرایا جارہا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 مئی 2026

عالمی یوم عجائب گھر کے موقعے پر رضا لائبریری میں تاریخی نوادرات کی نمائش

رامپور: عالمی یوم عجائب گھر کے موقعے پر رامپور رضا لائبریری اور میوزیم نے لائبریری میں محفوظ نایاب اور

تاریخی نوادرات کی خصوصی نمائش کا اہتمام کیا۔ اس نمائش کا افتتاح دربار ہال میں رامپور رضا لائبریری اور میوزیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا نے کیا۔ اس موقعے پر نمائش میں لائبریری اور میوزیم میں محفوظ مختلف نایاب نوادرات، مخطوطات، پینٹنگز اور تاریخی خزانے کی نمائش کی گئی۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا نے کہا کہ بین الاقوامی میوزیم ڈے ہمارے ثقافتی ورثے اور تاریخی ورثے کے تحفظ کے بارے میں بیداری پیدا کرنے کا ایک اہم موقع ہے۔ رامپور رضا لائبریری نہ صرف علم وتحقیق کا ایک بڑا مرکز ہے بلکہ ہندوستانی ثقافت، فن اور تاریخ کے انمول خزانوں کو محفوظ کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایسی نمائشیں نئی نسل کو اپنے ثقافتی ورثے سے جوڑنے اور تاریخ میں دلچسپی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عجائب گھر معاشرے کو اس کے ورثے کی یاد دلانے کے لیے بنائے جاتے ہیں اور ہمارے پاس جو ذخیرہ ہے خاص طور پر مخطوطات، صرف لائبریری کی اشیا نہیں ہیں بلکہ میوزیم کی اشیا ہیں۔ میوزیم میں رکھی گئی کوئی بھی چیز لائیو اسٹاک کہلاتی ہے کیونکہ وہ زندہ ہوتی ہے۔ ان میں ہماری ثقافت اور تاریخ محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم پہلے ہی حامد منزل اور رنگ محل کو میوزیم بنانے کی طرف بڑھ چکے ہیں۔ یہ سب کے تعاون سے ہی پورا ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہم اپنی ذمے داری اور جوابدہی کو پہچانتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں پوری تندہی سے ادا کرتے رہیں اور اس سمت میں آگے بڑھیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 مئی 2026

پروفیسر شارب ردولوی یادگاری خطبہ اور تقسیم ایوارڈ تقریب

لکھنؤ: پروفیسر شارب ردولوی میموریل کمیٹی کے زیراہتمام آل انڈیا کیفی اعظمی اکادمی نشاط گنج میں پروفیسر شارب ردولوی ایوارڈ 2025 تقریب اور پروفیسر شارب ردولوی میموریل لکچر کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر عمار رضوی (سابق عبوری وزیر اعلیٰ اترپردیش) نے کی جب کہ مہمان ذی وقار کے طور پر پروفیسر قمر جہاں (سابق صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی) شریک جلسہ رہیں۔ نظامت کا فریضہ پروفیسر عباس رضا نیر (صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ) نے انجام دیا۔ پروفیسر ریشماں پروین (صدر شعبۂ اردو کھن کھن جی گرلس پی جی کالج لکھنؤ) نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ شارب ردولوی ایوارڈ ہم لوگ ان کی زندگی ہی میں شروع کرنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ انھوں نے بتایا کہ پہلا پروفیسر شارب ردولوی ایوارڈ معروف ناقد پروفیسر عتیق اللہ کو دیا گیا تھا جب کہ دوسرا ایوارڈ حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ ادو پروفیسر سید مجاور حسین رضوی کو دیا گیا اور آج تیسرا ایوارڈ ممتاز ترقی پسند ناقد اور محقق پروفیسر علی احمد فاطمی (سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی) کو دیا جارہا ہے۔ ڈاکٹر موسیٰ رضا نے پروفیسر علی احمد فاطمی کے تعلق سے سپاس نامہ پڑھا۔ بعد ازاں سید قمر حسن رضوی جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ لکھنؤ بنچ کے ہاتھوں پروفیسر علی احمد فاطمی کو تیسرا پروفیسر شارب ردولوی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج پروفیسر شارب ردولوی ایوارڈ پاکر جتنی خوشی ہورہی ہے اتنی خوشی کوئی اور ایوارڈ پاکر محسوس نہیں ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میرا ان کا ساتھ تقریباً پچاس برسوں کو محیط ہے۔ انھوں نے کہا کہ شارب ردولوی نے نہ صرف حالی، آزاد، شبلی وغیرہ کے منطقی اور عقلی طرز تنقید کو آگے بڑھایا بلکہ خود ایک ناقابل فراموش دبستان بھی بن گئے۔ جسٹس سید قمر حسن رضوی نے اپنے خطاب میں شارب ردولوی کی شخصیت کو ایک مقناطیسی شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی تنقید میں وہی معتدل مزاجی ہے جو ان کی نستعلیق شخصیت میں تھی۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خالد اشرف نے 'پروفیسر شارب ردولوی اور ان کے تنقیدی افکار' کے حوالے سے اپنے خطبہ میں شارب ردولوی کی شخصیت اور ان کے طرز تنقید پر تفصیلی گفتگو کی۔ ڈاکٹر عمار رضوی نے اپنے صدارتی خطاب میں محبتوں کے ساتھ شارب ردولوی کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ جب تک اردو ادب رہے گا تب تک پروفیسر شارب ردولوی کا نام بھی زندہ رہے گا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 اپریل 2026

اڑیسہ کے یوم تاسیس کے موقعے پر ثقافتی پروگرام کا انعقاد

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے اٹل ہال میں یونیورسٹی کی چانسلر اور اترپردیش کی گورنر آنندی بین پٹیل کی ہدایات کے مطابق اڑیسہ یوم تاسیس کے موقعے پر ایک شاندار اور باوقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام میں یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ، افسران اور مختلف شعبہ جات کے ذمے داران نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ پورا ماحول قومی یکجہتی، ثقافتی ہم آہنگی اور ایک بھارت، سریشٹھ بھارت کے جذبے سے سرشار نظر آیا۔ اڑیسہ یوم تاسیس کی مناسبت سے یونیورسٹی کی کلچرل کمیٹی کی نگرانی میں گذشتہ تین روز سے مختلف سطحوں پر ثقافتی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان سرگرمیوں میں رنگولی مقابلہ، تقریری مسابقہ، اڑیسہ کی روایتی موسیقی ورقص کی پیشکش، ثقافتی مظاہرہ اور معلوماتی پروگرام شامل تھے۔ ان پروگرام نے نہ صرف طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کیا بلکہ انھیں ہندوستان کی علاقائی ثقافتوں سے قریب تر ہونے کا موقع بھی فراہم کیا۔ مرکزی تقریب کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا

نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے طلبہ کی کاوشوں، محنت اور بھرپور شرکت کو بے حد سراہتے ہوئے کہا کہ اس نوعیت کی تقریبات نوجوان نسل میں قومی شعور، تہذیبی آگہی اور ثقافتی احترام کے جذبات کو فروغ دیتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مختلف ریاستوں کے یوم تاسیس منانے کا مقصد صرف ایک رسمی تقریب منعقد کرنا نہیں بلکہ ملک کی گوناگوں تہذیبی روایتوں کو سمجھنا، ان سے سیکھنا اور قومی یکجہتی کے رشتے کو مزید مضبوط بنانا ہے۔ پروفیسر اجے تنیجا نے اپنے خطاب میں اڑیسہ کی عظیم تہذیب، قدیم تاریخ، لوک روایات اور جغرافیائی اہمیت پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اڑیسہ کی تہذیبی شناخت ہندوستان کی کثرت میں وحدت کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ طلبہ کو چاہیے کہ وہ اس طرح کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تاکہ انھیں ملک کی مختلف ریاستوں کی زبان، ادب، تہذیب، تاریخ اور سماجی ساخت سے آگاہی حاصل ہو۔ ان کے مطابق یہی سرگرمیاں مستقبل میں ایک باشعور، وسیع النظر اور ذمے دار شہری کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس پروگرام میں مہمانان خصوصی کے طور ڈاکٹر ستیہ نارائن سبت، پروفیسر سنیتا مشرا، ڈاکٹر مونیکا تنیجا اور پروفیسر سکانت چودھری نے شرکت کی۔ اس پروگرام میں مہمان خصوصی پروفیسر سکانت چودھری نے اڑیسہ کی عظیم تہذیبی وثقافتی وراثت کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 اپریل 2026

ہندوستانی علمی روایت میں قبائلی لوک و ثقافتی پہلو

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ سنسکرت کے زیر اہتمام 'ہندوستانی علمی روایت میں قبائلی لوک و

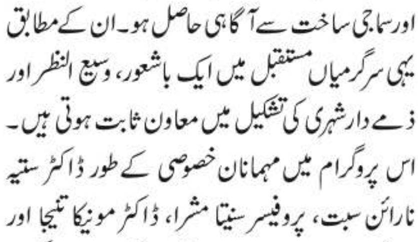

ثقافتی پہلو' کے موضوع پر منعقدہ تین روزہ قومی سمینار مقامی علمی نظاموں اور لوک روایات پر مفید علمی مباحث کے ساتھ تکمیل کو پہنچا۔ اختتامی اجلاس میں پرووائس چانسلر پروفیسر محمد محسن خان نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی، جب کہ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر وید پرکاش ڈنڈوریا خاص مہمان رہے۔ اجلاس کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے شعبہ سنسکرت کے سربراہ پروفیسر بھارتیندو پانڈے نے کی۔ سمینار کا انعقاد شعبہ سنسکرت کی چیئرپرسن اور سمینار کی کنوینر پروفیسر ساریکا وارشنے کی نگرانی میں کیا گیا۔ اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر محمد محسن خان نے کہا کہ اس نوعیت کے علمی مباحث فکری وسعت اور تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پروفیسر وید پرکاش ڈنڈوریا نے سمینار کے موضوع کو کثیر جہتی اور مستقبل کی تحقیق کے لیے امکانات سے بھرپور قرار دیا، جب کہ پروفیسر بھارتیندو پانڈے نے کہا کہ اس موضوع پر مسلسل علمی گفتگو اور گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر عائشہ صدیقہ نے سمینار کی رپورٹ پیش کی۔ سمینار کے دوران 9 آف لائن اور 2 آن لائن نشستوں میں مجموعی طور پر 95 ریسرچ پیپرز پیش کیے گئے۔ سمینار میں دہلی، اترپردیش، جھارکھنڈ راجستھان، مدھیہ پردیش اور کیرالہ سمیت مختلف ریاستوں سے ماہرین و محققین نے شرکت کی۔ مقررین میں مسٹر ہری رام مینا، مسٹر رانیندر، پروفیسر سدیش آہوجا، پروفیسر ایم شاہ الحمید، پروفیسر بجرنگ بہاری تیواری، پروفیسر ٹیک چند مینا، پروفیسر سی آر مینا، ڈاکٹر گنگا سہائے مینا، ڈاکٹر پاروتی ترکے، ڈاکٹر دھنجے منی ترپاٹھی، ڈاکٹر کمل نین چوبے، ڈاکٹر ایم کشن، ڈاکٹر نونیہال گوتم، ڈاکٹر ٹی مہندر، ڈاکٹر کوشل تیواری اور ڈاکٹر ارون نشاد شامل تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 مئی 2026

نتائج پر مبنی تعلیم: نفاذ اور جانچ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم نے اپنے اساتذہ کے لیے 'نتائج پر مبنی تعلیم: نفاذ اور جانچ' کے موضوع پر ایک اورینٹیشن پروگرام منعقد کیا، جس کا مقصد نتائج پر مبنی تعلیم کی تفہیم اور نیشنل اسسمنٹ اینڈ ایکریڈیٹیشن کونسل (نیک) کے فریم ورک کے مطابق اس کے نفاذ اور اسسمنٹ سے متعلق صلاحیتوں کو مستحکم کرنا تھا۔ شعبہ تعلیم کی صدر پروفیسر نکہت نسرین نے پروگرام کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور ریسورس پرسنز، نیک، اے ایم یو کے ڈائرکٹر پروفیسر عابد علی خاں اور شعبہ میکینکل انجینئرنگ کے پروفیسر فیصل حسن کا خیر مقدم کیا۔ اپنے خطاب میں پروفیسر عابد علی خاں نے نیک کی بدلتی ہوئی ضروریات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ادارہ جاتی معیار اور ایکریڈیٹیشن کے عمل کو مضبوط بنانے کے لیے متعارف کرائے گئے، 10 نئے نکات کی وضاحت کی۔ انھوں نے تعلیمی منصوبہ بندی میں ادارے کے وژن اور مشن کی اہمیت کو اجاگر کیا اور پروگرام کے نتائج، کورس کے مقاصد اور کورس کے نتائج کو نتائج پر مبنی تعلیم کی بنیاد قرار دیا۔ انھوں نے نصاب کی تیاری اور اس کی اہمیت پر بھی گفتگو کی، جس کے ذریعے ادارہ جاتی اہداف، تدریسی و تعلیمی عمل اور اسسمنٹ کے طریقوں کے درمیان ہم آہنگی کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ پروفیسر فیصل حسن نے نتائج پر مبنی تعلیم کے فریم ورک کے تحت براہِ راست اور بالواسطہ جانچ کے طریقہ کار کی وضاحت کی۔ انھوں نے بتایا کہ اسسمنٹ کی حکمت عملیوں کو کس طرح نصابی نتائج کے ساتھ موثر انداز میں مربوط کیا جاسکتا ہے تاکہ طلبہ کی تعلیمی دستیابیوں کا جائزہ لیا جاسکے۔ انھوں نے تعلیمی کارکردگی کی نگرانی اور معیار میں مسلسل بہتری کے لیے اسسمنٹ سے حاصل شدہ ڈیٹا کے معقول استعمال پر بھی زور دیا۔ پروگرام کا اختتام ایک تعاملی نشست پر ہوا جس میں اساتذہ نے نتائج پر مبنی تعلیم کے نفاذ اور اسسمنٹ کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات پیش کیے۔ پروفیسر نکہت نسرین نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 جون 2026

رضا لائبریری میں کبیر جینتی کے موقعے پر نمائش کا اہتمام

رامپور: رامپور رضا لائبریری اور میوزیم نے کبیر جینتی کے موقعے پر نمائش کا اہتمام کیا۔ نمائش کا افتتاح

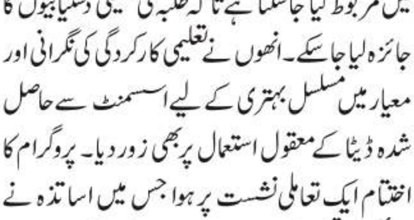

ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا نے کیا۔ اس موقعے پر نمائش میں سنت کبیر کی زندگی، فلسفہ، شاعری، عوامی شعور اور ہندوستانی ثقافتی روایت میں ان کی انمول شراکت سے متعلق نایاب

مواد کی نمائش کی گئی۔ اس نمائش کا مقصد سنت کبیر کے افکار کو عام لوگوں، محققین اور نوجوان نسل تک پہنچانا اور ان کی تعلیمات کے بارے میں بیداری بڑھانا ہے۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا نے کہا کہ سنت کبیر ہندوستانی سماج میں ہم آہنگی، انسانی اقدار اور روحانی شعور کی منفرد علامت ہیں۔ ان کے خیالات آج بھی سماجی ہم آہنگی، مساوات اور انسانیت کا پیغام دیتے ہیں۔ رامپور رضا لائبریری اور میوزیم کی یہ مسلسل کوشش ہے کہ اس طرح کی نمائشوں اور تقریبات کے ذریعے ملک کے بھرپور ثقافتی اور ادبی ورثے کو وسیع تر عوام تک پہنچایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ کبیر کے الفاظ وقت اور سماج کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے آج بھی اتنے ہی متعلقہ ہیں جتنے ان کی زندگی میں تھے۔ ان کی تعلیمات معاشرے کو مثبت سمت فراہم کرتی ہیں۔ ڈاکٹر مشرا نے کہا کہ سنت کبیر داس کے بارے میں بات کرنا انتہائی مشکل سمجھا جاتا ہے کیونکہ کبیر جتنے سادہ ہیں اتنے ہی گہرے اور پیچیدہ ہیں۔ کبیر کو سمجھنے کے لیے ہندوستانی فکر کے دو بڑے دھاروں کو سمجھنا ضروری ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 جون 2026

بہار

قاضی عبدالودود یادگاری تقریب

پٹنہ: قاضی عبدالودود اردو تحقیق کا سب سے بڑا نام ہے۔ پوری ادبی دنیا میں وہ ایک حوالے، راہرو، اور قائد کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ قاضی عبدالودود تحقیق کے شعبے میں معلم ثانی کہے جاتے ہیں۔ یہ باتیں محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، اردو ڈائریکٹوریٹ کے زیراہتمام منعقد

فنیشور ناتھ رینو ہندی بھون واقع آڈیٹوریم میں قاضی عبدالودود یادگاری تقریب و بزم سخن پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ قاضی عبدالودود بنیادی طور پر روایت شکن اور بت شکن رہے۔ قاضی صاحب نے اردو متون کی درستگی تدوین متن کے لیے جو اصول مرتب کیے وہ پہلی بار مرتب ہوئے۔ اس موقعے پر پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محسن رضا نقوی اور ڈی بی کالج کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر مسرور صغریٰ رضوی نے پرمغز گفتگو کی۔

صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر شاہ حسین احمد، سابق صدر شعبہ اردو ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ نے کہا کہ قاضی عبدالودود کا مطالعہ بہت وسیع تھا، وہ بے باک اور حق گو تھے۔ انھوں نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ قاضی شناسی پر کام کیا جائے۔ استقبالیہ و تعارفی کلمات اردو ڈائرکٹوریٹ کے فعال ڈائرکٹر ایس ایم پرویز عالم نے پیش کیے۔ طلبہ وطالبات کی پیش کش کے تحت سعدیہ وسیم، ایم اے (اردو)، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ اور عمرہ فاطمہ، ایم اے (اردو) پٹنہ یونیورسٹی نے اپنی کاوشیں پیش کیں۔ دوسرے اجلاس میں بزم سخن کے تحت مشہور و معروف شاعر اسد رضوی کی صدارت اور چونچ گیاوی کی نظامت میں مشاعرے کا انعقاد ہوا، جس میں ڈاکٹر رونق شہری، تعظیم احمد گوہر، تنویر اختر، محمد قسیم احمد عرف چونچ گیاوی، صابر سہر ساوی، اشفاق عادل، طاہر الدین طاہر، اویناش امن، دلشاد نظمی اور شویتا غزل نے اپنے کلام سے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر ایس ایم پرویز عالم نے دلکش انداز اور مسحور کن ترنم میں غزل پیش کرکے خوب داد وصول کی۔ تقریب کا اختتام افریدہ حبیب، اردو ڈائریکٹوریٹ، پٹنہ کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مئی 2026

غیر مسلم شعرا کی خدمات

مظفرپور: اردو زبان جس نے ہمیشہ امن و محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیا، آج اس زبان کو بھی اپنے وجود کی بقا کے لیے کوششیں کرنی پڑ رہی ہیں، ایسے میں شعبہ اردو بہار یونیورسٹی مظفرپور کا دو روزہ قومی سمینار

ہمیں اپنے روشن ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ہندوستانی زبانوں کا مرکز جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے سابق چیئرپرسن پروفیسر انور پاشا نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو شعر و ادب کی آبیاری میں غیر مسلم شعرا کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ صرف شعرا کے نام کی فہرست تیار کی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے گی۔ ایسے میں ہماری ذمے داری ہے ان گمنام شعرا کو منظر عام پر لائیں جن کی خدمات پر وقت کی گرد پڑ چکی ہے۔ صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج، کولکاتا ڈاکٹر دبیر احمد نے کہا کہ غیر مسلم شعرا کی خدمات پر سمینار کروانا شعبہ اردو بہار یونیورسٹی مظفرپور کی ایسی کاوش ہے جس کی پذیرائی کی جانی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ آج جب مطالعے کا رجحان بہت کم ہوگیا ہے، ایسے میں علمی و ادبی سمینار طلبا میں لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا کرتے ہیں، واضح رہے کہ شعبہ اردو بہار یونیورسٹی مظفرپور کے زیراہتمام اردو کے غیر مسلم شعرا (بیسویں صدی میں) کے عنوان سے دو روزہ قومی سمینار کا افتتاح وائس چانسلر پروفیسر دنیش چندر رائے نے کیا تھا۔ آج سمینار کے دوسرے دن کے پہلے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر انور پاشا اور ڈاکٹر دبیر احمد نے کی جب کہ نظامت کا فریضہ شعبہ کے استاد ڈاکٹر محمد امان اللہ نے انجام دیا۔ پہلے تکنیکی سیشن میں شبستاں پروین، زینب یاسمین، ڈاکٹر شگفتہ یاسمین (کٹیہار)، ایس ایم ظفر اقبال (سیوان)، کامران غنی صبا، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم (بتیا)، ڈاکٹر حسن رضا اور ڈاکٹر ریحان غنی نے موضوع کے مختلف گوشوں پر اپنے قیمتی مقالے پیش کیے۔ دوسرے تکنیکی سیشن کی صدارت ڈاکٹر ریحان غنی اور ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے فرمائی۔ نظامت کا فریضہ شعبہ کے استاد ڈاکٹر محمد سلیم نے انجام دیا۔ ڈاکٹر ریحان غنی نے کہا کہ ہندوستان کی مٹی میں محبت اور بھائی چارہ ہے۔ اردو اسی مٹی سے پیدا ہوئی ہے اور ہندوستان سے اردو کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے کہا کہ شعبہ کے طلبا کی شاندار پیشکش اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔ اس سیشن میں شبانہ خاتون، عذری نسیم، نور سلیمہ، محمد کلیم، ڈاکٹر مبشرہ صدف، ڈاکٹر مستفیض احد، ڈاکٹر سید عباس شاہ، ڈاکٹر ابوذر علی اور پروفیسر ظفیر الدین انصاری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کے آخر میں کامران غنی صبا نے دو روزہ قومی سمینار پر اپنی تجزیاتی رپورٹ پیش کی۔ شکریہ کی رسم صدر شعبۂ اردو پروفیسر سید آل ظفر نے انجام دی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 مئی 2026

ڈاکٹر احسان عالم کی تصانیف پر علمی و ادبی نشست

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ دربھنگہ کے زیر اہتمام حکیم دمڑی منزل، ڈاکٹر آفتاب حسین کمپلیکس، سبھاش چوک دربھنگہ میں ایک اہم علمی و ادبی نشست منعقد ہوئی جس کا عنوان 'ڈاکٹر احسان عالم کی کتابوں پر گفتگو' مقرر کیا گیا تھا۔ اس نشست کا مقصد ڈاکٹر احسان عالم کی علمی و تحقیقی خدمات، ان کی فکری جہات اور ان کی تصانیف کے ادبی اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش کرنا تھا۔ نشست کی صدارت سید محمود احمد کریمی نے کی، جب کہ مہمانِ خصوصی کے طور پر پروفیسر محمد آفتاب اشرف اور ڈاکٹر عطا عابدی شریک ہوئے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے کی۔ مقررین نے ڈاکٹر احسان عالم کے تحقیقی اسلوب، تنقیدی بصیرت، فکری تسلسل اور ان کی کتابوں کی علمی افادیت پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا۔ اربابِ فکر و دانش نے کہا کہ ڈاکٹر احسان عالم اردو تحقیق و تنقید کے معتبر اور اہم نام ہیں جن کی تصانیف نے اردو ادب کے مختلف گوشوں کو نئی جہتیں عطا کی ہیں۔ نہ صرف اپنے مطالعے کے حاصل کو ترتیب دینے کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں بلکہ دیگر فنکار شخصیت کی خدمات کی تحسین و اعتراف کا عمل بھی روا رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر احسان عالم کی یہ دو کتابیں ان باتوں کو سچ ثابت کرتی ہیں۔ ڈاکٹر احسان عالم کا یہ کارجنوں ہے اور ایسا کارجنوں ہے جو نئے شعرا ادبا کو خاص طور پر دعوتِ تقلید دیتا ہے۔ پروفیسر محمد آفتاب اشرف نے احسان عالم کی شعری و ادبی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جو محنت کی ہے وہ رنگ لا رہی ہے۔

بزرگ ادیب نذیر فتح پوری کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک بڑے اور نامور ادیب کے کارناموں کو اجاگر کرنے میں احسان عالم نے ایک نمایاں کام کیا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ایوب راعین، منظر الحق منظر صدیقی، ڈاکٹر ارشد سلفی، ڈاکٹر ریحان احمد قادری نے اظہارِ خیال کیا۔ آخر میں پروگرام کی صدارت کر رہے جناب سید محمود احمد کریمی صاحب نے کہا کہ میں ڈاکٹر احسان عالم کو صحت و سلامتی کی دعائیں دیتا ہوں تاکہ وہ مزید کام کر سکیں اور اردو کے ذخیرے میں کچھ اضافہ کر سکیں۔ آخر میں المنصور ٹرسٹ کے سکریٹری ڈاکٹر منصور خوشتر نے تمام مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی 21 مئی 2026

تلنگانہ

اردو میں تحقیق کا فن اور عہد حاضر کے تقاضے

نظام آباد: تلنگانہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام 'اردو میں تحقیق کا فن اور عہدِ حاضر کے تقاضے کے عنوان سے ایک روزہ قومی ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ محض ایک تعلیمی تقریب نہیں بلکہ ایک ایسا سنجیدہ علمی مکالمہ تھا جس میں روایت اور جدت کے امتزاج کے ساتھ تحقیق کے نئے زاویوں اور تقاضوں کو نہایت بصیرت کے ساتھ پیش کیا گیا۔ یونیورسٹی کالج آف آرٹس اینڈ سائنسز کے سمینار ہال میں منعقدہ اس ورکشاپ میں ریاست کے مختلف علاقوں، بچکندہ، مدنور، بانسواڑہ، کاماریڈی، کورٹلہ، بودھن اور نرمل سے تعلق رکھنے والے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ شرکا کی موجودگی اس بات کی آئینہ دار تھی کہ اردو تحقیق کے میدان میں ایک نئی فکری بیداری جنم لے رہی ہے۔

ورکشاپ کے مہمانِ خصوصی، وائس چانسلر پروفیسر ٹی یادگیری راؤ نے اپنے بصیرت افروز خطاب میں اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ موجودہ عہد میں تحقیق کا دائرہ نہایت وسیع اور پیچیدہ ہو چکا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ایک کامیاب محقق کے لیے اب محض روایتی علمی مہارت کافی نہیں بلکہ جدید ٹیکنالوجی، ڈیجیٹل ذرائع اور عالمی علمی رجحانات سے واقفیت بھی ناگزیر ہے۔ انھوں نے اس نکتے کو خاص طور پر نمایاں کیا کہ علم کی دنیا اب 'کتاب' سے نکل کر 'اسکرین' تک منتقل ہو چکی ہے، اور اس تبدیلی نے تحقیق کے انداز، ذرائع اور نتائج سب کو متاثر کیا ہے چنانچہ اردو تحقیق کو بھی اسی رفتار سے ہم آہنگ ہونا ہوگا تاکہ وہ عالمی علمی منظرنامے میں اپنی موثر موجودگی برقرار رکھ سکے۔

ورکشاپ کے کنوینر اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد عبدالقوی نے اپنے جامع استقبالیہ خطاب میں تحقیق کی اصل روح کو نہایت دلنشیں انداز میں واضح کیا۔ انھوں نے تحقیق کو محض معلومات کے انبار سے الگ کرتے ہوئے اسے ایک منظم، سائنسی اور تنقیدی عمل قرار دیا اور کہا کہ تحقیق دراصل ایک مسلسل جستجو ہے، سوال کرنے، غور و فکر کرنے اور حقیقت تک رسائی

حاصل کرنے کا ایک سنجیدہ سفر۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایک کامیاب محقق وہی ہوتا ہے جو نہ صرف حقائق کی تلاش کرے بلکہ انھیں معروضی اور تنقیدی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ ڈاکٹر عبدالقوی نے عصرِ حاضر کے تناظر میں اس بات پر بھی زور دیا کہ آج کا محقق ڈیجیٹل لائبریریوں، آن لائن جرنلز، ای۔ آرکائیوز اور جدید تحقیقی پلیٹ فارمز سے واقف ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیق میں دیانت داری، حوالہ جات کی درستگی اور سرقہ سے مکمل اجتناب کو بنیادی اصول قرار دیا۔

ورکشاپ کے مختلف سیشنز میں ماہرینِ تعلیم اور دانشوران نے تحقیق کے گوناگوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر موسیٰ قریشی نے

تحقیق کے بنیادی اصولوں پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تحقیق کا مقصد سچائی کی تلاش اور حقیقت کی دریافت ہے۔ انھوں نے طلبہ کو تلقین کی کہ وہ تحقیق کو محض ڈگری کے حصول تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے فکری ارتقا کا ذریعہ بنائیں۔ ریسورس پرسن ڈاکٹر معید جاوید سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے تحقیق کی مسلسل اور ارتقائی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی تحقیق حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ انھوں نے طلبہ کو سائنسی اور تنقیدی طرزِ فکر اپنانے کی ترغیب دی اور کہا کہ تحقیق در تحقیق کا سلسلہ ہی علم کو زندہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی نے تحقیق کو علوم وفنون کے نئے انکشافات کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے کلاسیکی اور جدید ادب دونوں پر تحقیقی کام کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے مثالوں کے ذریعے واضح کیا کہ تحقیق علم کو جمود سے نکال کر ارتقا کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ عبدالرحمٰن داؤدی نے جدید ڈیجیٹل ذرائع، آن لائن وسائل اور سوشل میڈیا کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج تحقیق کا دائرہ عالمی سطح تک پھیل چکا ہے اور محقق کو ان ذرائع سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔

اختتامی تقریب میں ڈاکٹر لکشمن چکرورتی وائس پرنسپل نے اس ورکشاپ کو اردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی اور گنگا جمنی تہذیب کے استحکام کے لیے اہم قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ زبان و ادب کی تحقیق محض علمی سرگرمی نہیں بلکہ تہذیبی ہم آہنگی کا ایک موثر وسیلہ بھی ہے۔ پرنسپل پروفیسر جی رام بابو نے اس ورکشاپ کو تحقیق کے میدان میں ایک سنگِ میل قرار دیتے ہوئے اس کے کامیاب انعقاد پر منتظمین کو مبارکباد پیش کی اور شرکا میں اسناد تقسیم کیں۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر گل رعنا نے کی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر محمد عبدالقوی، صدر شعبہ اردو، تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد، 8 مئی 2026

سی پی ڈی ورکشاپ برائے اساتذہ

حیدرآباد: اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی دراصل تعلیمی اداروں کی ترقی کی ضمانت ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر پی فضل الرحمٰن، وائس چانسلر انچارج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کیا۔ وہ آج سی پی ڈی ورکشاپ برائے اساتذہ کی اختتامی تقریب سے صدارتی خطاب کر رہے تھے۔ مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے

اساتذہ اردو ذریعۂ تعلیم (CPDUMT) کے زیر اہتمام اور ارسطو جونیئر اینڈ ڈگری کالج، حیدرآباد کے اشتراک سے دس روزہ سی پی ڈی ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر فضل الرحمٰن نے سی پی ڈی یو ایم ٹی کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اردو ذریعۂ تعلیم کے اساتذہ کو جدید تعلیمی رجحانات، ٹیکنالوجی اور تدریسی حکمت عملیوں سے روشناس کرانے میں یہ مرکز قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے شرکا کو مشورہ دیا کہ وہ ورکشاپ میں حاصل کردہ معلومات اور مہارتوں کو اپنی تدریسی زندگی میں عملی طور پر بروئے کار لائیں۔ پروگرام کے آغاز میں مہمانان گرامی کا خیرمقدم کرتے ہوئے پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی، ڈائرکٹر، مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اردو ذریعۂ تعلیم، مانو، نے ورکشاپ کی غرض و غایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ اساتذہ کی مسلسل پیشہ ورانہ تربیت علمی معیار کی بہتری اور جدید تدریسی تقاضوں سے ہم آہنگی کے لیے ناگزیر ہے۔ انھوں نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے اساتذہ نے اس ورکشاپ میں بھرپور دلچسپی لی اور جدید تدریسی طریقوں سے استفادہ کیا۔ تقریب کے دوران ورکشاپ کے شرکا کی جانب سے تاثرات بھی پیش کیے گئے۔ جناب رفیع الدین، ارسطو جونیئر اینڈ ڈگری کالج، حیدرآباد، جناب محمد سہیل، یونیسن گروپس آف اسکولس، حیدرآباد اور جناب ریحان صدیقی، ارسطو جونیئر اینڈ ڈگری کالج، حیدرآباد، نے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ورکشاپ کے مختلف سیشنز نے ان کی تدریسی صلاحیتوں میں اضافہ کیا اور انھیں طلبہ کے ساتھ زیادہ موثر انداز میں کام کرنے کے لیے طریقے سکھائے۔ انھوں نے مانو اور مرکز کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نوعیت کے مزید ورکشاپس کے انعقاد کی خواہش ظاہر کی۔ اس موقعے پر ورکشاپ میں خدمات انجام دینے والے ماہرین تعلیم اور ریسورس پرسنز کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

بعد ازاں ورکشاپ کے کامیاب شرکا میں اسناد تقسیم کی گئیں۔ شرکا نے اسناد کے حصول پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس تربیتی پروگرام کو اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے لیے نہایت مفید قرار دیا۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر مہوش بانو نے شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر صحیفہ سلطانہ نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 جون 2026

تخلیق کار سے ملاقات

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) کے شعبۂ اردو میں ادبی و تخلیقی ذوق کو فروغ دینے کے مقصد سے 14 مئی کو 'تخلیق کار سے ملاقات' کے عنوان

سے ایک علمی و ادبی پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں معروف افسانہ نگار، ناقد اور فکشن رائٹر پروفیسر غضنفر علی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ پروگرام میں انھوں نے 'کہانی کیسے لکھیں' کے موضوع پر خطاب کیا۔ اپنی گفتگو میں پروفیسر غضنفر علی نے تخلیقی ادب خصوصاً افسانہ نگاری کے بنیادی اصولوں اور تقاضوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ایک کامیاب اور موثر تخلیق کار بننے کے لیے چار بنیادی اوصاف نہایت اہمیت رکھتے ہیں، قوت احساس، قوت ممیّزہ، قوت زبان اور قوت متخیلہ۔ انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ چاروں خصوصیات جس شخص میں جتنی زیادہ اور جتنی متوازن ہوں گی، وہ اتنا ہی بہتر تخلیق کار بن سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ محض الفاظ کا استعمال یا واقعات کا بیان کہانی نہیں بناتا، بلکہ ایک سچا تخلیق کار اپنے احساسات، تجربات، مشاہدات اور تخلیقات کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ قاری خود کو کہانی کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کے مطابق ادب دراصل انسانی جذبات، معاشرتی حقیقتوں اور زندگی کے گہرے تجربات کا آئینہ ہوتا ہے۔ پروفیسر غضنفر علی نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ اچھی کہانی لکھنے کے لیے اعلیٰ درجے کے افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ

مطالعہ انسان کے ذہن کو وسعت، فکر کو گہرائی اور زبان کو پختگی عطا کرتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے مختلف تجربات، سماجی مشاہدات اور انسانوں کے مزاج کو سمجھنے کی صلاحیت ایک ادیب کی تخلیقی قوت کو جلا بخشتی ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ تخلیقی صلاحیت صرف فطری ہنر کا نام نہیں بلکہ مسلسل مشق، ریاضت، مطالعہ اور مشاہدہ ہی ایک ادیب کو پختگی عطا کرتے ہیں۔ انھوں نے نوجوان قلمکاروں کو تلقین کی کہ وہ ادب کو محض اظہار خیال کا ذریعہ نہ سمجھیں بلکہ اسے انسانی قدروں، سماجی شعور اور فکری بیداری کے فروغ کا موثر وسیلہ بنائیں۔ پروگرام کے اختتام پر طلبہ، ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ نے موضوع سے متعلق مختلف سوالات کیے، جن کے جوابات پروفیسر غضنفر علی نے نہایت سادگی، علمی انداز اور تفصیل کے ساتھ دیے۔ اس ادبی نشست میں شعبۂ اردو کے اساتذہ، ریسرچ اسکالر، طلبہ و طالبات اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'پکار اردو کی'، کرنول، 15 مئی 2026

اعزاز و اکرام

تلنگانہ میڈیا اکیڈمی میں اردو صحافیوں کے اعزاز میں تقریب

حیدرآباد: حیدرآباد کے معروف ادارے سینٹر فار ایکسیلنس ان ٹریننگ انوویشن (سی ای ٹی آئی) کے زیراہتمام تلنگانہ میڈیا اکیڈمی میں اردو صحافیوں کے اعزاز میں ایک پروقار تقریب منعقد کی گئی۔ سی ای ٹی آئی فاؤنڈیشن نے دکن کے معروف صحافی نسیم عارفی (مرحوم) کی یاد میں ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا ہے جس میں ملک بھر سے پانچ صحافیوں کو یہ ایوارڈ پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں دو تلنگانہ ریاست سے اور دو ایوارڈ قومی سطح کے صحافیوں کو اور ایک لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ شامل ہیں۔ ایوارڈ یافتگان کے ناموں کا انتخاب باضابطہ ایک جیوری کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس جیوری میں پروگرام کے مہمان خصوصی معروف ڈپلومیٹ سابق سفیر ڈاکٹر اوصاف سعید بھی شامل ہیں۔ اس مرتبہ قومی سطح کے زمرے میں روزنامہ انقلاب دہلی کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر یامین انصاری اور آزاد صحافی روہنی سنگھ کو یہ ایوارڈ دیا گیا۔ جب کہ تلنگانہ سے فوٹو جرنلسٹ محمد علیم الدین اور محمد فضل بیگ کو دیا گیا۔ اس کے علاوہ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سینئر صحافی اور کالم نگار معصوم مرادآبادی کو پیش کیا گیا۔ اس موقع پر مہمان خصوصی ڈاکٹر اوصاف سعید نے کہا کہ اردو زبان کی آواز ہمیشہ بلند رہی ہے اور اردو صحافت نے بڑی ایماندارانہ اور پیشہ ورانہ انداز میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ اوصاف سعید نے اپنے کلیدی خطبے میں مزید کہا کہ موجودہ دور میں نوجوان صحافیوں کی قدر کرنا، ان کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کو مزید آگے بڑھنا بے حد ضروری ہے۔ نسیم عارفی کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ نسیم عارفی نے اردو صحافت کو بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ سی ای ٹی آئی فاؤنڈیشن کے چیئرمین سید بشارت علی نے تمام ایوارڈ یافتگان اور مہمانان کا خیرمقدم کیا۔ میڈیا اکیڈمی آف تلنگانہ کے چیئرمین سرینواس ریڈی نے کہا کہ اردو صحافت میں عابد علی خاں اور نسیم عارفی یادگار شخصیات

ہیں، جنھوں نے اردو صحافت کو بام عروج پر پہنچایا۔ ممتاز ماہر معاشیات ڈاکٹر عامر اللہ خان نے اس تقریب کی کارروائی چلائی اور نسیم عارفی کی صحافتی خدمات کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ نسیم عارفی نے ہمیشہ عوامی مفادات کا خاص پاس و لحاظ رکھا، ان کی صحافی خدمات تادیر بھلائی نہیں جائیں گی۔ انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر یامین انصاری نے کہا کہ یہ ایوارڈ ہمارے لیے ایوارڈ نہیں، بلکہ صحافی خدمات کی حوصلہ افزائی ہے۔ پروفیسر احتشام احمد خان نے کہا کہ اردو صحافیوں کی خدمات کا اعتراف وقت کا تقاضہ ہے اور اسی ضرورت کو اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فاؤنڈیشن کے صدر سید بشارت علی نے بیڑہ اٹھایا ہے۔ سینئر صحافی و سابق رکن پریس کونسل آف انڈیا ایم اے ماجد نے اس تقریب کی کارروائی چلائی اور تمام مقامی و بیرونی مہمان مقررین کے علاوہ سامعین کا دلی شکریہ ادا کیا اور ایوارڈ پانے والے تمام صحافیوں کو دلی مبارکباد بھی پیش کی۔ اس موقع پر معروف سائنس داں پروفیسر حسنین، سید امین الحسن جعفری، عزیز احمد، عمر دراز خان، ڈاکٹر فاضل حسین پرویز، جعفر حسین، محمد صادق اور محمد سعید الدین سینئر فوٹو جرنلسٹ کو تہنیت پیش کرتے ہوئے ان معززین کی صحافتی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 مئی 2026

رَویوار یہ کہانی وارتا

نئی دہلی: ساہتیہ اکیڈمی کے ہال میں ہمالیہ وراثت ٹرسٹ کی جانب سے منعقدہ ایک عظیم الشان بین الاقوامی تقریب میں ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' کو ان کی کہانیوں پر مبنی ہفتہ وار پروگرام 'رویوار یہ کہانی وارتا' کے تین برس (150 ہفتے) مکمل ہونے پر 'کہانی سمراٹ اعزاز' سے سرفراز کیا گیا اور پروگرام میں تقاریر پر پیش کرنے والے متعدد علمی شخصیات کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ یہ آن لائن ادبی سلسلہ سنہ 2023 سے ہر اتوار کو انعقاد پذیر ہوتا ہے اور اردو-ہندی ادب میں ایک مضبوط ثقافتی مہم کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے، جس کے ذریعے ملک اور بیرونِ ملک کے ادیبوں اور ادب کے دلدادہ افراد نے ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' کے افسانوں پر گہری گفت و شنید کی ہے۔ تقریب کا آغاز معززین کے استقبال اور گلدستے پیش کرنے کے ساتھ ہوا۔ مہمان اعزازی، انڈیا ہیبیٹیٹ سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر کے جی سریش نے کہا کہ 'رویوار یہ کہانی وارتا' نے ادبی مکالمے اور فکری تبادلے کو نئی توانائی بخشی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر نشنک کی کہانیوں میں پہاڑوں کی قدرتی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کی

جدوجہد، تکالیف اور انسانی جذبات کا انتہائی پر اثر اور زندہ دلانہ نقشہ ملتا ہے۔ اس موقعے پر سابق وزیر اعلیٰ اور نامور ادیب ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' نے اپنی ادبی سفر کے تجربات اور تاثرات شیئر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تحریر زندگی کی جدوجہد اور سماجی حساسیتوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے تمام ادیبوں، شرکا اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور 'رویوار یہ کہانی وارتا' کو ہندی ادب میں مکالمہ اور احساسات کی ایک مضبوط پیش قدمی قرار دیا۔ پروفیسر ورون کمار گلاتی، سکریٹری، ساہتیہ اکیڈمی نے کہا کہ ڈاکٹر نشنک کے ادبی کام پر مبنی یہ مسلسل 150 قسطوں تک جاری رہنے والی ادبی سفر بذاتِ خود ایک شاندار اور تاریخی کارنامہ ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جب یہ سلسلہ 200 ویں قسط تک پہنچے گا تو یہ ساہتیہ اکیڈمی خود ایک خصوصی پروگرام کا اہتمام کرے گی۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے معروف شاعر، پدما شری اشوک چندرُدھر نے ڈاکٹر نشنک کی معروف کہانی 'ویداجیوت ہے' کا مطالعہ کیا اور کہا کہ یہ ایک نہایت حساس دل کو چھو لینے والی کہانی ہے جو صحافت کے بنیادی اصولوں اور انسانی ذمہ داریوں کو موثر انداز میں اجاگر کرتی ہے۔ تقریب میں ڈاکٹر انل جوشی، ڈاکر جواہر کرنوت، ڈاکٹر بے چین کنڈیال، پنڈت سریش نیرو، ڈاکٹر درشن پانڈے، پروفیسر سرینواس تیاگی اور دیگر متعدد علمی شخصیات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 مئی 2026

تقسیم ایوارڈ تقریب

اررِیہ: مجلس شعر و ادب کشن گنج کے زیر اہتمام مدرسہ انجمن اسلامیہ کے میٹنگ ہال میں ایک پروقار تقسیم ایوارڈ

تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ واضح رہے کہ سال گذشتہ سے مجلس شعر و ادب کشن گنج نے سیمانچل کے قلمکاروں کی علمی، ادبی، شعری، تنقیدی، تحقیقی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں سیمانچل ہی سے تعلق رکھنے والے مشاہیر علم و ادب سے منسوب ایوارڈ تقسیم کی روایت شروع کی گئی ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے سال رواں مجلس شعر و ادب کے ذریعے سیمانچل کے عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار، معروف شاعر، ادیب، اردو اکادمی بہار کے سابق صدر جناب مشتاق احمد نوری پروفیسر طارق جمیلی ایوارڈ برائے تخلیقی ادب 2026 سے نوازے گئے، معروف شاعر، افسانہ نگار اور مصور و خطاط ممتاز نیر مولوی سلیمان لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ 2026 سے نوازے گئے۔ اس باوقار تقریب کی صدارت معروف افسانہ نگار احسان قاسمی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ممتاز شاعر جہانگیر نایاب نے انجام دیے۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ہندی افسانہ نگار پروفیسر پرمود بھارتیہ پرنسپل جی ایل ایم کالج پورنیہ اور معروف افسانہ نگار، صحافی اور مدیر سہ ماہی 'ابجد' اررِیا پروفیسر ربیع حیدر انجم نے شرکت کی۔ اس موقعے پر آفتاب اظہر صدیقی جنرل سکریٹری مجلس شعر و ادب نے مجلس شعر و ادب کے اغراض و مقاصد اور آئندہ کے عزائم پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ معروف افسانہ نگار ربیع حیدر انجم نے مشتاق احمد نوری کی شخصیت اور فن پر مبنی اپنا معروف خاکہ پیش کیا۔ ممتاز نیر کی شاعری، افسانہ نگاری پر احسان قاسمی نے جامع گفتگو کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر پرمود بھارتیہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مجلس شعر و ادب کشن گنج کے اس اقدام کی کافی ستائش کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اس طرح کی قدرشناسی اور عزت افزائی سے قلمکاروں میں مزید توانائی اور خوداعتمادی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ پرورش لوح و قلم کے سلسلے کو جاری رکھنے میں مدد ملتی ہے، بعدازاں تقسیم ایوارڈ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایوارڈ یافتگان جناب مشتاق احمد نوری اور جناب ممتاز نیر کی خدمت میں مومنٹو، شال، سرٹیفکیٹ اور منظوم سپاس نامے پیش کیے گئے۔ اس موقعے پر صاحب اعزاز مشتاق احمد نوری نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مجلس شعر و ادب کشن گنج کے جملہ ذمہ داران، اراکین اور منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یوں تو مجھے اپنی ادبی زندگی میں ملک و بیرون میں متعدد باوقار ایوارڈ حاصل ہوئے ہیں، لیکن سچ پوچھیے تو جو اپنائیت اور وطن کی مٹی کی خوشبو اس ایوارڈ سے مجھے محسوس ہو رہی ہے اس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس موقعے پر ممتاز نیر نے کہا کہ مجلس شعر و ادب کشن گنج نے جس طرح مجھے ایوارڈ دے کر میری قدرشناسی کی ہے یہ میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے۔ سیمانچل کے متعدد قلمکاروں، شاعروں اور ادیبوں کی نصف درجن کے قریب تازہ مطبوعہ کتابوں کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی اور معروف ادیب و صحافی ڈاکٹر طیب فرقانی کی کتاب 'خیال آرائیاں' ممتاز نیر کے دو شعری مجموعے 'وفا کے پھول'، 'عقیدت کے پھول'، بزرگ شاعر حازم حسان کی کتاب 'زخموں کے پھول' اور 'گلہائے رنگارنگ' کی رسم رونمائی معزز مہمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کے علاوہ معروف رسالہ 'آجکل' دہلی شمارہ ماہ مئی 2026 جو سیمانچل کے گوشے پر مشتمل ہے، کی بھی رونمائی معزز مہمانوں کے ہاتھوں کی گئی۔ تقریب کے دوسرے دور میں ایک شاندار شعری نشست منعقد ہوئی، جس میں کشن گنج، اررِیہ، پورنیہ اور اتر دیناج پور کے متعدد شعرا نے اپنے منتخب اور عمدہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ تقریب کے اختتام پر مجلس شعر و ادب کے صدر ڈاکٹر قسیم اختر صدر شعبۂ اردو مارواڑی کالج کشن گنج نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' مظفرپور، 9 جون 2026

ڈاکٹر عمیر حسامی

لکھنؤ: معروف محقق اور ادیب ڈاکٹر عمیر حسامی کو ان کی تازہ تصنیف 'نئے مقدمے' پر 'جنرل سکریٹری طارق خان اعزازی ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ یہ اعزاز انھیں سدھار سیوا ایوم کلیان سمیتی، لکھنؤ کی جانب سے منعقدہ ایک باوقار ادبی تقریب میں سینئر سماجی رہنما جناب سید امیر حیدر کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر شہر کے علمی، ادبی اور سماجی حلقوں سے تعلق رکھنے والی متعدد شخصیات موجود تھیں، جنھوں نے ڈاکٹر عمیر حسامی کو اس اہم اعزاز پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ڈاکٹر عمیر حسامی کا تعلق قصبہ گڑھی مانک پور کے معروف علمی خانوادہ حسامیہ سے ہے۔ انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ممتاز ترقی پسند نقاد ممتاز حسین کی حیات و خدمات پر تحقیقی مقالہ 'ممتاز حسین بحیثیت نقاد' تحریر کرکے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ان کی تازہ تصنیف 'نئے مقدمے' کو ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے

جناب سید امیر حیدر نے کہا کہ نئے ادیبوں، شاعروں اور محققین کی حوصلہ افزائی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسی ادبی سرگرمیاں معاشرے میں علم و ادب کے فروغ اور نئی نسل میں مطالعہ و تحقیق کے رجحان کو مستحکم بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تقریب کے دوران سمیتی کے جنرل سکریٹری طارق خان اور دیگر اراکین نے ڈاکٹر عمیر حسامی کی تحقیقی خدمات اور اردو ادب کے فروغ میں ان کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے انھیں شیلڈ اور اعزازی ایوارڈ پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 2 جون 2026

رسم اجرا

اردو کتھا کل

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اردو کے منتخب بیس افسانوں کے ملیالم ترجمے 'اردو کتھا کل'

کا اجرا کیا گیا، جس میں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر ٹی این ستیسن کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، پروفیسر عبدالمنان صدیقی، پروفیسر وبھا شرما، پروفیسر سید سراج الدین اجملی، پروفیسر ٹی این ستیسن، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، پروفیسر محمد علی جوہر، پروفیسر طارق چھتاری کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر سید سراج الدین اجملی نے مترجم پروفیسر ٹی این ستیسن کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ستیسن ایک زمینی انسان ہیں جو اپنے ماتحتوں کا بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے مصنف اور کتاب کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، سریندر پرکاش، خواجہ احمد عباس، رام لعل، بلراج کومل، جیلانی بانو، سلام بن رزاق، ذکیہ مشہدی، سید محمد اشرف، طارق چھتاری اور خالد جاوید وغیرہ کی کہانیاں شامل ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ پروفیسر ٹی این ستیسن کا اپنا ایک علمی وقار ہے۔ انھوں نے اردو کے اہم اور منتخب افسانوں کا ملیالم میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمے زبانوں اور تہذیبوں کو جوڑتے ہیں۔ ادب ماضی میں جھانکنے کی ایک کھڑکی ہے جب کہ ترجمہ دوسری تہذیبوں اور زبانوں کو جاننے کا ایک وسیلہ ہے۔ پروفیسر محمد علی جوہر نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف باب العلم ہی نہیں ہے وہ انسان بھی بناتی ہے، انھوں نے کہا کہ وہ طلبا کے ساتھ ہی اساتذہ کی بھی تربیت کرتی ہے۔ پروفیسر ستیسن نے اردو افسانوں کا ترجمے کر کے اس سے اپنی بے حد محبت کا اظہار کیا ہے جو لائق ستائش ہے۔ پروفیسر طارق چھتاری نے اردو کتھا کل کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ستیسن نے ایک ایسی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس میں عام طور پر اہل اردو ترجمہ نہیں کر پاتے جس کے لیے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ترجمہ کسی قوم کی داخلی کیفیات تک سے قاری کو واقف کراتا ہے، چونکہ پروفیسر ستیسن نے صرف ترجمہ زبان دانی سے نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے اردو تہذیب کو جیا ہے اور اس میں رچے بسے ہیں اس لیے ان کا یہ ترجمہ مزید اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ پروفیسر وبھا شرما نے کتاب کے اجرا پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ اردو بھی مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اس کتاب کے ترجمے کا اجرا کیا۔ انھوں نے اردو زبان اور اس کی تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس سے انسان میں شائستگی آتی ہے، اظہار کا خوبصورت طریقہ دیتی ہے جس کی تہذیب سے اب ملیالم بولنے والے بھی واقف ہوں گے۔ پروفیسر وبھا شرما نے پروفیسر ٹی این ستیسن کی ہشت پہلو شخصیت کے سلسلے میں کہا کہ ان کا ذہنی کینوس بہت وسیع ہے، وہ علمی طور پر بہت توانا ہیں اور انسانی سطح پر ہم نے ایک ایسے انسان کے طور پر دیکھا ہے جس کی پیروی کی جانی چاہیے۔ صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ اس ترجمے نے دو تہذیبوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے۔ اردو زبان کے افسانوں کے ملیالم میں ترجمہ کے لیے ہم اہل اردو ان کے مشکور ہیں کیونکہ انھوں نے اردو کے سفیر کا کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر عبدالمنان صدیقی نے کہا کہ ان کی وجہ سے ہم نے ملیالم کے چند جملے بھی سیکھے، ان جملوں نے ہم دونوں کو بہت قریب کر دیا۔ پروفیسر ٹی این ستیسن نے پوری کتاب کا ترجمہ کیا ہے، جو اردو اور ملیالم کو قریب کرے گی جس سے دونوں تہذیبیں قریب آئیں گی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 14 مئی 2026

آم نامہ

لکھنؤ: میں سہیل کاکوروی کی کتاب 'آم نامہ' کی مکمل تخلیق کا چشم دید گواہ ہوں۔ جب اس کا نام لمکا بک آف ریکارڈ میں درج ہوا تو ہم نے اس کامیابی کا جشن منایا، لیکن اس کامیابی کے بعد بھی ان کا قلم نہیں رکا۔ پھلوں کے بادشاہ آم پر وہ ہر سال ایک نئی نظم کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ یہ باعث فخر ہے کہ ہندی، اردو اور انگریزی میں ان کی سولہ قیمتی تصانیف شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آج ادبی ادارہ آم پر مبنی مختصر کتاب مے خانے میں آم کی رونمائی کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شاعر اور ادیب ترون پرکاش نے تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ سنجے مشرا شوق نے اس تصنیف کو بے مثال قرار دیا۔ اشرف علیگ نے کہا کہ جدید افکار کے ساتھ سہیل کاکوروی مسلسل تخلیقی ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ناظم بریلوی نے کہا کہ ہندی، اردو اور انگریزی ادب کی دنیا میں سہیل کاکوروی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ شیخ اسد عامر نے کہا کہ چند روز کی خاموشی کے بعد شاعری کا سونامی لانے والے سہیل کاکوروی کی ہر کوشش کامیاب ہے۔ توصیف صدیقی نے کہا کہ ہندی، اردو اور انگریزی زبانوں پر ان کی دسترس حیرت انگیز ہے۔ زینب عالم نے کہا کہ سہیل کاکوروی ایک زندہ اور نورانی شخصیت ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ندا فاطمہ نے کہا کہ اپنے ملک اور اپنے شہر لکھنؤ سے ان کی بے پناہ محبت ان کی تحریروں میں نمایاں نظر

آتی ہے۔ سچن نے آم پران کی رونمائی شدہ نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس طویل نظم میں مزاح اور سنجیدگی کا خوبصورت توازن موجود ہے۔ نظامت کے فرائض محمد عامر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' 23 مئی 2026

سید کام کرتا ہے

نئی دہلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس اور حالی پبلشنگ ہاؤس کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبدالحی کی مرتب

کردہ کتاب 'سید کام کرتا ہے' کی رسم اجرا کی تقریب کانسٹی ٹیوشن کلب آف انڈیا میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر عبدالحق نے کی جب کہ نظامت کے فرائض فیضان الحق نے انجام دیے۔ تقریب کے آغاز میں ڈاکٹر عبدالحی نے کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کی ترتیب و تدوین کا موقع انھیں اتفاقاً ملا، تاہم انھیں خوشی ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت پر کتاب مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے جس نے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی ہے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر اختر الواسع نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر سید احمد خاں کی شخصیت اور خدمات پر مبنی یہ کتاب اگرچہ تاخیر سے منظرعام پر آئی ہے، لیکن اس کی اشاعت ایک اہم علمی اور ادبی پیش رفت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر سید احمد خاں نے طب یونانی اور اردو زبان و ادب کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں، جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ کتاب کا عنوان 'سید کام کرتا ہے' دراصل اکبر الہ آبادی کے اس معروف قطعے سے ماخوذ ہے جو انھوں نے سرسید احمد خاں کی خدمات کے اعتراف میں کہا تھا۔ ان کے مطابق یہ عنوان ڈاکٹر سید احمد خاں کی متحرک، فعال اور ہمہ جہت شخصیت کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر سید احمد خاں بنیادی طور پر ایک عملی انسان ہیں اور ان کی پوری زندگی خدمت، و جدوجہد اور مسلسل عمل سے عبارت ہے۔ شیخ علیم الدین اسعدی نے کہا کہ ڈاکٹر سید احمد خاں نے طب یونانی کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے، جو یقیناً لائق تحسین ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے محض حکومت کو ذمہ دار ٹھہرانا درست نہیں بلکہ اردو داں طبقے کو بھی اپنی ذمے داریاں نبھانی چاہئیں۔ NEP-2020 میں تمام ہندوستانی زبانوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اردو زبان کے ساتھ کسی طرح کے امتیازی رویے کا اظہار نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے طور پر بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید فاروق، قمرالدین، پروفیسر سلیم قدوائی، اشرف میواتی، معین شاداب اور خورشید حیات سمیت متعدد علمی و ادبی شخصیات نے بھی خطاب کیا۔ مقررین نے کتاب کی اہمیت، ڈاکٹر سید احمد خاں کی خدمات اور ڈاکٹر عبدالحی کی علمی کاوشوں کو سراہتے ہوئے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس موقعے پر زبان و ادب کی معزز شخصیات سمیت بڑی تعداد میں اہل علم، دانشوروں اور ادب دوست نے افراد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جون 2026

'شمع حیات' سمیت پانچ میگزین کا اجرا

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج ایوننگ 64 ویں سالانہ تقریب کا انعقاد کالج کے آڈیٹوریم میں تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا جس میں یونین منسٹر آف اسٹیٹ ہرش ملہوترا جی، ڈی این آف کالجز، بلرام پانی جی، سابق آئی اے ایس ڈاکٹر اجیت کمار جی، ایڈوکیٹ جے پی شرما جی، پروفیسر نریندر سنگھ اور اماشنکر دھیانی جی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر مختلف کورسوں میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا اور کالج کی سوسائٹیوں کے عہدے داران کو انعامات و اعزازات سے نوازا گیا، ساتھ ہی کالج کی پانچ میگزینوں شمع حیات، کرشٹی، بزٹوڈے، ویسپر اور ہندی میگزین رجنی گندھا کے اجرا کی رسم بھی ادا کی گئی۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر بھرت سنگھ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کالج کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی شری ہرش ملہوترا جی نے اپنی طالب علمی کے دوران ذاکر حسین دہلی کالج سے وابستہ یادوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ کو تعلیم کے ساتھ اخلاقیات پر بھی توجہ دینی چاہیے، سب کی عزت کرنی چاہیے اور کسی کے ساتھ بھید بھاؤ نہیں کرنا چاہیے۔ مہمان اعزازی ایڈوکیٹ ڈاکٹر اجیت کمار نے کالج کی سالانہ تقریب کو کالج کے لیے ایک بہت بڑا موقع بتایا اور طلبہ کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک اچھا انسان وہ ہوتا ہے جس پر سب فخر کریں اس لیے ایسا انسان بننا چاہیے کہ آپ پر آپ کے گھر والے، آپ کے ملنے والے اور آپ کے ملک والے آپ پر فخر کریں۔ اس موقعے پر اماشنکر دھیانی نے صحت کے حوالے سے اہم گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم کے ساتھ اپنی صحت پر بھی دھیان دیں اور اپنے آپ کو فٹ رکھیں اس کے لیے وہ کوئی بھی کھیل کھیل سکتے ہیں۔ اس موقعے پر جے پی شرما چیئرمین گورننگ باڈی نے طلبہ کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کی اور ان کے لیے حوصلہ افزا کلمات کہے۔ تقریب میں

بڑی تعداد میں کالج کے اساتذہ، ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ اسٹاف نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض پرانجک، سبراپنت کوٹھاری جی نے انجام دیے۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 14 مئی 2026

Whispers of the Souls

نئی دھلی: سولیٹیر لٹریچر فاؤنڈیشن اور جشن تہذیب فاؤنڈیشن کے اشتراک سے طنز ومزاح کے عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی کی صاحب زادی محترمہ ادینہ شاہ کی تصنیف Whispers of the Souls کی رسم اجرا کی تقریب تسمیہ آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی، اس موقعے پر ایک ادبی نشست کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں اہل قلم اور ادب سے وابستہ ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی، جب کہ مہمانان خصوصی میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر خواجہ شاہد، پروفیسر خورشید انصاری، ڈاکٹر سجاد سید اور ڈاکٹر عظمیٰ قمر شامل تھیں۔ مقررین نے مصنفہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بالخصوص نفسیات کے موضوع پر ان کی کاوش کو سراہا اور اپنے بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا۔ بعد ازاں شعری نشست منعقد ہوئی، جس میں ڈاکٹر پاپولر میرٹھی، خالد محمود، شاہد انور، منیر ہمدم، قمر انجم، ڈاکٹر فرقان، تنیش کمار، راشد رحمان، راشدہ باقی حیا، ماریہ عثمانی اور پروین شغف نے اپنے کلام پیش کیے، اس شعری نشست کی نظامت عرفان اعظمی نے کی۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 2 اپریل 2026

اے ایم یو میں فیکلٹی آف آرٹس کے اردو، انگریزی اور ہندی رسائل کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے اردو، انگریزی اور ہندی رسائل کے 2024-25

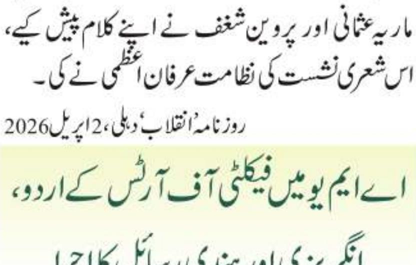

کے شماروں کا باقاعدہ اجرا آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں ادارتی ومشاورتی بورڈ کے اراکین اور اساتذہ کی موجودگی میں کیا گیا۔ یہ رسائل یونیورسٹی کی علمی، ادبی، ثقافتی اور فکری روایات کی عکاسی کرتے ہیں۔ فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور تینوں جرائد کے مدیر اعلیٰ پروفیسر ٹی این ستھیسن نے تقریب میں شرکت کی۔ ہندی جریدے 'کلاسنکائے شودھ پتریکا' کے مدیر پروفیسر دیویندر کمار گپتا اور جوائنٹ ایڈیٹر پروفیسر جیا پریہ درشنی شکلا ہیں۔ معاون مدیران میں ڈاکٹر نازش بیگم، ڈاکٹر پلو وشنو، ڈاکٹر آمنہ خاتون اور ڈاکٹر ہیم بالا شامل ہیں۔ انگریزی جریدے 'فیکلٹی آف آرٹس جرنل' کے مدیر پروفیسر محمد رضوان خاں ہیں۔ ادارتی ٹیم میں پروفیسر سمیع اختر، پروفیسر وبھا شرما، پروفیسر روبینہ اقبال، پروفیسر عقیل احمد، ڈاکٹر صباح الدین احمد، ڈاکٹر اکبر جے اے سید اور ڈاکٹر تامل سیلون شامل ہیں۔ اردو جریدے 'دانش' کے مدیر پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ہیں، جب کہ مشاورتی بورڈ میں پروفیسر سید سراج اجملی، ڈاکٹر عبدالعزیز خاں، ڈاکٹر پٹھان قاسم اور ڈاکٹر قمر عالم شامل ہیں۔ پروفیسر ٹی این ستھیسن نے تینوں جرائد کی بروقت اشاعت پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ادارتی ٹیموں اور مشاورتی بورڈز کے اراکین کو ان کی کامیاب کاوشوں پر مبارکباد پیش کی۔ رسم اجرا تقریب میں فیکلٹی آف آرٹس اور دیگر فیکلٹیز کے متعدد سینئر اساتذہ اور شعبہ جات کے سربراہان موجود تھے۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 27 مئی 2026

بلیک ربن

میرٹھ: صوفیہ شیریں نے جس طرح سے کہانیوں میں عصر حاضر کو پیش کیا ہے وہ بڑی اہم ہے۔ بڑے افسانہ نگار انیس رفیع نے بھی آپ کی تعریف کی ہے۔ صوفیہ شیریں نے نئی صدی کی کربلا کو بڑی خوبی اور سادگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ صوفیہ شیریں کے یہاں موجودہ منظر نامہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں کہانی میں احتجاج بھی ہے، اور عہد حاضر کے مسائل بھی۔ یہ الفاظ تھے معروف ادیب وناقد پروفیسر صغیر افراہیم کے جو شعبۂ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد آن لائن پروگرام صوفیہ شیریں کے افسانوی مجموعے 'بلیک ربن' کے اجرا و مذاکرہ کے موقعے پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کررہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد وافسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کے بطور امیر مہدی (انگلینڈ) اور ڈاکٹر ریاض توحیدی (کشمیر) نے شرکت فرمائی اور مہمانان اعزازی کے بطور معروف فکشن نگار عظیم اللہ ہاشمی اور معروف ادیب وناقد ارشاد شفق نے آن لائن شرکت کی۔ مقرر نے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر امتیاز علیمی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر مہمانوں کے ذریعے صوفیہ شیریں کے افسانوی مجموعے 'بلیک ربن' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ہمارے پروگرام کا مقصد نوجوان نسل کو آگے بڑھانا ہے۔ ان کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرانا ہے اور یہی ایوسا کا اصل مقصد ہے۔ صوفیہ شیریں امتیاز علیمی وغیرہ نے ادبی فضا کو باندھے رکھا۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے صوفیہ شیریں کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ نئی صدی کے فکشن نگاروں میں ڈاکٹر صوفیہ شیریں کا شمار ہوتا ہے۔ آپ ایک اچھی افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کی خدمات بھی انجام دے رہی ہیں۔ آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں داخلی جذبات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ عظیم اللہ ہاشمی نے کہا کہ صوفیہ شیریں کے اس مجموعے میں حقیقت نگاری کی عکاسی ملتی ہے۔ احتجاج اور حقیقت کو صوفیہ شیریں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مہمان خصوصی امیر مہدی نے کہا کہ افسانہ کیسے شروع کیا جائے اور کہاں پر ختم کیا جائے یہ بات صوفیہ شیریں کو خوب آتی ہے۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 26 مئی 2026

'پروفیسر اختر الواسع کی علمی وادبی خدمات' اور 'حرفِ حق'

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام اردو گھر، دین دیال اپادھیائے مارگ، نئی دہلی میں ایک

تقریب منعقد ہوئی، جس میں معروف اسلامی اسکالر، ماہر تعلیم اور دانشور پروفیسر اختر الواسع کی علمی و ادبی خدمات پر ڈاکٹر عامر فہیم کی تصنیف 'پروفیسر اختر الواسع کی علمی وادبی خدمات' اور کالموں کے مجموعے 'حرفِ حق' کا اجرا عمل میں آیا جب کہ 'حرفِ حق' کو ابو ہریرہ (وسیع رفیع) نے مرتب کیا ہے۔ تقریب کی صدارت انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کی، جب کہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے صدر فیروز احمد ایڈووکیٹ مہمان خصوصی تھے۔ سراج قریشی، پروفیسر خالد محمود اور عارج بن حیرت نے مہمانِ اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ اس موقعے پر احمد جاوید، معصوم مراد آبادی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر عامر فہیم اور ابو ہریرہ (وسیم رفیع) نے اظہار خیال کیا۔ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ پروفیسر اختر الواسع نے حق گوئی و بیباکی سے کبھی بھی انحراف نہیں کیا۔ انھوں نے زبانی جمع خرچی پر زمینی کام کو ہمیشہ ترجیح دی، یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ ان کی اس روش کا مداح اور قائل ہے۔ مہمان خصوصی فیروز احمد ایڈووکیٹ نے کہا کہ پروفیسر اختر الواسع کی شخصیت علم اور سماجی شعور کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ علمی شخصیت پر سنجیدہ کام معاشرے کی فکری تعمیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ پروفیسر اختر الواسع نے اردو، تعلیم اور اسلامی فکر کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ ہماری علمی روایت کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایسی کتابیں نئی نسل کو علمی سنجیدگی اور فکری دیانت کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ عارج بن حیرت نے اپنے خطاب میں کہا کہ پروفیسر اختر الواسع نے ہمیشہ کمزوروں اور اپنے سے چھوٹوں کو آگے بڑھایا۔ ان کا پیغام محبت خاص و عام کے لیے یکساں ہے۔ سراج قریشی نے کہا کہ 'حرفِ حق' محض کالموں کا مجموعہ نہیں بلکہ عصری مسائل پر ایک باشعور اور دردمند ذہن کی گواہی ہے۔ احمد جاوید نے کہا کہ پروفیسر اختر الواسع کی فکر میں روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک متوازن رشتہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے مطابق موجودہ عہد میں مکالمے اور اعتدال کی جو ضرورت ہے، اختر الواسع صاحب کی تحریریں اس کی عمدہ مثال پیش کرتی ہیں۔ معصوم مراد آبادی نے کہا اردو دنیا کو ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے جو شخصیات کے علمی اور فکری پہلوؤں کو دستاویزی انداز میں محفوظ کریں۔ انھوں نے 'حرفِ حق' کو معاصر سماجی و فکری مباحث کا اہم مجموعہ قرار دیا۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ پروفیسر اختر الواسع کی شخصیت علم، رواداری اور تہذیبی شعور کی نمائندہ شخصیت ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 مئی 2026

'رموزِ تحقیق وتنقید' اور 'جدید تنقیدی نظریات'

نئی دہلی: اردو کے معروف محقق وناقد پروفیسر شیخ عقیل احمد کی دو کتابوں 'رموزِ تحقیق وتنقید' اور 'جدید تنقیدی نظریات' کا اجرا غالب اکیڈمی نئی دہلی میں کیا گیا۔ تقریب کا اہتمام عبارت پبلی کیشن نے غالب اکیڈمی کے اشتراک سے کیا تھا۔

اس موقعے پر صدر مجلس پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ 'رموزِ تحقیق وتنقید' اور 'جدید تنقیدی نظریات' اردو جامعات کے نصابی اور تحقیقی ماحول میں ایک اہم خلا کو پُر کرنے والی کتابیں ہیں۔ ان کے مطابق ان کتابوں میں علمی گہرائی، تدریسی افادیت اور عصری شعور کا حسین امتزاج موجود ہے جو انھیں طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید بناتا ہے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ پروفیسر شیخ عقیل احمد کی علمی وسعت، تنقیدی بصیرت اور تدریسی تجربہ ان دونوں کتابوں میں پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ خصوصاً 'جدید تنقیدی نظریات' میں جدید فکری مباحث کو جس سادگی اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، وہ مصنف کی غیر معمولی علمی صلاحیت کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ یہ دونوں کتابیں مصنف کے تنقیدی شعور، تحقیقی بصیرت اور علمی دیانت کی بہترین مثال ہیں۔ ان کے مطابق اردو تحقیق اور تنقید کے میدان میں ان کتابوں کی حیثیت ایک معتبر علمی دستاویز کی ہے جو طویل عرصے تک اہلِ علم کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ پروفیسر فاروق بخشی نے کہا کہ 'رموزِ تحقیق وتنقید' اور 'جدید تنقیدی نظریات' موجودہ تعلیمی اور تحقیقی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مصنف نے پیچیدہ علمی مباحث کو نہایت منظم اور سہل انداز میں پیش کر کے طلبہ اور محققین کے لیے تحقیق وتنقید کی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔ پروفیسر احمد امتیاز نے کہا کہ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے جدید تنقیدی نظریات اور تحقیقی مباحث کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری نہ صرف موضوع کو بہتر طور پر سمجھتا ہے بلکہ اس کے اندر تنقیدی شعور بھی بیدار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ڈاکٹر واحد نظیر نے کہا کہ 'جدید تنقیدی نظریات' اپنی جامعیت، شگفتہ اسلوب، علمی گہرائی اور تدریسی افادیت کے باعث اردو تنقید کے میدان میں ایک اہم اور وقیع اضافہ ہے، جبکہ 'رموزِ تحقیق وتنقید' تحقیق، تدوین اور تنقید کے جدید مباحث کو سمجھنے کے لیے ایک سنجیدہ اور معتبر علمی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقانی القاسمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'جدید تنقیدی نظریات' اردو تنقید میں ایک اہم اضافہ ہے جس میں جدید فکری اور تنقیدی مباحث کو سادہ، شستہ اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب جدید نظریاتی مباحث کو اردو قارئین کے لیے قابلِ رسائی بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ ڈاکٹر ندیم احمد نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مخطوطات کی بازیافت، متن کی تصحیح، تدوینی اصول اور جدید برقی تدوین جیسے مباحث پر شیخ عقیل احمد نے بڑی سنجیدگی اور سادگی کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے تمام مقررین، سامعین اور عبارت پبلی کیشن کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اردو کے اساتذہ، محققین اور ادبی احباب کی محبت، اعتماد اور حوصلہ افزائی ہمیشہ ان کے لیے فکری توانائی اور رہنمائی کا سرچشمہ رہی ہے۔ تقریب کی نظامت آسیہ خان اور ڈاکٹر ندیم احمد نے مشترکہ طور پر انجام دی، جبکہ آخر میں سلام الدین خان نے تمام شرکاء، مہمانانِ گرامی اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 مئی 2026

حرفِ تازہ

مظفر پور: انجمن ندائے ادب، مظفر پور کے زیرِ اہتمام گذشتہ شام معروف شاعر اسد رضوی کی رہائش گاہ (رضوی نکیتن، محمد پور مبارک) پر تقریب رسم اجرا اور شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر فاروق احمد صدیقی، سابق صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی مظفر پور نے فرمائی۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے بہار انٹرمیڈیٹ کونسل کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر سید ابوذر کمال الدین اور معروف شاعر احمد بدر (جمشید پور) کی شرکت نے محفل کو یادگار بنا دیا۔ نظامت کا فریضہ کامران غنی صبا، صدر شعبۂ اردو نتیشور کالج نے انجام دیا۔ واضح رہے کہ ماہنامہ 'حرفِ تازہ' پٹنہ کی اشاعت نائب ناظم امارت شرعیہ، پٹنہ اور ہفتہ وار 'نقیب' کے ایڈیٹر مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کی سرپرستی اور غالب شمس قاسمی کی ادارت میں ہورہی ہے۔ میزبان شاعر اسد رضوی نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ اس موقعے سے ایک معیاری شعری نشست بھی ہوئی جس میں پروفیسر فاروق احمد صدیقی، پروفیسر سید ابوذر کمال الدین، احمد بدر، اسد رضوی، وارث اسلام پوری، صبغت اللہ حمیدی، علی احمد منظر، فرخ شہاب، جلال اصغر فریدی، طاہر الدین طاہر، کامران غنی صبا، ڈاکٹر حسن رضا، تعظیم احمد گوہر، ایمل ہاشمی مائل، رضی احمد صدیقی اور حباب الحق نے اپنے کلام پیش کیے۔ انجمن ندائے ادب کے بانی اسلم رحمانی کے غائبانے میں ان کی طرف سے مولانا نظر الہدیٰ قاسمی نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 25 مئی 2026

واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر کوکب قدر سجاد علی مرزا کی اہم اور تاریخی تصنیف 'واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات' کے انگریزی ترجمے کی رسم اجرا کے سلسلے میں ایک تقریب کا انعقاد رشید احمد صدیقی آڈیٹوریم میں عمل میں آیا۔ اس علمی و ادبی تقریب میں یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ، محققین، ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت شعبۂ فارسی کی سابق صدر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات کے انگریزی ترجمے کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی، کیونکہ انگریزوں نے ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت نواب واجد علی شاہ کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اودھ کے آخری نواب کو محض عیش وعشرت پسند حکمراں کے طور پر پیش کیا گیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک غیر معمولی ادیب، باکمال شاعر، موسیقی کے دلدادہ، فنون لطیفہ کے سرپرست اور تہذیبی شعور رکھنے والی عظیم شخصیت تھے، ڈاکٹر کوکب قدر سجاد علی مرزا کی اس اہم کتاب کا انگریزی ترجمہ ان کی صاحب زادی پروفیسر طلعت فاطمہ نے کیا ہے۔ اس نے اپنے خطاب میں اس کتاب کے تحقیقی پس منظر اور اپنے والد کی علمی جدوجہد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ واجد علی شاہ ایک غیر معمولی ادبی شخصیت تھے، جنھوں نے صرف 26 برس کی عمر میں ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی 'عشق نامہ' تحریر کی، جب کہ 67 برس کی عمر میں 48150 اشعار پر مشتمل مثنوی 'صبا تل قلوب' جیسا عظیم ادبی شاہکار تخلیق کیا۔ سینئر صحافی شکیل حسن شمسی نے اپنے خطاب میں کہا کہ انگریزوں نے واجد علی شاہ کی شخصیت کو بدنام کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کیا۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی نے بارہ اخبارات کو صرف اس مقصد کے لیے استعمال کیا تھا کہ واجد علی شاہ کے خلاف منفی فضا قائم کی جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ حقیقت میں واجد علی شاہ ادب، موسیقی، تہذیب اور فنون لطیفہ کے بے مثال سرپرست تھے۔ تقریب میں دیگر مقررین نے بھی واجد علی شاہ کی ادبی، ثقافتی اور تاریخی خدمات پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر سابق رکن اسمبلی ظفر عالم، نزہت فاطمہ، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر سراج اجملی، صدر شعبہ اردو قمر الہدیٰ فریدی اور دیگر اہل علم نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ پروگرام کے اختتام پر مترجم پروفیسر طلعت فاطمہ اور مصنف ڈاکٹر کوکب قدر سجاد علی مرزا کو مبارکباد پیش کی گئی اور اس ترجمے کو علمی و ادبی دنیا کے لیے ایک اہم اور قابل قدر پیش رفت قرار دیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' 17 مئی 2026

عالمگیر ادب کے زیرِ اہتمام تین کتابوں کا اجرا

اورنگ آباد: اورنگ آباد کی معروف ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تنظیم عالمگیر ادب کی جانب سے ایک عظیم الشان ادبی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں تین اہم

کتابوں کا اجرا اور مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ یافتگان میں اسناد کی تقسیم عمل میں آئی۔ تقریب کی صدارت مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین سید حسین اختر نے انجام دی، جب کہ اس موقعے پر 'عکس ادب'، 'اسلم مرزا شخص اور شخصیت' اور اسلم مرزا کی کتابوں پر لکھے گئے تبصروں اور طرحی مصرعوں پر کہی گئی غزلوں پر مشتمل کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ اپنے صدارتی خطاب میں چیئرمین سید حسین اختر نے کہا کہ اردو زبان وادب کی خدمت دراصل اپنی ماں کی زبان کی خدمت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اورنگ آباد ہمیشہ سے اردو ادب کے لیے ایک زرخیز خطہ رہا ہے، جہاں اہلِ قلم نے ہر دور میں زبان وادب کی آبیاری کی ہے۔ نئی نسل بھی بزرگ ادیبوں اور شاعروں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مختلف اصنافِ ادب میں قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے، جو اردو کے روشن مستقبل کی علامت ہے۔ معروف ادیب نورالحسنین نے اپنے خطاب میں کہا کہ ادبی سرگرمیاں ادیب کی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہیں اور معاشرے میں فکری بیداری پیدا کرتی ہیں۔ ادیب و محقق اسلم مرزا نے کہا کہ یہ نہایت خوش آئند بات ہے کہ نئی نسل تحقیق کے میدان میں دلچسپی لے رہی ہے اور مختلف ادیبوں اور شاعروں پر تحقیقی مقالات تحریر کیے جارہے ہیں، جس سے اردو کا دامن مزید وسیع ہورہا ہے۔ تقریب کے دوران ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتگان میں اسناد تقسیم کی گئیں، جس پر ایوارڈ یافتگان نے خوشی اور تشکر کا اظہار کیا۔ مشہور شاعر احمد اورنگ آبادی نے نظامت کے فرائض انجام دیے، جب کہ یوسف دیوان کے اظہار تشکر پر نشست کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر'، دہلی 19 مئی 2026

کیفی اعظمی کی یاد میں پوسٹل کور کا اجرا

ممبئی: عالمی شہرت یافتہ شاعر، ادیب اور نغمہ نگار کیفی اعظمی کی 24 ویں برسی پر مہالکشمی کے جی فائیوائے فاؤنڈیشن میں محکمۂ ڈاک کی جانب سے ان کی یاد میں مہاراشٹر

اور گوا کے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل اینابھ سنگھ کے ہاتھوں پوسٹل کور (لفافہ) کا اجرا کیا گیا، ساتھ ہی کیفی صاحب کی شاعری پر مبنی فلم 'راگ شاعری' دکھائی گئی۔ اس فلم میں کیفی صاحب کی 13 تاریخی نظمیں پیش کی گئی ہیں جنھیں معروف موسیقار شنکر مہادیون نے اپنی دلکش آواز میں گایا ہے۔ اس موقعے پر کیفی اعظمی کی شاعری سے متعلق ان کے داماد اور معروف نغمہ نگار و مصنف جاوید اختر نے کہا کہ کیفی صاحب رومانی اور انقلابی شاعر تھے۔ انھوں نے دونوں طرح کی شاعری کی اور دونوں پر ان کی برابر کی دسترس رہی۔ وہ عوامی شخصیت تھے۔ ان کے گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ کوئی بھی کسی بھی وقت ملاقات کے لیے آسکتا تھا، چاہے وہ گھر میں ہوں یا نہ ہوں۔ جاوید اختر نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ ایک فلم اداکارہ ان کے گھر آئیں، گھر میں کوئی نہیں تھا مگر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ گھر سے ایک کیسٹ پلیئر اٹھا کر لے گئیں تاکہ بتاسکیں کہ گھر کے لوگ کس طرح کے غیرمحفوظ ماحول میں رہ رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 مئی 2026

کوہِ قطعات

سیتاپور: بزم اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام، مسلم جونیئر ہائی اسکول سیتاپور میں ایک انتہائی شاندار، پروقار اور تاریخی ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ یہ یادگار شام ممتاز اور ہر دلعزیز شاعر محفوظ رحمانی کے پانچویں شعری مجموعے 'کوہ قطعات' کی رسم اجرا کے نام رہی۔ اس پروگرام میں سیتاپور، لکھنؤ، لکھیم پور کھیری اور قرب و جوار سے تعلق رکھنے والے شعرا، ادبا اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کر کے محفل کو ادبی رونق بخشی۔ تقریب کی صدارت بزم اردو سوسائٹی کے صدر اور معروف ادبی شخصیت مست حفیظ رحمانی نے فرمائی۔ پروگرام کی نظامت جناب الیاس چشتی نے کی۔

مہمان خصوصی کے طور پر ممتاز قلمکار شارق لہرپوری، ڈاکٹر مخمور کاکوروی، ڈاکٹر شاہ خالد شریک ہوئے۔ تقریب کے دوران یاسین ابن عمر اور الیاس چشتی نے 'کوہ قطعات' اور محفوظ رحمانی کی ادبی خدمات پر انتہائی جامع اور شاندار مقالے پیش کیے جب کہ مہمانان خصوصی شارق لہرپوری، ڈاکٹر مخمور کاکوروی اور ڈاکٹر شاہ خالد نے کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے اپنے گراں قدر تاثرات کا اظہار فرمایا۔ اس موقعے پر جناب محفوظ رحمانی صاحب کو ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد باوقار اعزازات سے نوازا گیا۔ دبستانِ اہل قلم لکھنؤ کی جانب سے ڈاکٹر مخمور کاکوروی، جناب معید رہبر، جناب عاصم کاکوروی اور ڈاکٹر اسلم مرتضیٰ کے دست مبارک سے محفوظ رحمانی کو اکبرالہ آبادی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ 'بزم فروغ ادب' کے سکریٹری ڈاکٹر احراز ارمان نے شال پوشی کی اور یادگاری نشان پیش کیا اور بزم اردو سوسائٹی کے صدر مست حفیظ رحمانی نے سیتاپور ضلع کی ادبی تاریخ پر مبنی ایک جامع سپاس نامہ پیش کر کے انھیں اعزاز سے نوازا۔ صدر محفل مست حفیظ رحمانی نے اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر بشیر بدر کی ابتدائی شاعری، ان کی منفرد شخصیت اور سیتاپور میں قیام کے ایام پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے انھیں شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ کوہ قطعات کی رسم اجرا کے بعد ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد ہوا، جس میں مدعو شعرا کرام نے اپنے منتخب اور مسحورکن کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 جون 2026

وفیات

ڈاکٹر بشیر بدر

بھوپال: اردو کے نامور شاعر اور پدم شری ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر بشیر بدر کا طویل علالت کے بعد 28 مئی بروز جمعرات

بھوپال میں 91 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ بشیر بدر کو جدید اردو غزل کی سب سے مقبول آوازوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ان کی شاعری نے نہ صرف اردو ادب کے سنجیدہ قارئین بلکہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی غیر معمولی جگہ بنائی۔ وہ اپنے اشعار میں محبت، جدائی، تنہائی، انسانی رشتوں، ہجرت اور وقت کی بے رحمی جیسے موضوعات کو نہایت سادہ مگر دل میں اتر جانے والے انداز میں پیش کرتے تھے۔ 15 فروری 1935 کو اترپردیش کے ایودھیا میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر بشیر بدر نے ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی مکمل کی۔ بعد ازاں انھوں نے تدریسی زندگی کا آغاز کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بعد تقریباً 17 برس تک میرٹھ کالج میں اردو شعبے کے سربراہ کے طور پر خدمات انجام دیں۔ بشیر بدر نے صرف سات برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی زبانوں پر ان کی مضبوط گرفت تھی۔ ان کی شاعری کی سب سے نمایاں خوبی اس کی سادگی اور جذباتی گہرائی تھی جس نے انھیں عوامی سطح پر بے حد مقبول بنا دیا۔ 1999 میں انھیں ادب کے شعبے میں نمایاں خدمات پر ہندوستان کے چوتھے بڑے شہری اعزاز 'پدم شری' سے نوازا گیا تھا۔ اسی سال انھیں ان کے مجموعے 'آس' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں اترپردیش اردو اکادمی اور بہار اردو اکادمی سمیت کئی قومی و بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی شاعری دیوناگری اور گجراتی رسم الخط میں بھی شائع ہوئی، جب کہ ان کے کلام کے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں تراجم بھی ہوئے۔ ان کی شاعری ہندوستانی سیاست اور عوامی زندگی میں بھی بارہا سنائی دی۔ بشیر بدر کے انتقال سے اردو غزل کا ایک سنہرا باب ختم ہوگیا، تاہم ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی اور آنے والی نسلوں کو متاثر کرتی رہے گی۔ بشیر بدر امریکہ، دبئی، قطر، پاکستان اور دیگر ممالک میں مشاعروں میں شرکت کرتے رہے، ان کی شاعری کو بے حد پذیرائی ملی۔ ڈاکٹر بشیر بدر کی وفات اردو ادب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دی جارہی ہے، لیکن ان کے اشعار ہمیشہ اردو زبان کی روح میں زندہ رہیں گے۔ ان کے انتقال پر ہندوستان سمیت دنیا بھر کے ادبی، ثقافتی اور شعری حلقوں میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے، انھیں مختلف اداروں، تنظیموں اور زبان و ادب سے وابستہ مختلف شخصیات نے خراجِ تحسین پیش کیا۔ سوشل میڈیا پر ان کے مداحوں نے ان کے لازوال اشعار کے ذریعے خراجِ عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2026

پروفیسر محمد شاہد حسین

نئی دہلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہر دلعزیز استاذ، نامور محقق، ناقد اور ڈراما نگار پروفیسر محمد شاہد حسین کا

20 مئی 2026 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین دواریکا سیکٹر 24 کے قبرستان میں ہوئی۔ وہ کئی دنوں سے میکس اسپتال ساکیت دہلی میں زیر علاج تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بہو ہیں۔ پروفیسر محمد شاہد حسین کی پیدائش 12 فروری 1949 کو گورکھپور کے ایک جاگیردارانہ خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام حاجی خادم حسین تھا۔ انھوں نے ایم اے شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی اور ایم فل و پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگریاں سی آئی ایل، جے این یو نئی دہلی سے حاصل کیں۔ انھوں نے معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر محمد حسن کی نگرانی میں تحقیقی مقالے لکھے تھے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے دہلی یونیورسٹی سے فارسی زبان وادب میں بھی پوسٹ گریجویشن کیا۔ پروفیسر محمد حسن اور پروفیسر محمود الٰہی جیسے محترم اساتذہ کی شاگردی نے ان کی صلاحیتوں کو روشن تر کیا، جس کا وہ ہمیشہ پاس احترام کرتے رہے۔ انھوں نے جے این یو نئی دہلی میں ایک طویل مدت تک درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ پروفیسر محمد شاہد حسین CIL/SLL & CS میں چیئرپرسن کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں وزٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ درس وتدریس کے علاوہ تحقیقی وتنقیدی میدان میں بھی پروفیسر محمد شاہد حسین کی خدمات قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ ڈراما ان کا خاص میدان رہا ہے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین کے بہت سے ڈرامے اور فیچر آل انڈیا ریڈیو پر نشر ہوچکے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے لیے بھی انھوں نے کئی ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد یونیورسٹی حیدرآباد کے لیے بھی دو ڈاکومنٹری تحریر کرچکے ہیں، جو ٹیلی کاسٹ بھی ہوئے ہیں۔ ڈرامے کی تنقید اور ماس کمیونی کیشن پر ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ کچھ قابل ذکر کتابوں میں اندر سبھا کی روایت، عوامی روایات اور اردو ڈراما، انار کلی، اندر سبھا، ڈرامافن اور روایت، ابلاغیات، اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ، اکتسابات، اردو ڈرامے کی فکری وفنی اساس، ایک طرفہ تماشا کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ دو کتابیں ان کی ہندی زبان میں بھی شائع ہوچکی ہیں۔ ان کی کئی کتابوں پر مختلف اکیڈمیوں سے ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ پروفیسر شاہد حسین کے انتقال پر مختلف یونیورسٹیز، تنظیموں اور اداروں نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' لکھنؤ، 3 جون، روزنامہ 'میراوطن' اور دیگر ذرائع

منظور پروانہ

لکھنؤ: معروف ادیب وشاعر منظور پروانہ کا 5 جون بروز جمعہ کو حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 78 برس کے تھے۔ وہ گذشتہ کچھ دنوں سے

عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ منظور پروانہ کا اصلی نام منظور احمد صدیقی تھا لیکن وہ منظور پروانہ کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ وہ 20 جون 1948 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ 1970 میں انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ انھوں نے یکم جون 1972 سے 7 اگست 1972 تک اترپردیش اردو اکادمی میں ملازمت کی۔ اس کے بعد وہ محکمۂ آبپاشی میں چلے گئے اور وہاں 8 اگست 1972 سے 30 جون 2008 تک برسرکار رہے۔

منظور پروانہ نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے آپ کو اردو زبان وادب کی خدمت کے لیے وقف کردیا۔ اس دوران ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'دست حنائی'، مضامین کا مجموعہ 'اعتبار حرف' شعری مجموعہ 'چراغ فکر' اور بچوں کے لیے لکھے گئے مضامین اور کہانیوں کا مجموعہ 'نیکی کا نور' ادبی حلقوں میں کافی پسند کیے گئے۔ وہ ایک اچھے مبصر بھی تھے۔ روزنامہ 'آگ' میں گذشتہ کئی برسوں سے کتابوں پر تبصرے کررہے تھے۔ ان کے تبصروں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ افراط وتفریط سے پاک ہوا کرتے تھے۔ ان کو کئی ایوارڈ واعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔ منظور پروانہ بعد نماز جمعہ عیش باغ قبرستان میں سپرد خاک کردیے گئے۔ تدفین میں اعزہ واقارب کے علاوہ علمی وادبی حلقے کے کئی افراد موجود تھے۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 6 جون 2026

کے ایل نارنگ ساقی

نئی دہلی: مشہور ادیب، شاعر، صحافی کے ایل نارنگ ساقی کا 5 جون 2007 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی پیدائش 24 اگست

1936 کو سوڈھی نگر، فیروز پور میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے گورنمنٹ لوئر مڈل اسکول، جب کہ میٹرک کی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول، فیروز پور سے حاصل کی۔ گریجویشن ڈی سی جین کالج، فیروز پور پنجاب سے پورا کیا۔ 17 برس کی عمر میں ہی انھوں نے ہفتہ وار اخبار 'ساقی' شائع کرنا شروع کردیا تھا۔ پہلے انھوں نے چنڈی گڑھ میں ہوٹل کا کاروبار کیا، بعد میں وہ دہلی میں مستقل مکین ہوگئے۔ یہاں ان کی ملاقات کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے ہوئی، ان کی 75 ویں سالگرہ کا جشن منانے کے لیے کنور مہندر سنگھ لٹریری ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا۔ اس ٹرسٹ کے ذریعے وہ اردو ادیبوں وشاعروں کی مدد بھی کرتے تھے۔ وہ خود اردو لکھنے پڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ انھیں طنز وظرافت سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ ان کی قابل ذکر کتابوں میں یادوں کا جشن، ہمارے کنور صاحب، کلیات سحر، ادیبوں کے لطیفے، کلیات اکبر الہ آبادی، ادیبوں کے لطیفے، شگفتگی و برجستگی قلمکاروں وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ماہنامہ 'رہنمائے تعلیم' نئی دہلی کے اعزازی چیف ایڈیٹر، اور پریس کلب آف انڈیا نئی دہلی کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ 17 دسمبر 2025 کو ان کی کتاب 'نارنگ ساقی ایک مطالعہ' کے اجرا کا پروگرام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں رکھا گیا تھا۔ اسی رات اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ وہیل چیئر کے سہارے کسی طرح پروگرام میں آسکے تھے۔ اس کے بعد بستر علالت پر ہی رہے۔

اپنے چھوٹے بیٹے سنجیو نارنگ کے ساتھ فرید آباد میں رہتے تھے۔ 4 جون کو طبیعت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے فرید آباد کے ایک اسپتال میں داخل کیا گیا۔ 5 جون 2026 کو انھوں نے آخری سانس لی اور 7 جون کو شمشان گھاٹ میں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

بشکریہ: روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 جون اور روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جون 2026 ودیگر ذرائع

فاروق سید

ممبئی: ملک کے معروف صحافی اور ماہنامہ 'گل بوٹے' کے مدیر فاروق سید طویل علالت کے بعد 19 مئی کی شام سات بجے اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے۔ دو ماہ قبل وہ عمرہ کے لیے گئے تھے۔ وہیں انھیں برین ہیمریج ہوا،

قدرے افاقہ ہونے اور ممبئی واپسی کے بعد انھیں مقامی اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ ایک سے دوسرے اسپتال میں علاج کے باوجود ان کی طبیعت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 58 سال تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ فاروق سید کی نماز جنازہ 20 مئی کو بعد نماز ظہر ادا کی گئی، بعدازاں ناریل واڑی قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ فاروق سید نہ صرف عمدہ صحافی بلکہ فروغ اردو کے علمبردار تھے۔ تعلیم وترقی کے باب میں نئی نسل کی ذہن سازی کو ضروری سمجھتے ہوئے نیز ان میں مطالعہ کا ذوق پروان چڑھانے کے مقصد سے انھوں نے 1996 میں 'گل بوٹے' جاری کیا تھا۔ اس ماہنامہ نے نہایت کم وقت میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔ فاروق کا آبائی وطن شولاپور تھا۔ انھوں نے پہلے مہاراشٹر کالج سے تعلیم حاصل کی اور پھر کے سی کالج سے ڈپلوما ان جرنلزم کیا تھا۔ معاشی جدوجہد کے ابتدائی دور میں انھوں نے کئی کام کیے مگر پھر روزنامہ 'اردو ٹائمز' میں باقاعدہ ملازمت کی۔ وہ 'اردو مہانگر' سے بھی وابستہ رہے مگر ان کی شناخت کا اصل ذریعہ ان کا اپنا پرچہ 'گل بوٹے' بنا جو ربع صدی تک باقاعدہ شائع ہوتا رہا۔ حالیہ برسوں میں انھوں نے اس کے نیٹ ایڈیشن پر محنت کی اور طباعتی سلسلہ موقوف کردیا۔ انھیں بچوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ 'جشن بچپن' کے ذریعے انھوں نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا تھا جو انوکھی نوعیت کا تھا۔ فاروق سید کی سب سے بڑی خوبی ان کی اختراع پسندی تھی۔ وہ ہٹ کر سوچنے کے قائل تھے۔ اس کی ایک مثال 'جشن بچپن' ہے۔ ایسی ہی ایک مثال تب قائم ہوئی تھی جب شولاپور میں انھوں نے 'اردو میلہ' کا انعقاد کیا تھا۔ اس سلسلے کو کافی سراہا گیا۔ فاروق سید جلسوں کی نظامت بھی نہایت عمدگی کے ساتھ انجام دیا کرتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 20 مئی 2026

محمد احمد

نئی دہلی: روزنامہ 'قومی آواز' کے سابق پروف ریڈر اور پبلشنگ ادارے 'پرنٹ آرٹ' شیش محل کے مالک محمد احمد کا 20 مئی کو انجمن میڈیکل سینٹر دہلی

میں انتقال ہوگیا، جہاں وہ گذشتہ 6 ماہ سے ڈاکٹروں کے زیر علاج تھے۔ ان کی عمر 78 سال تھی۔ لواحقین میں ایک بہن اور دو بھائی ہیں۔ ان کی تدفین ملکہ گنج قبرستان میں ہوئی۔ وہ قومی آواز کے شعبۂ پروف ریڈنگ سے 28 سال تک وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنے ادارے سے متعدد اہم دینی کتابیں شائع کی تھیں۔ مختلف اداروں اور تنظیموں کے ساتھ ادیب اور صحافیوں نے خراج تحسین پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مئی 2026

محمد وارث

نئی دہلی: ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد میں انگریزی کے استاد وارث صاحب کا انتقال ہوگیا، ان کی عمر تقریباً 59 سال تھی۔ نماز جنازہ بعد نماز عشاء، حمزہ مسجد، کبیر نگر میں ادا کی گئی، اور تدفین کردم پوری قبرستان میں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل اسکول جعفرآباد کے سابق پرنسپل ڈاکٹر محمد معروف خان نے کہا کہ ماسٹر وارث کے انتقال کی خبر سن کر دلی صدمہ ہوا۔ مرحوم نہایت شریف، مخلص، بااخلاق اور اپنے فن تدریس میں انتہائی قابل استاد تھے۔ انھوں نے ہمارے اسکول میں بحیثیت انگریزی استاد اپنی خدمات انتہائی دیانت داری، محبت اور ذمے داری کے ساتھ انجام دیں۔ ان کی شخصیت طلبہ، اساتذہ اور ہم سب کے لیے باعث احترام تھی۔ اسکول کے موجودہ پرنسپل ریاض الحسن خان نے بتایا کہ مرحوم ماسٹر وارث کی 2016 میں طبیعت کافی خراب ہوگئی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے وی آر ایس لے لیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ کئی پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھایا۔ خاص طور سے جعفرآباد اسکول میں واقع نیومون میں ہم ساتھ میں پڑھاتے تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 مئی 2026

خراج عقیدت

سلام بن رزاق

بھاگلپور: انجمن باغ و بہار، برہ پورہ، بھاگلپور کے زیر اہتمام بی این منڈل یونیورسٹی، مدھے پور کے شعبہ اردو کے اشتراک سے ڈاکٹر نظام الدین کی صدارت

میں سلام بن رزاق کے یوم وفات پر ایک ادبی تعزیتی نشست منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے سلام بن رزاق کے حیات وکارنامے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 1970 کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو نئی راہ دکھائی ان میں ایک معتبر اور ممتاز نام ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ افسانہ نگار سلام بن رزاق کا ہے۔ وہ بیک وقت غزل گو، نظم نگار، افسانہ نگار، مترجم، مضمون نگار، بچوں کے ادیب، ڈراما نگار اور کئی فلموں اور ٹی وی سیریلوں میں رائٹر رہے۔ انھوں نے اردو افسانے میں مختلف تجربے کیے جن کی وجہ سے ان کا شمار اپنے دور کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ 'شکستہ بتوں کے درمیاں' کے لیے انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا، اس کے علاوہ غالب ایوارڈ مہاراشٹر اکادمی ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے اہم افسانوں میں البم، چادر، آخری کنگورا، کلہاڑی، سبق بجوکا، ننگی دوپہر کا سپاہی، حمام، اس کا بت، ندی، خصی، ایک اور شرون کمار، زنجیر ہلانے والے، آندھی میں چراغ، ابراہیم سقہ، اندیشہ، درندہ، زندگی افسانہ نہیں،

بڑے قد کا آدمی وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے فکر و فن پر کئی پی ایچ ڈی اور ایم فل کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نظام الدین نے کہا کہ سلام بن رزاق جدید اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر قاری کو کوئی الجھن نہیں ہوتی کیونکہ ان کا اسلوب نہایت دل پذیر اور شفاف ہے۔ ڈاکٹر محمد نسیم نے کہا کہ میں نے 2016 میں ان کے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ افسانوی مجموعہ 'شکستہ بتوں کے درمیان کا تنقیدی تجزیہ' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران نہ صرف ان کی تحریریں بلکہ ان کی شخصیت اور انسانیت نوازی سے بار بار متاثر ہوتا رہا۔ نشست میں شامل ڈاکٹر نور اشرف، ڈاکٹر روزینہ خاتون، ڈاکٹر شبنم پروین، محمد اعجاز اختر نے سلام بن رزاق کے ادبی کارناموں پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 اپریل 2026

عزیز حسن ایڈوکیٹ

سہارنپور: معروف علمی شخصیت وصوفی بزرگ اور ماہر قانون عزیز حسن ایڈوکیٹ کے انتقال پر سہارنپور کی علمی اور ادبی فضا مغموم ہے۔ مرحوم کو ان کے آبائی قبرستان میں اشکبار آنکھوں کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ میں علما، شعرا، وکلا، صحافیوں اور مختلف علمی و سماجی شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مرحوم عزیز حسن ایڈوکیٹ کے انتقال پر سینئر وکیل انور علی ایڈوکیٹ نے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عزیز حسن ایڈوکیٹ کا انتقال نہ صرف قانونی دنیا بلکہ علمی، ادبی اور صوفی حلقوں کے لیے بھی بڑا سانحہ ہے۔ اسلامی اسکالر ڈاکٹر جمیل مانوی نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ عزیز حسن ایڈوکیٹ جیسی شخصیات کمیاب ہوتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم کی پوری زندگی علم، انسانیت اور ملت کی خدمت میں گزری۔ قانون اور علم کے میدان میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ڈاکٹر جمیل مانوی نے مرحوم کے اہل خانہ کو تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہوئے دعائے مغفرت کی۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی اور شہر قاضی ندیم اختر نے مرحوم کے انتقال کو نہ صرف سہارنپور بلکہ پوری ملت اور صوفی حلقوں کے لیے عظیم نقصان قرار دیا۔ سینئر صحافی ڈاکٹر شاہد زبیری اور اسلامی اسکالر ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے مرحوم سے اپنے قریبی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عزیز حسن ایڈوکیٹ کے انتقال سے علم کا ایک روشن باب بند ہوگیا ہے، جن سے پورا علاقہ فیضیاب ہو رہا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ایسے اہل علم کا دنیا سے رخصت ہونا علم وادب اور قلم وقرطاس کے لیے بڑا نقصان ہے۔ سینئر وکیل چودھری جاں نثار ایڈوکیٹ اور مہتاب علی خان ایڈوکیٹ نے بھی مرحوم کے انتقال کو قانونی میدان کا بڑا خسارہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ عزیز حسن ایڈوکیٹ نے قانونی میدان میں نصف صدی سے زائد عرصے تک ملت کی بے لوث خدمت انجام دی جس کا کوئی بدل نہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مئی 2026

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی

نئی دهلی: دہلی کی گنگا جمنی تہذیب اور اردو ادب کی ممتاز نمائندہ شخصیت، معروف ادیب، محقق اور استاد

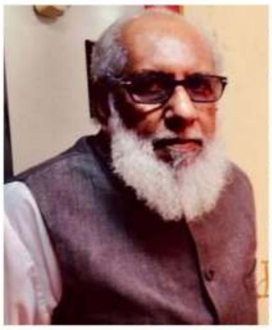

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کے سانحۂ ارتحال پر اردو اکادمی، دہلی میں ایک تعزیتی نشست منعقد کی گئی۔ نشست میں اکادمی کے سکریٹری جناب لیکھ راج سمیت تمام اسٹاف ممبران نے شرکت کی اور مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کو تفصیل سے یاد کیا گیا۔ سکریٹری اردو اکادمی جناب لیکھ راج نے مرحوم کے اہل خانہ سے دلی تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر فیروز دہلوی کی وفات اردو دنیا خصوصاً دہلی کی تہذیبی فضا کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔ اردو اکادمی، دہلی کے اسسٹنٹ پبلی کیشنز آفیسر محمد ہارون نے کہا کہ ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی دہلی کی زندہ تہذیبی روایت کے حقیقی امین تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں، تحقیق، تدریس اور صحافتی خدمات کے ذریعے اردو زبان وادب بالخصوص قدیم دہلی کی تہذیب وثقافت کے تحفظ اور فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو زبان وادب کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی اور ان کا علمی وادبی سرمایہ نئی نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 مئی 2026

پروفیسر وہاب اشرفی

بھاگلپور: انجمن باغ و بہار، برہ پورہ، بھاگل کے زیر اہتمام نوشین جہاں کی رہائش گاہ پر جوثر ایاغ کی

صدارت میں وہاب اشرفی کے یوم پیدائش پر ایک ادبی نشست منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ پروفیسر وہاب اشرفی کے حیات و فن کی روشنی میں کہا کہ پروفیسر وہاب اشرفی ادبی افق کے ایک درخشندہ ستارہ تھے۔ ان کا نام نقاد کی حیثیت سے بہت ہی معتبر اور معروف ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، تنقید نگار، محقق، خاکہ نگار، مدیر، مترجم، صحافی، غزل گو، نظم نگار اور ڈراما نگار اور ایک نامور استاد تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ سے کیا اور ان کا پہلا افسانہ 'ہاتھی کے دانت' ہے۔ تقریباً 42 افسانے انھوں نے تحریر کیے ہیں۔ ان کی تصانیف میں شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ، قصہ بے سمت زندگی کا، اردو فکشن اور تیسری آنکھ، تاریخ عالم ادبیات، تاریخ اردو ادب، کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا (افسانوی مجموعہ)، آگہی کا منظر نامہ، معنی کی تلاش، کاشف الحقائق، معنی سے مصافحہ، معنی کی جبلت، حرف حرف آشنا، کہانی کے روپ میں، مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات، مغربی و مشرقی شعریات، میر اور مثنویات میر، مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب، قدیم مغربی تنقید، سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے، تفہیم البلاغت، بہار میں اردو افسانہ نگاری، مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزار نسیم، قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ وغیرہ اہم ہیں۔ انھیں کئی ایوارڈ بھی ملے۔ اس موقعے پر جوثر ایاغ نے کہا کہ پروفیسر وہاب اشرفی کی ادبی خدمات سے ہم سب واقف ہیں، وہ اردو کے مستند نقاد اور نامور ادیب تھے۔ نشست میں شامل محمد شاداب عالم، ڈاکٹر حبیب مرشد خاں، شہنور اختر، محمد محبوب عالم، محمد سیماب عالم نے وہاب اشرفی کے فن سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 جون 2026

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ مطبوعات

اردو تدریسی قواعد

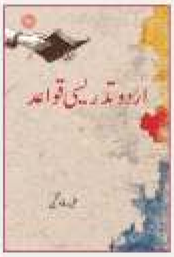

مصنف: علی رفاد فتیحی

دوسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 192

قیمت: 120 روپے

امراض اطفال

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 566+XIII

قیمت: 350 روپے

ادویہ مفردہ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 443+XX

قیمت: 285 روپے

معاشیات (Economics) فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو)

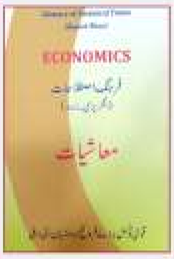

تیسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 371

قیمت: 205 روپے

حیات جاوید

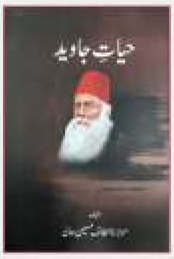

تالیف: الطاف حسین حالی

صفحات: 844+XXXI

قیمت: 455 روپے

عصری لغت برائے فنون لطیفہ

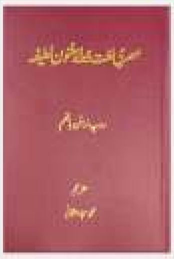

روپ نرائن باتھم

مترجم: محمد سجاد عثمانی

پہلی اشاعت: 2026، صفحات: 606

قیمت: 685 روپے

کلیات ادویہ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 217+VIII

قیمت: 160 روپے

آؤ جانوروں سے ملیں

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 131+XV

قیمت: 190 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जूलाई–2026,वर्ष:28, अंक:07
URDU DUNIYA Monthly, July-2026, Vol.28, Issue:07
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/06/2026
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

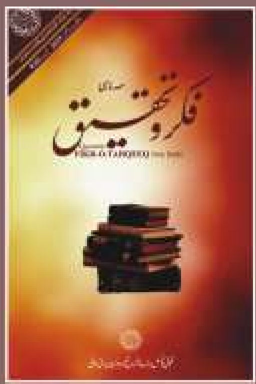

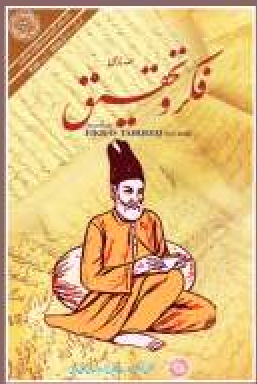

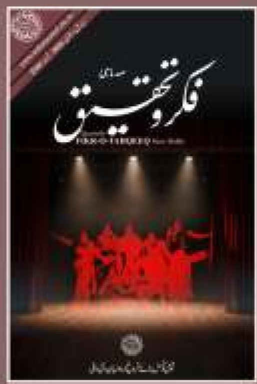

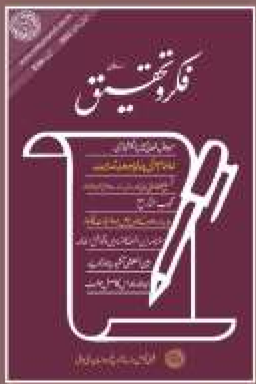

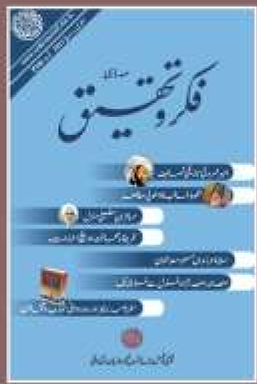

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C:، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025